دل گداز تحریریں • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

# سچی کہانیاں

DECEMBER
2012



## اس شمارے میں

☆ زندہ کہانی، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، جیتی جاگتی کہانیاں

☆ "آتشِ جنوں" سلیم فاروقی کے قلم سے......

☆ ستاروں سے جڑا پراسرار ناول "تاشون" اختتامی مراحل میں

☆ "مسئلہ یہ ہے" قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

7 سوال — ناصر رضا

9 احوال — منزہ سہام مرزا

31 صوفی قوال — راجہ محمود

40 امانت رکھی تھی — اختر شباب

53 انسانیت کا سفر — سلیم اختر

63 شہید کی ڈائری — منزہ سہام مرزا

65 کھولتی زندگی — مینا تاج

71 آتشِ جنوں — سلیم فاروقی

91 پتھر دل لوگ — عطیہ ہدایت اللہ

99 عشقِ آشنا — ثمر احمد

105 ادراکِ محبت — اصفہ اقبال بلوچ

109 لمحے کی خطا — تاثیر حیدری

121 لاوارث ماں — نازیہ بتول رضا

127 صحرا کے ستارے — جیجل میتلو

132 سرِ آئینہ — علی صبا

138 کتھارسس — خالدہ شفق

141 گردشِ رنگِ چمن — حنیف سحر

152 پچھتاوے مقدر ٹھہرے — محمد اسلم آزاد

161 کالی رسم — صدام حسین غازی

166 جینا ہی پڑے گا — ندا فاطمہ

169 جن آنکھوں میں...... — فاطمہ بلگرامی

184 کیسے کٹے تنہائی — خلیل جبار

194 رازِ کامیابی — نائلہ مبشر حسن ملک

199 ایک مقدس لڑکی — نسرین رانا

205 میں کس کے ہاتھ پہ — ارم زہرا

211 پاکستان کا مسافر — مسعود جاوید

227 زندگی لکھ رہی...... — مریم شاہ

231 تاشون — شازلی سعید مغل

242 مسئلہ یہ ہے — ادارہ

251 MINI MAG — قارئین



# سوال

ہماری زندگی کا سفر جاری ہے...... 2012ء کا سورج آخری سانسیں لے رہا ہے۔ نئے سال کی آمد آمد ہے اور آنے والے سال کے لیے دُعاؤں کا ایک سلسلہ ہے۔

یااللہ! آنے والے برس میں ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کو ترقی، کامیابی اور امن عطا کرتے ہوئے دہشت گردی سے پاک کردے۔

یااللہ! عوام کو خوش حالی کے ساتھ ساتھ خوشیوں سے آشنا کر...... وطنِ عزیز کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رکھ اور......اور!

دعائیں تو بہت سی ہیں لیکن قبولیت کا کچھ زیادہ یقین نہیں ہے، کیونکہ یہ ساری دعائیں تو گزشتہ برس بھی مانگی گئی تھیں......تو پھر سوال یہ ہے کہ ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہو رہی ہیں؟؟؟......کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ ہم دعا قبول کرنے والے کے تمام حکم اور حقوق بھول کر بس اپنا حق مانگنے لگے ہوں!!!

ناصر رضا

# احوال

## منزہ سہام قارئین کے درمیان

احوالیو......! خوش رہیے! اس دُعا کے ساتھ پہلے خط کی جانب بڑھتے ہیں کہ اللہ ہم پر اور ہمارے ملک پر رحم فرمائے...... 2012ء کا یہ آخری شمارہ ہے' اس امید کے ساتھ کہ 2013ء میں بھی ہمارا اور آپ کا ساتھ ہوگا اور سب اچھا ہوگا۔

✉ خلیل جبار' کراچی سے۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ' السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ نومبر کے شمارے کا ٹائٹل جاذبِ نظر تھا۔ اداریے میں جس کا عنوان ''ملالہ اور ملال'' تھا اس میں ناصر رضا صاحب نے بہت خوب صورت انداز میں مسلمان خاص کر ہم پاکستانیوں کے منافقانہ انداز کو اجاگر کیا ہے۔ ''زندہ کہانی'' میں منورہ نوری خلیق کا زندگی نامہ اچھا لگا۔ خصوصی کہانیاں میں صدف آصف کی ''اور پھر یوں ہوا کہ'' اچھی پُر تجسس تحریر تھی۔ کہانی کا خیال اچھا تھا لیکن دیور کا بھابی کو پارک میں اجنبی کے ساتھ دیکھنا اور پھر گھر والوں کا طلاق دلانے پر زور دینا غیر حقیقی لگا۔ شینا نور محمد کی ''جینا اسی کا نام'' ایک پُر اثر کہانی رہی جس میں دوسروں کے لیے جینے کا درس دیا گیا ہے۔ ''شہید کی ڈائری'' میں منزہ سہام صاحبہ عید کے حوالے سے خوب رہی۔ مینا کی ''سڑک کہانی'' میں اس بار پنواڑی کے کردار کے دکھوں کو پورٹریٹ کیا گیا ہے۔ مینا صاحبہ محنت بہت کر رہی ہیں لیکن لکھتے وقت وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ وہ کہانی لکھ رہی ہے یا فیچر رپورٹ کہانی اور فیچر رپورٹ میں تھوڑا فرق رہنا چاہیے۔ ''آتش جنوں'' اپنے مخصوص انداز سے آگے بڑھ رہی ہے۔ آپ بیتیوں میں اُم مناہل کی ''کر بھلا تو ہو بھلا''، تنویر خالد ساغر کی ''بے شناخت نہیں رہا'' اچھی تحریریں تھیں جب کہ جگ بیتی میں اُم عادل کی ''چاچا حق مہر'' اپنے انداز کی الگ تحریر تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں ایک باپ کے دکھوں کو خوب صورتی سے پیش کیا گیا۔ عکاشہ سحر کی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' بہت زبردست کہانی رہی۔ ممتاز احمد کی ''محبت کے سراب میں'' اچھی تحریر تھی۔ میرے خیال میں اسے موبائل کہانی میں دینا چاہیے تھا۔ رانا محمد شاہد کی ''فریب نظر'' خوب رہی۔ واقعی کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی سچ نہیں ہوتا۔ جیتی جاگتی تحریروں میں ثمرین ادریس کی ''ایک غلط قدم'' زبردست تھی۔ فاطمہ بلگرامی کا سلسلہ وار ناول ''جن آنکھوں میں خواب بسے تھے'' بس ٹھیک جا رہا ہے۔ موبائل کہانی میں مور شاہد حسین وفا کی ''یہ در نہ کھولیں'' زبردست رہی۔ پراسرار کہانیوں میں شاہد قریشی کی ''لہو کی پیاس'' اور

ارباب قربان علی ایری کی ''کچھ تو ہے'' بھی مناسب تحریریں تھیں۔ میرے شہر کی کہانی میں ''اے کاش کہ......'' ارم زہرا نے ایک حساس موضوع کو کمالِ مہارت سے نبھایا۔ یقین نہیں آرہا کہ کوئی خاتون اس موضوع پر یوں قلم اٹھا سکتی ہے۔ میں نے کورٹ رپورٹنگ میں یہ دیکھا ہے کہ جب کسی جج کو ملزم کی ضمانت قبل از گرفتاری میں توسیع کی بجائے مسترد کرنی ہوتی ہے تو وہ پہلے ملزم کو ہتھکڑیاں لگواتا ہے پھر ضمانت مسترد کرتا ہے پھر صبا کسی طرح عدالت کے کمرے سے وکیل کے ساتھ فرار ہوگئی اور وکیل کو فرار ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ ملزم نہیں بلکہ ملزمہ کا وکیل تھا۔ امید ہے کہ ارم زہرا آئندہ ان باتوں کا خیال رکھیں گی۔ مسعود جاوید کا سفر نامہ ''پاکستان کا مسافر'' بہت دلچسپ انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ محترمہ رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کی ''یادوں کے اوراق'' کا اختتام پسند آیا۔ آخری قسط پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ سہام صاحب جتنے اچھے اپنے آفس والوں کے ساتھ تھے' اتنے ہی اچھے گھر والوں کے لیے بھی تھے۔ وہ بیوی کے لیے مثالی شوہر ثابت ہوئے۔ کوئی اپنے دوستوں میں کتنا مقبول ہے' وہ بیماری کے وقت ہی پتا چلتا ہے کہ اس کو لوگ کتنا چاہتے ہیں۔ سہام صاحب کی تیمارداری کے لیے جس قدر لوگ آئے' وہ ان کی مقبولیت کی غمازی کرتا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ رخسانہ صاحبہ کسی کہانی کے ساتھ موجود ہوں گی۔ اگلی تحریر کا انتظار رہے گا۔ ''تاشون'' شازلی سعید مغل کا قلم حیرت انگیز تحریر رقم کر رہا ہے۔ شازلی کو پراسرار علوم کے حوالے سے خاصی معلومات ہیں جسے وہ تاشون کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کو منتقل کر رہی ہیں۔ ویل ڈن شازلی! اس بار اس ماہ کی خاص کہانی میں محمد فہیم کی ''خواب سہانے ٹوٹ گئے'' واقعی خاص کہانی رہی۔ سچی کہانیاں ایک اکیڈمی کی مانند ہے جہاں نو عمر قلمکاروں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اچھے قلم کار بن کر وہ آج بڑے بڑے اداروں سے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں میں کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ہم انہیں سچی کہانیاں کے لیے دوبارہ لکھنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے کیونکہ مہنگائی نے جہاں عام آدمی کو متاثر کیا ہے وہیں قلم کاروں کو بھی بری طرح متاثر کیا ہے البتہ ہم ان پر فخر ضرور کر سکتے ہیں کہ انہوں نے سچی کہانیاں سے اپنے لکھنے کا آغاز کیا ہے۔ ایک عدد کہانی ''مہربانی قسمت کی'' بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ پسند آئے گی۔''

☜ بھائی خلیل! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ بہت اچھا تبصرہ کرتے ہیں۔ بس کچھ لائنیں تلف کرنی پڑتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں وہی صفحات کی تنگی کا مسئلہ! آپ کی کہانی جلد ہی سچی کہانیاں میں شامل ہوگی۔

✉ سلیم اختر' راولپنڈی سے۔ ''عزیز منزہ بہنا! سلامت رہیے' السلام علیکم! خدا کرے' آپ بخیریت ہوں۔ حوصلہ افزائی کے لیے ممنون ہوں۔ نومبر کا شمارہ دیکھ اور پڑھ چکا ہوں۔ آپ اور بھائی ناصر رضا کی محنت سے پرچہ ہر لحاظ سے مکمل اور معیاری ہے۔ تمام تحریریں اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی ہیں۔ ''احوال'' میں عبدالعزیز جی آ اور بہن قرۃ العین زینب کے علاوہ تمام چہرے نئے ہیں۔ ان سب نے اکتوبر کے شمارے پر بھرپور انداز میں تبصرہ فرمایا ہے۔ محترمہ منورہ نوری خلیق کی وفات پر رنج ہوا۔ انہوں نے دوشیزہ میں بہت اور اچھا لکھا اور دوشیزہ کو چار چاند بھی لگائے۔ اب ان کی تحریروں کے بغیر نہ صرف ''دوشیزہ'' بلکہ ''سچی کہانیاں'' کے آنگن بھی سُونے سے لگیں گے۔ راجہ محمود صاحب نے ''نورِ قلم'' لکھ کر ان کی زندگی کے اہم گوشوں سے متعارف کرایا ہے۔ وہ واقعی ایک عظیم لکھاری تھیں۔ راجہ صاحب نے بھی نورِ قلم لکھ کر حق ادا کر دیا ہے۔ اگر ان کی فیملی کے کسی فرد سے آپ کا رابطہ ہے تو میری طرف سے ایک کلام پاک کا ثواب پہنچا دیں ورنہ میں خود ہی ان کے لیے دعا کرا دوں گا۔ ارشد علی ارشد کی ''منگھنی'' کا انتظار ہے۔ محترمہ صدف آصف اچھی تحریر لے کر آئی ہیں۔ ''شہید

کی ڈائری'' اب سچی کہانیاں کی پہچان بنتی جا رہی ہے۔ مینا یا مینا تاج کا شمار اچھا لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ''پنواڑی'' ایک منفرد تحریر ہے' مبارک باد۔ سلسلہ وار تحریروں میں محترم سلیم فاروقی اور فاطمہ بلگرامی اپنا نام اور مقام قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ''آتشِ جنوں'' کا شمار بھی حسبِ معمول سلیم فاروقی کی بہترین تحریروں میں ہوگا۔ ممتاز احمد نے بھی ''محبت کے سراب'' خوب دکھائے ہیں۔ رانا محمد شاہد کا شمار بھی اچھے لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ ''فریبِ نظر'' بھلی لگی۔ ارباب قربان علی ایری! میں آپ کی محبتوں اور خلوص کا ہمیشہ مقروض ہی رہوں گا۔ ''کچھ تو ہے'' کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ میری کہانی میری زبانی میں ''یادوں کے اوراق'' اختتام کو پہنچی۔ اس کو پڑھ کر محترم سہام مرزا کے ساتھ ساتھ آپ اور آپ کی فیملی کے بارے میں معلومات ملیں۔ میری دعا ہے کہ پروردگار میرے محسن' مرزا صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ سب لوگوں کو اپنی امان میں رکھے۔ آپ سب کے لیے دین وایمان اور جسم و جان کی سلامتی کی دعائیں۔ ہر وقت اور ہر لمحہ۔ نئے لکھنے والے سب دوستوں کو سلام۔ اُم مناہل' تنویر خالد' اُم عادل' عکاشہ سحر' ثمرین ادریس' مور شاہد حسین وفا' شاہد قریشی آپ سب کی تحریریں اچھی لگیں۔ احوالی دوستوں میں بشریٰ سعید' وقاص حسین' شفیق احمد ندیم' تحسین جو نیجو' عائشہ خورشید انور' ایم سعید انور سعید' تاثیر حیدری' کوثر سعید' حافظہ مون شاہ' اسماعیل بٹ' صائمہ سحر' وفا صدام حسین غازی' محمد ارشد فرہاد' دیب نورہ اور جیجل میتلو کو آداب اور دعائیں۔ تمام اسٹاف' بھائی ناصر رضا' راجہ محمود اور اقبال زمان کی خدمت میں آداب۔ میری دو کہانیاں ''انسانیت کا سفر'' اور ''موت اور مسیحا'' جو جون اور جولائی میں بھیجی گئی تھیں آپ کے پاس ہیں۔ آئندہ شمارے میں کسی ایک کو جگہ دے دیں۔''

ٹھ سلیم بھائی! پابندی سے محفل میں آتے رہا کریں۔ سینئرز کے آنے سے بہت حوصلہ ہوتا ہے۔ آپ کی ایک کہانی زیرِ نظر شمارے میں موجود ہے۔

✉ اُم عادل' سہراب گوٹھ کراچی سے۔ ''محترمہ پیاری منزہ جی' السلام علیکم! کہیے کیسے مزاج ہیں؟ سب سے پہلے عید کی مبارک باد قبول کیجیے۔ آج دو شمارے ''سچی کہانیاں'' کے ملے۔ ایک صبح ہاکر دے گیا' دوسرا آپ کا روانہ کردہ دو پہر کو ملا۔ اپنی کہانی اور خط شاملِ اشاعت دیکھ کر خوشی ہوئی' شکریہ۔ منزہ جی' آپ کے محبت بھرا جواب دینے کی کیا بات ہے۔ آپ کے ایک ہی محبت بھرے فقرے سے سب شکوے دور ہو جاتے ہیں۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ امی جان کی تحریر نے اس قدر متاثر کیا ہے کہ اُن کے نام علیحدہ نامہ لکھ ڈالا۔ پلیز' ان کی خدمت میں پیش کر دیجیے گا۔ ''احوال'' سے گزرے تو محترمہ منورہ نوری خلیق پر سیر حاصل مضمون پڑھ کر اچھا لگا۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور اُن کے درجات بلند کرے' آمین۔ راجہ محمود صاحب بازیاں لیتے جا رہے ہیں۔ ''شہید کی ڈائری'' کی کیا بات ہے۔ اتنی اچھوتی جامع اور مختصر تحریر آپ کا ہی خاصہ ہے بہت خوب۔ ''آتشِ جنوں'' کچھ زیادہ ہی دہشت ناک ہوتی جا رہی ہے۔ سلیم فاروقی تو ایسی مناظر کشی کے ماہر ہیں اُن کا مقابلہ بھلا کوئی اور کر سکتا ہے۔ ثمرین ادریس کی تحریر ''ایک غلط قدم'' پڑھ کر حیران ہوگئی کہ بالکل ایسا ہی چلتا پھرتا کردار میرے بھی گرد و پیش ہے۔ کہیں تو میں بھی کہانی کی صورت ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ حنیف سحر کی تحریر ''گردشِ رنگِ چمن'' ہمیں پوری طرح اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ اس کے علاوہ موبائل کہانی یہ در نہ کھولیں۔ ارم زہرا کی اے کاش کہ پاکستان کا مسافر انکل فہیم کے 'خواب سہانے ٹوٹ گئے' بہت بہت متاثر کن رہیں۔ اس کے علاوہ ابھی پڑھا نہیں مگر یقین ہے کہ تمام تحریریں خوب سے خوب تر ہوں گی کیونکہ ایک کہانی لکھنے

والا ہی جانتا ہے کہ کہانی کی تخلیق میں کس طرح لہو پانی بنتا ہے۔ اسی کے ساتھ اجازت دیجیے۔ ناصر بھائی اور آپ کی تمام ٹیم کو سلام۔ عادل سلام عرض کرتا ہے۔''

ڈیئر اُم عادل! سب سے پہلے تو ہماری طرف سے عادل بیٹے کو بہت دعائیں...... میری تحریر پسند کرنے کا بہت شکریہ اور بھئی، تم سب سے محبت ہے، تب ہی تو محبت بھرے جواب دیتی ہوں۔ سلیم فاروقی صاحب کی صرف کہانی ہی نہیں وہ خود بھی بہت دہشت ناک ہیں کبھی ملو تب پوچھیں گے......

غیاث الدین غیاث، کراچی سے۔ ''صد احترام منزہ سہام، آداب وسلام! امید ہے، مزاج بخیر ہوں گے۔ ماہِ اکتوبر کا ''سچی کہانیاں'' پراسرار نمبر میرے ہاتھوں میں ہے۔ مطالعہ جاری ہے۔ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہوں، دلچسپی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ایک بات خاص طور پر کہوں گا کہ بعض کہانیاں ایسی ہیں جو حقیقت سے دور ہیں۔ پراسرار کا مطلب شاید ہمارے لکھنے والے اور پڑھنے والے کچھ اور لیتے ہیں جبکہ لفظ پراسرار میں ہی اسرار چھپا ہوا ہے، کچھ اس پر بھی توجہ دیں۔ ایک غزل (تازہ) ارسال کررہا ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ مزید آپ کی فائل میں ایک حمد اور ایک نعت موجود ہے۔ تھوڑا سا وقت نکال کر دیکھ لیجیے گا۔ تمام دوستوں اور ساتھیوں کو سلام اور بہت ساری دعائیں۔''

بھائی غیاث! غزل مل گئی ہے۔ آپ کی تجویز پر ضرور غور کریں گے۔

فرحت صدیقی، فیصل آباد سے۔ ''پیاری منزہ، السلام علیکم! امید ہے خیریت سے ہوگی۔ خوشی ہوئی آپ کو میری کہانی ''مہ پارہ رضا'' والی پسند آئی۔ منزہ جی ابھی تک تو میں فیصل آباد کی ہوں، لاہور کی نہیں۔ کل کے دانہ پانی کا پتہ نہیں۔ میں دوشیزہ والی ہی فرحت صدیقی فیصل آباد کی ہوں۔ ستمبر کے شمارے میں میرا طویل خط بھی شائع ہو چکا ہے۔ ٹھیک ہے نا ''سچی کہانیاں'' کے پہلے شمارے سے ہی ناتا جوڑ لیا پھر صرف دوشیزہ کے لیے ہوگئی۔ اب سوچا ہے کہ ہر ممکن کوشش کروں گی کہ دونوں شماروں کے لیے لکھوں۔ دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے، آمین ثم آمین! محترمہ منورہ خلیق کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے، آمین ثم آمین اور وہ اس کی حقدار بھی ہیں۔ مجھے ان کی کہانیوں سے عشق تھا۔ ہمیشہ ان کی کہانی سب سے پہلے پڑھتی تھی۔ ''بھوت بنگلہ'' پڑھ کر قدرت اللہ شہاب کی ہمت کو داد دیتی ہوں۔ بہت مضبوط دل ہونا چاہیے۔ ''شہاب نامہ'' بھی پڑھا تھا۔ بہت دنوں تک اُس کے سحر میں گم رہی۔ ''سلیمانی جن'' تاریخی کہانی پڑھی، بہت اچھی لگی۔ ساری کہانیاں ہی اچھی تھی۔ خوف بھی آتا رہا اور ڈر بھی لگتا رہا لیکن یہ دنیا ہے اور جنات بھی ہیں اس لیے ایسا ہونا ممکن ہے۔ قاتل روح، آسیب زدہ مکان، وفا ہم نبھائیں گے زبردست کہانیاں تھیں۔ ''یادوں کے اوراق'' کی آخری قسط اتنی جلدی نہیں آنی چاہیے۔ کم از کم چھ ماہ رخسانہ باجی سے کہہ دیجیے اور لکھیں کیونکہ ان کی یادوں کو پڑھ کر بہت اچھا لگتا ہے۔ اب اجازت دیجیے۔ میری طرف سے سب کو بہت آداب۔''

فرحت! اصل میں ہمارا ماننا ہے کہ سارا پاکستان ہی ہمارا ہے اور شاید ہماری اس بات کی تائید ہمارے کمپوزر بھی کرتے ہیں اس لیے جس احوالی کے ساتھ جو دل چاہتا ہے، شہر لگا دیتے ہیں...... بہرحال انہیں تاکید کر دی ہے کہ آئندہ خیال رکھیں...... محفل میں ضرور آیا کریں۔

نزہت انیس، کراچی سے۔ ''محترمہ منزہ سہام مرزا، السلام علیکم! ایک عرصے بعد ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کا مطالعہ کیا ماشاء اللہ، یہ پرچہ آج بھی اُسی آب وتاب کے ساتھ شائع ہورہا ہے۔ تقریباً تیرہ چودہ سال پہلے اپنی

پہلی کتاب ''نہیں'' کی اشاعت کے بعد میں آپ کے والد صاحب سے ملنے محسن بھوپالی صاحب کے ساتھ سچی کہانیاں کے آفس آئی تھی۔ آپ کے والد صاحب بے حد رکھ رکھاؤ اور وضع قطع کے انسان ہیں۔ ان سے ملاقات آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔ آپ سے بھی سرسری ملاقات ہوئی تھی جو یقیناً آپ کو یاد نہیں ہوگی۔ آپ کی کتاب کی اشاعت کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے حصول کے لیے منی آرڈر کر دیا ہے۔ اسے میرے پوسٹ بکس پر بھجوا دیجیے گا۔ ایک تازہ غزل بھیج رہی ہوں۔ اپنی سہولت سے قریبی شمارے میں جگہ دیجیے گا۔ سہام مرزا صاحب کو میرا بہت بہت سلام۔''

ھ نزہت! ابو سے ملاقات کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا پھر آپ نے جس محبت سے یاد کیا' اس نے تو آنکھوں میں آنسو بھر دیئے۔ بہر حال آپ کے علم میں شاید نہیں کہ ابو کے انتقال کو تقریباً 12 سال گزر چکے ہیں۔ میری کتاب آپ کو بھجوا دی گئی ہے' دونوں صورتوں میں ضرور مطلع کیجیے گا۔

✉ مہر نسیم' اسلام آباد سے۔ ''محترم ایڈیٹر السلام علیکم! ایک مدت بعد اپنی ایک عدد کہانی کے ساتھ اپنے پسندیدہ ماہنامے میں شریک ہو رہی ہوں۔ میری اور ''سچی کہانیاں'' کی پرانی شناسائی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ ہی میری دو کہانیاں ''سچی کہانیاں'' کی زینت بنی تھیں تو میں خوشی سے جیسے پاگل سی ہو گئی تھی۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی۔ امید ہے کہ آپ خوش آمدید کہیں گے اور میری کہانی کو شائع کر کے مجھے خوش ہونے کا موقع فراہم کریں گے۔ میں اپنے بارے میں بتاتی جاؤں کہ میں نے ایم اے جرنلزم کیا ہوا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے بنیادی طور پر صحافی ہوں مگر لکھنے کی عادت بہت پہلے سے ہے۔ بہت کچھ لکھا مگر ''سچی کہانیاں'' ہمارے گھر میں آج تک اسی ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میں بچوں کی بھی رائٹر ہوں اور مزاح لکھنے سے بھی دلچسپی ہے۔ امید ہے آپ سب مجھے پہلے کی طرح ہی پذیرائی دیں گے۔

ھ مہر! یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد محفل میں شریک ہو رہی ہو۔ یار' وقت نکالا کرو اور پابندی سے حاضری لگوایا کرو۔ یہ تو دوستوں کی محفل ہے' سب جمع ہوتے ہیں' اچھا لگتا ہے۔

✉ ایس امتیاز احمد' کراچی سے۔ ''محترم ایڈیٹر' السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہِ رواں کا ''سچی کہانیاں'' ہمارے سامنے ہے۔ دلفریب ٹائیٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ قریبی اشاعت کے لیے نگارشات ارسالِ خدمت کر رہے ہیں۔ 1۔ بڑے لوگ' 2۔ غزل۔ امید ہے' قریبی اشاعت میں جگہ دیں گے۔ ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''سچی کہانیاں'' کے تمام خوب صورت کہانیاں لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت تحریریں پڑھنے والے قارئین کو دُعا و سلام اور دلی عید مبارک! پلیز' اپنا خیال رکھیے گا۔''

ھ بھائی امتیاز! خط لکھنے کا شکریہ۔ ٹائیٹل سمیت تمام تحریریں پسند کرنے کا شکریہ۔

✉ بیگم عائشہ صدیقہ ضمیر' کراچی سے۔ ''السلام علیکم! محترم بھائی ناصر رضا! میں ''سچی کہانیاں'' کی پرانی لکھنے والی ہوں مگر کافی دنوں بعد پھر حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے آپ بھولے نہیں ہوں گے۔ اب ایک کہانی ''آج بھی انسان بکتے ہیں'' ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی اور جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ زیادہ کیا عرض کروں۔''

ھ آپ کی کہانی مل گئی ہے۔ جلد آپ کو مطلع کریں گے۔

✉ ممتاز احمد، سرگودھا سے۔ ''قابل صد احترام بہن منزہ سہام! السلام علیکم! پیاری بہنا کیسی ہیں آپ؟ ماہ نومبر کا اعزازی شمارہ موصول ہوا۔ سب سے پہلے تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ میری کہانی کو ''سچی کہانیاں'' کے قیمتی صفحات کی زینت بنایا گیا۔ دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔ اداریہ زبردست رہا۔ ''احوال'' میں سب لکھاریوں کے خطوط اور تبصرے بلاشبہ بہت عمدہ تھے۔ میں اپنی پیاری سی چھوٹی اور معصوم بہن حافظہ مون شاہ کا بہت شکر گزار ہوں کہ ''احوال'' میں میری غیر حاضری کو محسوس کیا۔ الحمدللہ! خیریت تھی، بس کچھ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے غیر حاضر رہا۔ اب بات ہو جائے کہانیوں کی۔ راجہ محمود کی تحریر ''نورِ قلم'' میں مرحومہ منورہ نوری خلیق کی زندگی کے گوشوں کو بہت خوب صورت انداز میں اُجاگر کیا گیا اور اُن کی زندگی کے بارے میں سیر حاصل معلومات ہوئیں۔ صدف آصف کی کہانی ''پھر یوں ہوا کہ'' نے ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔ شینا نور محمد کی ''جینا اسی کا نام'' ایثار اور قربانی کا درس دیتی ایک بہترین کہانی تھی۔ ''شہید کی ڈائری'' عید قرباں اور آخرت کے حوالے سے بہت ہی اعلیٰ اور بہترین سوچ تھی۔ اُم عادل کی ''چاچا حق مہر'' ایک اچھوتی اور منفرد کہانی تھی۔ ثمرین ادریس کی ''ایک غلط قدم'' اصلاحی کہانی تھی، پسند آئی۔ موبائل کہانی کوئی خاص نہیں بس عامیانہ سی تھی۔ ارباب قربان علی کی ''کچھ تو ہے'' اور شاہد قریشی کی ''لہو کی پیاسی'' بہت ہی پُراسرار اور حیرت انگیز کہانیاں تھیں۔ ارم زہرا کی ''اے کاش کہ'' لرزا دینے والی کہانی تھی۔ ''خیال آرائی'' میں ثانیہ بھٹی کے خیالات بہت پسند آئے۔ قارئین کو بہت اچھا درس دیا ہے۔ آپ کی ڈائری کے لیے اشعر جواد اور غزالہ شاہین عبدالقیوم کا انتخاب بہت زبردست تھا۔ آخر میں ناصر رضا صاحب کی خدمت میں سلام کے ساتھ ایک درخواست ہے اور وہ یہ کہ چار ماہ پہلے میں نے آپ کو ایک کہانی بھیجی جو کہ سرگودھا کے مشہور و معروف صوفی بزرگ اللہ والے جناب میاں عبدالرشید المعروف نوٹاں والی سرکار سے جُڑی تھی۔ برائے کرم جنوری کے شمارہ میں ضرور شائع فرمائیں کیونکہ جنوری میں اُن کا سالانہ عرس ہے اور اس موقع پر ایک طرف تو اُن کو خراجِ عقیدت اور دوسری طرف اُن کے مریدین اور پرستاروں کے لیے ایک تحفہ ہوگا۔ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف اور قارئین کرام کے لیے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔ انشاءاللہ! اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو......''

☜ بھائی ممتاز! خوش رہیے۔ آپ کا خط مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگتا ہے مگر مجبوری ہے ہر ماہ آپ کی تحریر کو خصوصی خط کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اصل میں تعریف اور تنقید دونوں کا امتزاج ہی تحریر کو حسن بخشتا ہے۔ کہانی کے بارے میں ناصر بھائی کو ہدایت دے دی ہے۔

✉ عبدالعزیز جی آ، چکوال سے۔ ''منزہ بہن! اسلام عقیدت! سابقہ عید کی طرح اس عید پر بھی چھٹی نہ ملی۔ عید گھر سے دور پردیس میں گزاری اور پرچہ حسبِ سابق عید کی صبح ملا۔ اشفاق احمد عباسی، قرۃ العین، عکاشہ سحر صفیہ سجل شاہ، نسیم سکینہ صدف، سعید انور سعید، رضوانہ کوثر، خلیل جبار اور سدرہ انور علی آپ سب کا بہت مشکور ہوں کہ آپ سب نے میری کہانی ''عشق نہ پچھے ذات'' کو نہ صرف پسند کیا بلکہ اپنی قیمتی رائے دے کر کہانی کو انعام کا حقدار ٹھہرایا۔ مصروفیت کی بنا پر آپ کا مقروض تھا، سو نائیس آف یو دعا ہے آپ سب لوگ بہت خوش رہیں۔ میرا خصوصی خط جہاں تنقید کا نشانہ بنا وہیں سدرہ بیٹی نے یہ جملہ لکھ کر گویا سب کے منہ بند کر دیئے۔ ''عزیز انکل کا خصوصی خط بہت ہی پسند آیا۔ یہ پہلا خط ہے جو مجھے واقعی خاص لگا۔'' یہ لائنیں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تازہ شمارے میں سلیم صاحب کا تبصرہ احوال میں نمبر ون تھا۔ ممتاز نے بھی میری خیال آرائی پر جن خوب صورت الفاظ

عورت بھی ایسا کر سکتی ہے؟ ویسے ارم زہرا بہت عمدہ کام کر رہی ہیں۔ موبائل کہانی ''یہ در نہ کھولیں'' تو بہتر ہے بس سمجھنے کی بات ہے۔ ''بے شناخت نہیں رہا'' تنویر خالد کی غمگین مگر فلمی انداز لیے حقیقت کا گمان کم ہی رہا۔ ممتاز احمد کی ''محبت کے سراب میں'' شروع سے واضح لگ رہا تھا کہ کوئی شریف زادی تو ایسا کرنے سے رہی اور اس سے بڑھ کے اورنگ زیب بے وقوف۔ رانا محمد شاہد کی ''فریب نظر'' بے حد دلچسپ اور کچھ الگ رہی۔ فہیم انکل کی ''خواب سہانے ٹوٹ گئے'' غمزدہ کہانی تھی۔ ارشد علی ارشد بھائی اللہ سائیں آپ کے والد محترم کی مغفرت فرمائے اور بلند درجات عطا فرمائے' آمین۔ فریدہ خانم کی بہن کو اللہ سائیں جلد صحت یاب فرمائے' آمین۔ غزالہ رشید آپی (ہم ٹی وی) کا شعبۂ اسکرپٹ جوائن کرنے پر مبارک باد قبول کریں۔ بہت خوشی ہوئی کہ یہ میرا فیورٹ چینل بھی ہے۔ مزید بھی تبصرہ کرتی مگر یہاں ماشاء اللہ مہینہ بھر شادیاں ہیں تو ہر طرف گانوں کی آوازیں آرہی ہیں تو گزارا کرلیں اور فہیم انکل کو 8 دسمبر سالگرہ بہت مبارک ہو۔''

ڈیئر تحسین! بھائی کی شادی پر ہماری جانب سے ڈھیروں مبارک...... غزالہ تک تمہاری مبارک باد پہنچا دی ہے' شکریہ یہ کہہ رہی ہیں۔

✉ مور شاہد حسین وفا' کراچی سے۔ ''نہایت مہربان و شفیق آنٹی منزہ سہام السلام علیکم! امید ہے آپ' انکل ناصر' سچی کہانیاں کا پورا اسٹاف اور قارئین حضرات بخیریت ہوں گے۔ دعائیں اور نیک تمنائیں سب کے نام۔ ڈیئر آنٹی دعا ہے کہ اللہ آپ کو اور انکل ناصر رضا کو سدا خوش و خرم رکھے' آمین! میں انکل ناصر رضا کا تہہ دل سے ممنون اور مشکور ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی فرما کر میری موبائل کہانی کو ''سچی کہانیاں'' کی زینت بنایا۔ اب بھی ایک موبائل کہانی کے ساتھ حاضر ہوں اور حوصلہ افزائی کی امید رکھتا ہوں۔ نومبر کا شمارہ عید سے پہلے ملا۔ عید کی خوشی دگنی ہوگئی۔ ٹائیٹل بھی بہت اچھا تھا۔ انکل ناصر کا اداریہ ''ملالہ اور ملال'' بہت اچھا اور سچا تھا۔ خطوط کی محفل میں آپی صفیہ سجل شاہ' آپی صفیہ سلطانہ مغل اور بہنا سدرہ انور علی کی کمی محسوس ہوئی۔ امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ بھیا شاہد فراز اس حسین محفل میں آنے کی آپ کو بھی دل سے دعوت ہے۔ راجہ محمود صاحب کا مضمون ''نورِ قلم'' زبردست رہا۔ اللہ آنٹی منورہ نوری خلیق کے درجات بلند فرمائے' آمین۔ صدف آصف کی ''اور پھر ہوا یوں کہ......'' اور شینا نور محمد کی ''جینا اسی کا نام'' بہت ہی زبردست تحریریں تھیں۔ ''شہید کی ڈائری'' بہت اچھا سلسلہ ہے۔ انکل سلیم فاروقی کی تحریر ''آتشِ جنوں'' لاجواب ہے۔ اُم مناہل کی ''کر بھلا' ہو بھلا'' ممتاز احمد کی ''محبت کے سراب میں'' پسند آئیں۔ ارم زہرا کی ''اے کاش کہ......'' سبق آموز تھی۔ مینا کی ''پنواڑی''، تنویر خالد کی ''بے شناخت نہیں رہا''، اُم عادل کی ''چاچا حق مہر''، عکاشہ سحر کی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' اچھی تھیں۔ حنیف سحر کی ''گردشِ رنگ چمن'' اور شازلی سعید مغل کی ''تاشون'' بہت پسند آئی۔ رانا محمد شاہد کی ''فریب نظر'' شاہد قریشی کی ''لہو کی پیاس'' ارباب قربان علی کی ''کچھ تو ہے'' دلچسپ ثابت ہوئیں۔ انکل محمد فہیم کی ''خواب سہانے ٹوٹ گئے'' واقعی خاص تھی۔ مسعود جاوید کی سفر کہانی ''پاکستان کا مسافر'' لاجواب ہے۔ ثمرین ادریس کی ''ایک غلط قدم'' بہت اچھے انداز میں لکھی گئی۔ ڈیئر آنٹی ''کانچ کی عورت'' آپ کے افسانوی مجموعے کے لیے تیرہ اکتوبر کو تین سو روپے منی آرڈر کیے تھے اور انکل ناصر رضا نے فون پر بتایا تھا کہ پیسے مل گئے ہیں لیکن افسوس کتاب ابھی تک نہیں ملی۔''

بھائی شاہد! امید ہے ''کانچ کی عورت'' آپ کو مل گئی ہوگی' ہم دیر ہونے پر شرمندہ ہیں۔ کہانیاں پسند

کرنے کا شکریہ۔

☒ رانا محمد شاہد، بورے والا سے۔ ''ایڈیٹر صاحبہ! نومبر کا سچی کہانیاں عید کے بعد ملا۔ اداریہ میں ناصر بھائی نے صحیح کہا کہ ہم صحیح وغلط کا ادراک کیسے کریں کہ جب ہمیں درجنوں چینلز اور سینکڑوں تجزیہ نگاروں نے الجھا دیا ہو۔ ''نورِ قلم'' کے عنوان سے راجہ محمود نے عظیم لکھاری منورہ نوری خلیق کی زندگی نامے پر خوب لکھا۔ منورہ کا زندگی نامہ بھی اُن کی تحریروں کی طرح خوب صورت تھا اور ایسے لوگ اپنی تحریروں کی صورت لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ صدف آصف، شینا نور محمد، اُم مناہل، تنویر خالد، اُم عادل، ممتاز احمد اور باقی لکھنے والوں کی کہانیاں بھی دلچسپ تھیں۔ ''فریب نظر'' شائع کرنے کا شکریہ۔ مسعود جاوید کا سفر نامہ بھی معلومات لیے ہوئے تھا۔ ''یادوں کے اوراق'' میں رخسانہ سہام مرزا آخری قسط کے ساتھ موجود تھیں۔ سہام مرزا کے ساتھ گزاری اُن کی خوب صورت یادیں بھی پڑھنے کو ملیں۔ میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لیے احترام اور محبت اُن یادوں کی خاص بات ہے۔ تحسین جونیجو، سالگرہ پر مبارک باد دے رہی تھیں۔ 20 دسمبر کو میری بھی سالگرہ ہے۔ احوالی ساتھی آئیں تو ضرور کیک کھلاؤں گا۔ احوال میں سلیم اختر کا خط سب سے دلچسپ تھا۔ ''سچی کہانیاں'' کے ساتھ وہ اپنے تعلق کی کہانی سنا رہے تھے۔ ''درود پاک'' کا ورد ہمارے بڑے مسائل کا حل ہے۔ شرط تو یقین کی ہے۔ آپ کی بیماری کے دوران چاہنے والے دور تو چلے گئے مگر ''اتنا تو ہوا کہ کچھ لوگ پہچانے گئے'' ایسا ہی ہوتا ہے اسی کو دنیا کی بے ثباتی کہا جاتا ہے کہ خوشی میں تو سب ہی ساتھ دیتے ہیں، پاس آتے ہیں، پریشانی میں نہیں۔ نئے سال کی آمد آمد ہے، میری طرف سے آپ کو تمام اسٹاف کے ساتھ اور قارئین کو نیا سال مبارک۔ دعا ہے کہ نیا سال اس وطن کو امن اور محبت کا گہوارہ بنا دے، آمین۔''

ھ شاہد بھائی! آپ کی تجاویز محفوظ کر لی ہیں۔ سلیم صاحب کا خط اچھا لگا یقیناً وہ بھی بہت خوش ہیں۔ نیا سال اللہ کرے ہم سب کے لیے اطمینان وسکون اور محبتیں لے کر آئے۔

☒ شفیق احمد ندیم، کراچی سے۔ ''محترمہ منزہ سہام السلام علیکم! نومبر کے شمارے میں آپ نے میرے اُس خط کا جواب بھی دے دیا جو دراصل آپ کو نہیں بلکہ ناصر رضا صاحب کو لکھا تھا۔ اس بڑے پن پر آپ کا شکر گزار ہوں اور آپ سے براہِ راست مخاطب ہوں۔ فی الحال نیا شمارہ زیرِ مطالعہ ہے اس لیے کہانیوں پر تبصرہ نگاری سے معذرت خواہ ہوں۔ غزلوں پر مشتمل اپنی کتاب ''گفتگو رقص کرے'' آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ اپنی رائے سے ضرور نوازیں گی۔''

ھ بھائی شفیق! خوش رہیے، کتاب کا بہت شکریہ مگر یقین کیجیے، ابھی پڑھ نہیں پائی۔ چند دنوں میں ایک طویل سفر کرنا ہے، اس میں بری طرح الجھی ہوئی ہوں...... محفل میں آتے رہیے۔

☒ محمد راشد فرہاد، سکھر سے۔ ''محترمہ منزہ سہام السلام علیکم! امید کرتا ہوں آپ خیریت سے ہوں گی۔ دیگر احوال یہ ہے کہ نومبر کا شمارہ پڑھا۔ بہت لطف آیا خاص طور پر اس دفعہ کہانیاں بہت اچھی رہیں۔ کہانیاں لکھنے والوں کا جواب نہیں۔ خیر، یہ تو کہانیوں کے خدوخال تھے جہاں تک آپ نے کہا کہ میں صفحات میں شامل ہو سکتا ہوں، شاعری میں ہر ماہ مشکل ہے، میں آپ کی مجبوری کا احترام کرتا ہوں بلکہ میں آپ کا شکر گزار ہوں، آپ نے میری خواہش کا احترام کیا اور میری شاعری کو آپ نے نومبر کے شمارے میں جگہ دی۔ میری ایک رائے ہے، آپ ڈائجسٹ میں کوئی موضوع بھی دیا کریں تا کہ جو لوگ کہانیاں لکھتے ہیں، وہ پھر کسی موضوع پر لکھا کریں گے۔ یہ

ایک رائے ہے میری' میں آپ کو ایک عدد غزل اور بھیج رہا ہوں۔ جب آپ کو موقع ملے تو میری غزل کو شمارے میں ضرور شامل کیجیے گا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ اگلے شمارے میں میری غزل شامل کریں جب آپ کو موقع ملے لیکن میری منزل کو آپ امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھیے گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔''

✍ راشد بھائی! آپ نے ہماری مجبوری کو سمجھا' یقین کریں بہت خوشی ہوئی۔ محفل میں پابندی سے آتے رہیے۔

☒ خالدہ شفق' ملتان سے۔ ''ڈیئر منزہ سہام' السلام علیکم! امید واثق ہے کہ سب بخیر ہوں گے آپ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ طویل غیر حاضری کے بعد آج دل چاہا کہ آپ کو اپنی یاد دلائی جائے۔ نومبر کے شمارے پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گی کیونکہ ابھی تک میں نہیں خرید پائی۔ میں نے کچھ نظمیں اور کہانیاں بھیجی ہوئی ہیں۔ ناصر انکل' انہیں کب شائع کریں گے؟ دسمبر کے حوالے سے ایک نظم بھیج رہی ہوں' شائع کر دیں۔ آپ سب کے لیے ڈھیروں دعائیں اس شعر کے ساتھ اجازت' اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے' آمین!

اپنا چہرہ خود پڑھتی ہوں
اک گہری خاموشی ہے مجھ میں

✍ خالدہ جی! آپ کو ہم بھولے ہی نہیں تو آپ یاد کیوں دلا رہی ہیں؟ ناصر بھائی آپ کو بذاتِ خود جواب دیں گے۔

☒ تمثیلہ زاہد' کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا' السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ پچھلے دو سال سے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' زیرِ مطالعہ ہے۔ پچھلے دو ماہ سے کسی وجہ سے ماہنامہ لے نہیں پائی۔ بہر حال دوشیزہ میں کہانی لکھنے کے بعد ارادہ تھا ''سچی کہانیاں'' کے لیے بھی لکھوں۔ نئے لکھنے والوں کو آپ سب جس خلوصِ دل سے خوش آمدید کہتے ہیں' یہ بات لائقِ تحسین ہے۔ میں اپنے اسکول کے زمانے سے لکھ رہی ہوں۔ اب لکھتے ہوئے بارہ سال ہو گئے ہیں۔ چھوٹے میگزین سے بڑے میگزین پھر اخبار اور اب رسائل...... یہ نہ رکنے والا سفر میرے شوقِ دل کے گھوڑے پر سوار ہے۔ پچھلے تین ماہ سے کوشش کر رہی تھی کہ کہانی مکمل ہو جائے۔ میرے امی ابو 27 ستمبر کو ادائیگیٔ حج کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ گھر کی ذمہ داری نے قلم روک دیا۔ بہر حال دھیرے دھیرے کہانی مکمل کی۔ 7 نومبر کو میرے امی ابو حج سے واپس وطن آ رہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ سعادت اللہ ہر مسلمان کی زندگی میں لائے' آمین! اور میرے والدین کا حج قبول فرمائے' آمین ثم آمین! اپنی کہانی کے سلسلے میں آپ کی آراء کی منتظر رہوں گی۔ اب اجازت چاہوں گی۔''

✍ تمثیلہ! امی ابا کو حج کی سعادت بہت مبارک ہو۔ تمہاری کہانی ادارتی بورڈ کے حوالے کر دی گئی ہے' اب انتظار شروع کر دو۔

☒ ثانیہ بھٹی' سیالکوٹ سے۔ ''قابلِ احترام منزہ آنٹی' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ ''سچی کہانیاں'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پانچ تاریخ کو ملا۔ ابھی سچی کہانیاں پڑھ رہی ہوں۔ میں سچی کہانیاں میں جب بھی اپنی تحاریر دیکھتی ہوں' بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے آپ لوگ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔ اکتوبر کا مہینہ بہت ٹینشن میں گزرا۔ میرے کزن کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ دل بہت اداس ہے اور منورہ نوری خلیق صاحبہ کا پڑھ کر بھی دکھ ہوا۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے' آمین۔ میری سترہ دسمبر کو سالگرہ ہے' مجھے وش کر دیں پلیز' اچھا اب اجازت چاہوں گی اللہ پاک ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھیں' آمین۔''



✍ ثانیہ بیٹا! تمہارے کزن کے بارے میں جان کر دکھ ہوا۔ اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آئندہ رسالہ پڑھ کر تبصرہ ضرور کیا کرو اور ہاں' ایڈوانس سالگرہ مبارک۔

☒ محمد اسماعیل بروہی' نواب شاہ سے۔ ''السلام علیکم! پیاری آپی منزہ سہام! بہت نیک دعائیں آپ کے نام۔ آپ مجھے جانتی ہیں یا نہیں؟ کبھی ہم باقاعدہ شاملِ احوال ہوا کرتے تھے مگر اب پرچہ لیٹ ملتا ہے تو خط بھی نہیں لکھ سکتے۔ آپی یہ جو آپ کر رہے ہیں یہ سچی کہانیاں اور سہام انکل کی پالیسی نہیں تھی۔ ہم کہانی چھپنے کے انتظار میں سڑ رہے ہیں اور آپ اپنے پسند کے رائٹرز کی کہانیاں چھاپ رہے ہیں۔ پلیز' سب کو باری دیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انتظار انتظار میں مر کھپ جائیں۔ ایک اور بات کہ سلسلے وار کہانیاں چار ہو گئی ہیں مہربانی فرمائیں' صرف ایک سلسلہ وار کہانی چھاپیں اور آخری بات کہ ہم سب کا پسندیدہ سلسلہ محفلِ دوستاں شروع کی جائے۔ اب نومبر کے پرچے کی طرف۔ ماڈل عید کے حساب سے کلرفل ہونی چاہیے تھی۔ اداریہ میں ناصر انکل نے بالکل سچ کہا۔ ہم دوسروں پر انگلی اٹھاتے ہیں مگر اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے۔ ظالم دوسروں کو کہتے ہیں۔ ''نورِ قلم'' ہماری پسندیدہ رائٹر جواب ہمارے پاس نہیں' راجہ محمود نے منورہ نوری خلیق کے بارے میں خوب لکھا۔ ویلڈن راجہ صاحب۔ ''اور پھر ہوا یوں'' صدف آصف، ''جینا اسی کا نام ہے'' شینا نور محمد، ''ایسا بھی ہوتا ہے'' عکاشہ سحر، ''اک غلط قدم'' ثمرین ادریس کی کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ ''خواب سہانے ٹوٹ گئے'' محمد فہیم انکل کی کہانی بہترین رہی۔ شاہد قریشی ہماری فیورٹ پرسن میں سے ہیں۔ ان کی کہانی ''لہو کی پیاسی'' بھی پسند آئی۔ ''آتش جنوں'' کی کیا بات...... جیسے انڈین فلم دیکھ رہے ہیں۔ ''خیال آرائی'' میں ثانیہ بھٹی کی شاعری پسند آئی اور اب اجازت۔''

✍ بھائی اسماعیل بروہی! بھئی' ہمارے لیے سارے رائٹرز اور احوالی پسندیدہ ہیں۔ آپ نے ہم پر فیورٹ ازم کا الزام لگا دیا بھائی' حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ آپ کے مشورے نوٹ کر لیے ہیں' جلد کوئی فیصلہ کریں گے۔ کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔

☒ لیلیٰ مرواقبال' سیالکوٹ سے۔ ''منزہ آنٹی' السلام علیکم! سلام کے بعد عرضِ بیاں کچھ یوں ہے کہ ''سچی کہانیاں'' بہت زبردست جا رہا ہے۔ اس میں تمام مواد بہت بہترین ہے۔ ماہِ نومبر کا پرچہ بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے ''بے شناخت نہیں رہا'' اور ''کر بھلا ہو بھلا'' کو پڑھا۔ دونوں بہت ہی اچھی کہانیاں تھیں۔ ''پھر ایسا بھی ہوتا ہے''، ''محبت کے سراب میں'' اور ''جینا اِسی کا نام'' کو پڑھا۔ بہت اچھی اور سچی سچائی ان میں نظر آئی۔ شاعری اور خیال آرائی سب بہت بہترین اور قابلِ ستائش ہے اور میری کہانی جو آپ کے پاس ہے جو میں نے سال کے شروع میں بھیجی تھی' اسے جلدی سے لگا دیں۔''

✍ لیلیٰ! تمہاری کہانی کے بارے میں ناصر رضا سے پوچھا تو وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اب تم سمجھ لو کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ بہر حال رسالہ پسند کرنے کا شکریہ' محفل میں آتی رہا کرو۔

☒ ایم سعید انور سعید' لاہور سے۔ ''نہایت قابلِ احترام منزہ سہام صاحبہ السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ نومبر کا شمارہ عید کی چھٹیوں کے بعد ملا۔ چلیں کوئی بات نہیں۔ اتنا انتظار تو ہو ہی جاتا ہے۔ اب اس ماہ کے شمارہ نومبر ''سچی کہانیاں'' کی طرف آتے ہیں۔ کہانیوں میں ناصر رضا کی تحریر ''ملالہ اور ملال'' اچھی تھی۔ اس معصوم اور چھوٹی سی لڑکی نے تعلیم کے فروغ کے لیے بہت کوشش کی اور اتنی سی عمر میں اتنی

زیادہ شہرت اور عزت حاصل کرلی اور اب پورا پاکستان اُس لڑکی پر فخر کرتا ہے۔ پسندیدہ تحریروں میں ''یہ در نہ کھولیں'' مور شاہد حسین وفا کی ''کچھ تو ہے'' ارباب قربان علی ایری کی ''بے شناخت نہیں رہا'' تنویر خالد کی ''محبت کے سراب میں'' ممتاز احمد کی ''کر بھلا ہو بھلا'' اُم مناہل کی ''اور خواب سہانے ٹوٹ گئے'' محمد فہیم کی تحریر تو بہت زیادہ اچھی لگی اور محمد فہیم بھائی کو سلام اور بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہماری خوشی کے موقع پر مبارک باد دی اور ہمیں یاد رکھا۔ میری کہانی اور میری زبانی میں رخسانہ سہام مرزا کی تحریر ''یادوں کے اوراق'' بھی ختم شد ہوئی اور بہت اچھی لگی اور نزہت جبین ضیاء کی اس شمارے میں نظم بھی بہت پسند آئی۔ ''احوال'' میں پہلے نمبر پر سلیم اختر بھائی کا خط پسند آیا اور سلیم بھائی' آپ تو مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں کیونکہ میں آپ کی ہر تحریر پڑھتا ہوں۔ آپ کا اتنا لمبا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور تندرستی دے' آمین۔ آخر میں سب بہن بھائیوں کو سلام اور دعا۔''

بھائی سعید! رسالہ اچھا لگا شکریہ۔ آپ بس اب ایک اچھی سی کہانی لکھ ہی ڈالیں۔

☒ کوثر سعید' لاہور سے۔ ''محترمہ منزہ آپی صاحبہ السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اِس ماہ کا ٹائیٹل اچھا لگا اور ''تحریر یادوں کے اوراق'' اختتام پذیر ہوئی۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس ماہ کی تحریروں میں ''تاشون'' شازلی سعید مغل کی۔ ''اے کاش کہ......'' ارم زہرا کی، ''جن آنکھوں میں......'' فاطمہ بلگرامی، ''ایسا بھی ہوتا ہے'' عکاشہ سحر کی، ''فریب نظر'' رانا محمد شاہد کی، ''جینا اِسی کا نام'' شینا نور محمد کی اور ''محبت کے سراب میں'' ممتاز احمد کی تحریر بہت اچھی لگیں اور منزہ سہام کی تحریر ''شہید کی ڈائری'' بھی اچھی لگی۔ شائستہ اور تحسین جونیجو کو سلام اور بہت سی دعائیں اور رضوانہ کوثر آپی کو سلام اور رابیل عطاری کو بہت سی دعائیں۔ اللہ آپ کو صحت اور تندرستی دے اور آپ پھر سے شمارہ میں لکھنا شروع کریں، (آمین) اور ہماری پیاری بیٹی عافیہ سعید کو سالگرہ مبارک اور دس دسمبر کو ہماری شادی کی سالگرہ بھی ہے۔ راجہ محمود کی تحریر ''نورِ قلم'' میں منورہ نوری خلیق کا زندگی نامہ پڑھ کر دکھ ہوا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت مشکل وقت دیکھا مگر انہوں نے بڑی ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا اور اچھی زندگی گزاری۔ آپ کی خبر میں عبدالعزیز جی آ بھائی کے بھانجے کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو صحت یابی دے اور بہن روبینہ شاہین کو شادی مبارک اور دوشیزہ کی سابقہ ایڈیٹر غزالہ رشید کو ہم ٹی وی کا شعبۂ اسکرپٹ جوائن کرنے پر مبارک باد۔ آخر میں سب بہن بھائیں کو سلام۔''

ڈیئر کوثر! یادوں کے اوراق میری تحریر نہیں تھی بلکہ میری امی رخسانہ سہام مرزا کی تحریر تھی۔ بہرحال پسند کرنے کا شکریہ۔ میری جانب سے عافیہ کو سالگرہ مبارک اور تمہیں بھی شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ خوش رہو۔

☒ اسماعیل بٹ' لاہور سے۔ ''السلام علیکم! محترمہ منزہ! امید ہے مزاج گرامی خیریت سے ہوں گے۔ میرا آپ کو اور آپ کے سارے ساتھیوں لکھاریوں کو دل کی گہرائیوں سے سلام۔ ساری کہانیاں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھیں جو بے حد پسند آئیں۔ ہماری دلی دعا ہے' آپ کا پرچہ سچی کہانیاں دن دگنی' رات چوگنی ترقی کرے۔ میرے بھتیجے کے ہاں اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا کیا ہے۔ اللہ پاک زندگی دے' آمین۔''

بھائی اسماعیل! خط لکھنے کا شکریہ! آپ کو کہانیاں اچھی لگیں' چلیں لکھنے والوں کی محنت وصول ہوئی اور اللہ آپ کے بھتیجے کو ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بنائے رکھے' آمین۔

☒ شگفتہ شفیق' کراچی سے۔ ''پیاری منزہ! آداب! کیسی ہو؟ یقیناً بہت مصروف کہ بھانجی کے پیا گھر



جانے کے دن نزدیک ہیں تو ساری تیاری تمہیں ہی کرنی ہے۔ بھئی ہم تو منتظر ہیں کہ ہماری شہزادی غراروں شراروں میں کیسی لگے گی۔ یہ ہم بھانجی کی بات نہیں کر رہے ہیں' اُس کی خالہ کی بات ہو رہی ہے۔ بہت انتظار رہے گا تمہاری خوب صورت تصاویر کا۔ بہت ساری سچی کہانیوں سے سجا ہوا نومبر کا شمارہ حسب سابق بہترین رہا۔ ناصر بھائی کے اداریے کی آخری سطورِ دل کو چھو گئیں۔ رضوان قیوم کو منزہ' جو تم نے جواب دیا ہے کہ آپ بھی ذرا اپنے ڈاک بابو کو جھنجوڑ لیں' بہت ہی پُر لطف لگا۔ راجہ محمود صاحب کا ''نورِ قلم'' بہت بہت بہت اچھا لگا۔ صدف آصف کی کہانی ''اور پھر یوں ہوا کہ......'' بہت پسند آئی۔ اُم مناہل کی کہانی ''کر بھلا تو ہو بھلا'' بھی پسند آئی۔ عکاشہ سحر کی کہانی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' بے حد اچھی لگی۔ ''یادوں کے اوراق'' آج کل میرا سب سے پسندیدہ سلسلہ تھا جو کہ رخسانہ جی' آپ نے بہت جلد ختم کر دیا اور اِس سلسلے کو ابھی جاری رکھتیں تو اچھا تھا۔ آپ سے جب بھی آفس میں یا فون پر بات ہوتی ہے' بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ بس ''سچی کہانیاں'' ابھی تک اتنا ہی پڑھا ہے۔ کچھ مصروفیت ہے۔ آفس میں سب کو سلام! رخسانہ جی کو آداب اور ناصر بھائی کی خدمت میں بھی بہت سلام کہہ دیں۔ اب اجازت' اللہ حافظ!''

پیاری سی شگفتہ! میں ہمیشہ یہی کہتی ہوں' آپ خود اتنی اچھی ہیں کہ سب آپ کو اچھے لگتے ہیں۔ کہانیاں اور سلسلے پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا سلام ناصر بھائی اور امی تک پہنچا دیا۔

بھائی تاثیر حیدری! (اوچ شریف' ضلع بہاول پور) آپ کے خط' خط نہیں' پوری ایک کہانی ہے۔ اِن لمبی کہانیوں کو ''احوال'' میں شائع کرنے سے بہتر ہے کہ اس ماہ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں آپ کی ایک کہانی لگا دی جائے' سو کہانی لگ رہی ہے۔

## اس ماہ کا خصوصی خط

☒ ابو محمد آزاد' کراچی سے۔ ''محترم ناصر رضا' السلام علیکم! امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ میری طبیعت ان دنوں اچھی نہیں ہے۔ کمر میں چک آ گیا ہے۔ خیر' چھوڑیئے۔ یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔ ناساز طبیعت کو اس وقت جلا ملی جب گھر کی بیل بجا کر ڈاکیہ نے 500 روپے کا منی آرڈر ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ یہاں پر دستخط کر دیں۔ دستخط کرتے ہوئے سوچتا چلا گیا۔ یا خدا! یہ کون سے مہربان ہیں جو مجھ پر مہربان ہوئے؟ منی آرڈر کا آخری حصہ جب اس نے دیا تو اس کی پشت پر ''سچی کہانیاں'' کی مہر لگی ہوئی تھی' تب یہ عقدہ کھلا کہ آپ اور آپ کا ادارہ ہمت افزائی کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمت افزائی کا تہہ دل سے بہت بہت شکریہ۔ امید قوی ہے کہ آئندہ بھی اس فقیر کی ہمت افزائی کی جاتی رہے گی۔ میرے لیے یہ ایک بڑا اعزاز ہوگا اگر آپ اپنی کسی تحریر سے مجھ کو ایک تحسین نامہ بحوالہ میری کہانی ارسال فرمائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی طویل مصروفیت کی ہی وجہ سے میری کہانی (جو قریب ایک سال پہلے آپ کو ارسال کی تھی۔) ''خود پرستی'' اب تک نہیں چھپ سکی ہے۔ برائے کرم مذکورہ کہانی کو جلد کسی شمارے میں جگہ دے کر ممنون فرمائیے' شکریہ۔''

بھائی آزاد! جلدی سے ٹھیک ہو جائیے اور فون کر کے ناصر بھائی سے کہانی کے بارے میں ضرور پوچھیں۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا
منزہ سہام مرزا





راجہ محمود

# صوفی قوال

قابل اجمیری کا خیال

ایک دن پوچھتی پھرے گی حیات
اہلِ دل کس نگر میں رہتے ہیں

**فن قوالی کو جدت میں ڈھالنے والے استاد نصرت فتح علی خان کا سازِ زندگی**



گھر میں گہما گہمی اور رونق لگی ہوئی تھی۔ مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ صاحب خانہ کا چہرہ مسرت سے کھلا جارہا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے مبارک بادیں سمیٹ رہے تھے۔ یہ اپنے وقت کے معروف قوال استاد بڑے فتح علی خان کے گھر کا منظر تھا۔ رشتے دار عزیز و اقارب اور احباب سے گھر کا مردانہ اور زنانہ حصہ بھرا ہوا تھا۔ گھر چونکہ ایک قوال کا تھا پھر کیسے ممکن تھا



استاد نصرت فتح علی خان اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے

کہ خوشی کے اس موقع پر محفل سماع نہ رکھی جاتی اور خوشی بھی کوئی معمولی نہ تھی، فتح علی خان کے گھر نعمت اتری تھی۔ خدا نے چار بیٹیوں کے بعد انہیں اولاد نرینہ عطا کی تھی جس کے لیے وہ اپنے رَب کا جتنا شکر ادا کرتے، کم تھا۔ چنانچہ اپنے اکلوتے لختِ جگر کی خوشی میں فتح علی خان نے ایک چھوٹی سی پروقار تقریب رکھی تھی جس میں خاندان والوں کے علاوہ تمام ہی ملنے جلنے والے شامل تھے۔ اِس تقریب میں بچے کا نام پرویز رکھا گیا جسے بعد میں بدل کر نصرت کردیا گیا۔ بیٹا چونکہ اکلوتا تھا لہٰذا تمام نازو نخروں کے ساتھ اس کی پرورش شروع ہوگئی، تاہم لاڈ پیار ایک حد تک رہا کہ کہیں تربیت میں کوئی کجی یا کمی نہ رہ جائے۔ جب بچہ کچھ بڑا ہوا تو تعلیمی سلسلے کا آغاز فوری طور پر کیا گیا کیونکہ باپ کے ذہن میں اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے کچھ خاص خواب تھے جنہیں وہ اپنے بیٹے کے روپ میں حقیقت کا رنگ دینا چاہتے تھے۔ گھرانہ قوال کا تھا چنانچہ بچے نے آنکھ کھولتے ہی اپنے اردگرد طبلہ، سارنگی، ہارمونیم وغیرہ جیسے سازوں کو دیکھا اور راگ رنگ، گیت سنگیت سے گھر کے درو دیواروں کو گونجتے سنا۔ علی الصباح جب باپ اپنے معمول کے مطابق ریاض میں مصروف ہوتا تو بیٹا بہت اشتیاق سے باپ کو دیکھ رہا ہوتا تھا۔ بچے کا یہی



شوق وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ وہ باپ کی قوال پارٹی کے ساتھ محفلِ سماع کی تقریبات میں بھی جانے لگا تھا۔ یوں قوالی کے جراثیم اس کے اندر نمو پانے لگے تھے، تاہم والد فتح علی خان چاہتے تھے کہ بیٹا موسیقی پر توجہ دینے کے بجائے تعلیم پر دھیان دے اسی لیے اکثر وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کردیتے تھے۔

نصرت جب لڑکپن کے دور میں داخل ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ والد اسے قوالی یا موسیقی سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ اسے والد کے رویے پر حیرت ہوتی تھی مگر باپ سے یہ سوال پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جس کام کی گھر میں روٹی کھائی جاتی ہے، اس سے اسے کیوں دور رکھا جارہا ہے؟ اس دوران نصرت کا ایک اور بھائی بھی دنیا میں آچکا تھا۔ ایک روز جب والد کی قوال پارٹی ایک محفل میں شرکت کے لیے جارہی تھی تو نصرت نے بھی جانا چاہا مگر والد نے سختی سے منع کردیا۔ اس وقت تو وہ خاموش رہا مگر اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اپنے بابا جان سے اس حوالے سے ضرور پوچھے گا۔ چند روز بعد آخر اس نے ہمت کر کے اپنے اس سوال کو والد کے سامنے رکھ دیا جو کہ جانے کب سے اس کے من کو بے کل کیے ہوئے تھا۔ باپ نے بہت سکون سے بیٹے کے شکوے نما سوال کو سنا اور بہت نرم لہجے میں کہا۔

''بیٹا......! میں نہیں چاہتا کہ تم قوال بنو۔''

''مگر کیوں ابا جان؟'' باپ کی بات پر نصرت نے حیرت سے پوچھا۔

''اِس لیے کہ قوال کو ہمارے معاشرے میں عزت و تکریم کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔''

''نہیں بابا، لوگ تو بہت عزت کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے جب آپ قوالی گاتے ہیں تو لوگ خوب جھوم رہے ہوتے ہیں۔ کچھ تو اُٹھ کر آپ کے ہاتھ بھی چومتے ہیں۔'' نصرت نے حیرت سے کہا کیونکہ وہ محفلوں میں والد کی عزت دیکھ چکا تھا مگر وہ کہہ رہے تھے کہ قوالوں کی کوئی عزت نہیں کرتا۔

''بیٹا! ابھی تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ تم دل لگا کر پڑھو اور بڑے ہو کر ڈاکٹر بنو، بس یہی میری خواہش ہے۔''

''مگر بابا، میں آپ کی طرح قوال بننا چاہتا ہوں۔'' نصرت نے اپنی دلی خواہش کا اظہار کردیا۔

''نہیں، تم قوال نہیں بلکہ ڈاکٹر بنو گے۔'' والد نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

''مگر بابا......!''

''بس......! مجھے اگر مگر کچھ نہیں سننا۔'' والد نے حتمی فیصلہ سنا دیا اور نصرت مایوسی سے سر جھکا کر رہ گیا، گوکہ والد نے اس کے مستقبل کا تعین کرلیا تھا مگر قوالی سے اس کی دلچسپی میں کسی طور کمی نہیں آئی۔ وہ اب والد کی قوال پارٹی کے ارکان کے ساتھ بیٹھا ہوتا اور پرشوق نظروں سے انہیں کسی نئے کلام کی مشق کرتا ہوا دیکھتا۔ بیٹے کے شوق کی شدت کو دیکھتے ہوئے باپ کو سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ فتح علی خان اپنے پیشے کو برا سمجھتے تھے، وہ فن جو اُن کے خاندان میں نسل در نسل پچھلے 600 برسوں سے چلا آرہا تھا، بھلا وہ اس فن کو کیسے برا کہہ سکتے تھے؟ دراصل وہ معاشرتی رویوں سے نالاں تھے۔ بے شک محفلوں میں انہیں عزت دی جاتی تھی مگر عمومی طور پر ایک قوال کا وہ احترام نہیں کیا جاتا تھا جس کا وہ حق دار تھا۔ لوگ اسے فنکار نہیں بلکہ بھانڈ میراثی جیسے القابات سے نوازتے تھے۔ قوال کے بچوں کے لیے کسی معزز گھرانے سے رشتے نہیں آتے تھے۔ اسے معاشرے کا معزز فرد تصور نہیں کیا جاتا تھا بلکہ اسے عام فرد جتنی بھی عزت نہیں ملتی تھی، اسی معاشرتی رویے کے پیشِ نظر استاد فتح علی خان نے اپنے نورِ

نظر نصرت کو قوالی کے فن سے دور رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے بیٹا ڈاکٹر بنے تا کہ معاشرے میں اس کا ایک مقام ہو اور وہ معاشرے میں باعزت زندگی گزار سکے مگر بیٹے کا رجحان شدت کے ساتھ قوالی کی طرف تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی جوہر شناس نظروں نے بیٹے کے اندر ایک مکمل فنکار کو دیکھ لیا تھا اسی لیے اب وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے۔ بیٹے کو اپنی متعین کردہ راہ پر چلانے سے ان کی خواہش تو پوری ہو جاتی مگر بیٹے کے اندر مچلنے والا فنکار دنیا کے سامنے آنے سے پہلے ہی مر جاتا۔ چونکہ وہ خود ایک فنکار تھے اس لیے کسی طور بھی ایک فنکار کو بے موت نہیں مار سکتے تھے۔ ان کی خواہش کے مطابق بیٹا ڈاکٹر بھی بن جاتا اور معاشرے کا معزز فرد بھی کہلاتا مگر ان کا ضمیر ہمیشہ انہیں ملامت کرتا رہتا کہ ان کی وجہ سے ایک فنکار دنیا کے سامنے آنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ خاصی سوچ بچار کے بعد آخر انہوں نے بیٹے کی خواہش کے آگے دیوار بننے کی بجائے اس کے شوق کو جلا بخشنے کا فیصلہ کر لیا۔

نصرت کی عمر اُس وقت محض چودہ برس تھی جب والد کی زیرِ نگرانی اس کی موسیقی کی عملی تربیت کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے اسے طبلہ بجانا سکھایا گیا تا کہ مختلف النوع کی تال سے اس کی پہچان ہو سکے۔ نوجوان نصرت کو طبلے کی تھاپ کا سبق خود فتح علی خان دیتے تھے۔ طبلے پر کچھ مہارت ہوئی تو راگوں کی باری آئی۔ راگ ودیا اور بول بندش جیسے راگوں سے شروعات ہوئی۔ کئی ماہ تک شب و روز ان راگوں کی مشقیں جاری رہیں۔ لگن اور محنت سے نوجوان نصرت تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سُر اور تال کے بنیادی سبق ازبر ہو گئے اور ان پر مہارت حاصل ہوئی تو گانے کی باری آئی۔ کلاسیکل سنگیت سے گانے کی ابتداء ہوئی۔ گیت کی اِس انتہائی مشکل صنف کو



اہل خانہ کے ہمراہ

نوجوان نصرت نے بہت تیزی سے سیکھا تھا۔ اپنے ہونہار بیٹے کی موسیقی سے لگن دیکھ کر فتح علی خان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بیٹے کو موسیقی سے نہ روک کر انہوں نے درست فیصلہ کیا تھا۔ بیٹے میں چھپی صلاحیتوں کا تو اندازہ تھا ہی مگر نہیں جانتے تھے کہ اس میں موسیقی سے محبت اس حد تک کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ وہ نہایت تیزی سے تمام مراحل طے کر رہا تھا۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ بیٹا پرکھوں کے فن کو بہ خوبی آگے بڑھائے گا اور ان کا نام روشن کرے گا۔

استاد بڑے فتح علی خان اور ان کے بھائی

مبارک علی خان کا خاندان آزادی کے بعد جالندھر سے فیصل آباد آیا تھا جس کا پرانا نام لائل پور تھا۔ وہ بستی شیر خان جلال پور جٹاں سے تعلق رکھتے تھے۔ فتح علی خان اور ان کے بھائی اپنے وقت کے بڑے نامور قوال تھے اور اپنے پرکھوں کے صدیوں پرانے فن کو بہت عمدگی سے آگے بڑھا رہے تھے۔ ان ہی دونوں بھائیوں کی کوششوں سے قوالی نے صوفیوں کے مزاروں تک رسائی حاصل کی اور یوں بابا بلھے شاہؒ شاہ حسینؒ سلطان باہوؒ اور خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کو قوالی کی شکل میں پیش کرنے کا رواج عام ہوا۔

فیصل آباد میں ہی 13 اکتوبر 1948ء کو نصرت نے آنکھ کھولی۔ ان کا بچپن اسی شہر کی گلیوں، محلوں اور بازاروں میں گزرا۔ باپ اور چچا کو قوالی گاتا دیکھ کر نصرت کی دلچسپی بھی فن موسیقی اور قوالی گائیکی میں بڑھتی چلی گئی۔ استاد بڑے فتح علی خان کی زیرِ نگرانی بیٹے کی تربیت کا عمل جاری تھا کہ اچانک 1964ء میں فتح علی خان کا انتقال ہوگیا۔ نصرت فتح علی خان اُس وقت تک اتنا کچھ سیکھ چکے تھے کہ والد کے چہلم پر انہوں نے قوالی گا کر اپنی زندگی کی پہلی پرفارمنس دی اور یوں بطورِ قوال ان کے گائیکی کیریئر کا آغاز ہو گیا۔ اُس وقت نصرت محض سولہ برس کے تھے۔ نصرت نے والد کی قبر پر اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ محفل میں موجود حاضرین اس نوجوان کے فن سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ باپ کے بعد چچا مبارک علی خان اور سلامت علی خان نے نصرت کی تربیت مکمل کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس دوران نصرت، چچا مبارک علی خان کے ساتھ سماع کی محفلوں میں باقاعدگی سے جاتے تھے اور چچا کے پہلو میں بیٹھ کر وہ اپنے فن کو پیش کرتے تھے۔ 1971ء میں جب چچا مبارک علی خان بھی اس دنیا سے رخصت



## نصرت فتح علی خان کے اعزازات

- 1987ء میں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی۔
- 1995ء میں یونیسکو میوزک پرائز۔
- 1996ء میں مانٹریال ورلڈ فلم فیسٹول کے موقع پر ''گرانڈ پرکس'' ایوارڈ جو کہ سینما کے لیے اُن کی خدمات پر دیا گیا۔
- 2005ء میں یو کے میوزک ایوارڈز کے موقع پر ''لیجنڈز'' ایوارڈ۔
- 6 نومبر 2006ء کو ٹائم میگزین نے 60 برسوں کے ایشین ہیروز پر خصوصی نمبر نکالا تو نصرت فتح علی بارہ سرِ فہرست فنکاروں میں شامل تھے۔
- 2010ء میں NPR کے پچاس عظیم آوازوں کی فہرست میں بھی وہ شامل تھے۔
- اگست 2010ء میں CNN نے پچاس برسوں کے دوران گزرنے والے عظیم موسیقاروں کی فہرست بنائی تو وہ بھی اس فہرست کا حصہ تھے۔

ہوئے تو فیملی قوال پارٹی کی ذمہ داری 23 سالہ نصرت فتح علی خان کے نوجوان شانوں پر آ گئی۔ اس طرح خاندانی قوال پارٹی نصرت فتح علی خان، مجاہد مبارک علی خان اور ہمنوا کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ پارٹی کا سربراہ بننے کے بعد نصرت فتح علی خان نے پہلی بار پبلک کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ ریڈیو پاکستان پر کیا۔ ان دنوں ریڈیو پاکستان کے تحت جشنِ بہاراں کے عنوان سے سالانہ موسیقی کا میلہ سجا ہوا تھا جس میں نامور گلوکار اور قوال اپنے فن کا جادو جگا رہے تھے۔ نصرت فتح علی خان نے بھی ریڈیو کے اسٹوڈیو میں اپنی قوال پارٹی کے ساتھ بھرپور پرفارمنس دی اور اپنی دلکش آواز اور مسحور کن موسیقی سے استادوں کو حیران کر دیا۔ ان کی آواز ہوا کے دوش پر جس جس کے کانوں تک پہنچی، وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن نصرت کو جس کلام سے شہرت ملنا تھی، اس کے لیے انہیں زیادہ عرصے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ''حق علی علی'' اُن کی پہلی ہٹ قوالی ثابت ہوئی جس نے انہیں ملک بھر میں ایک منفرد پہچان عطا کی۔ اس کلام کو انہوں نے روایتی انداز میں مشرقی و روایتی سازوں کے ساتھ اس خوب صورتی سے گایا کہ ان کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی۔ اس مقبول قوالی کی خاص بات ''سرگم'' یعنی سارے گاما پا دھا نی سا کا بہت زبردست استعمال تھا۔ والد اور چچا کی زیرِ تربیت انہوں نے سرگم پر خاص محنت کی تھی۔ ان کی یہ خوبی پورے کیریئر میں ان کے گائے ہوئے کلام میں سب سے نمایاں رہی۔

نصرت فتح علی خان فطرتاً صوفی منش انسان تھے اور ہمہ وقت جذب و مستی کی کیفیت میں رہتے تھے۔ پابندی سے صوفی بزرگوں کے مزاروں پر حاضری دینا ان کا معمول تھا۔ وہ اولیاء اللہ کی بارگاہوں پر گلہائے عقیدت کے نذرانے اپنی آواز کے ذریعے پیش کرتے رہتے تھے۔ شاید ان ہی بزرگوں کی دعائیں تھیں کہ انہیں مستقبل قریب میں ایسی شہرت ملنے والی تھی جو پاکستان کے کسی قوال کے حصے میں نہیں آئی تھی۔



اُن کی قوال پارٹی کا سفر اسی طرح جاری و ساری تھا کہ 1971ء میں وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ان کی شریکِ زندگی چچا زاد ناہید تھیں جو کہ اُن کے چچا سلامت علی خان کی صاحب زادی تھیں۔ 1980ء کے اوائل میں برطانیہ کے اورینٹل اسٹارا ایجنسیز نامی ادارے سے ان کا معاہدہ ہوا جس کے تحت یو کے میں ان کے باقاعدہ کنسرٹ ہونے لگے۔ اس ادارے نے ان کی قوالیوں اور گیتوں کے بے شمار کیسٹس، سی ڈیز، ویڈیو ٹیپ اور ڈی وی ڈی ریلیز کیں، تاہم ان کی عالم گیر شہرت کا آغاز 1985ء میں پیٹر گیبریل کی فلم ''دی لاسٹ ٹیمپٹیشن آف دی کرائسٹ'' سے ہوا۔ گو کہ یہ ایک متنازعہ فلم تھی مگر اس کے میوزک کو بے حد پسند کیا گیا جو کہ استاد نصرت فتح علی کے فن کا منہ بولتا ثبوت تھا، اس فلم سے ان کی شہرت یورپ بھر میں پھیل گئی اور پھر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یورپ میں ان کے کنسرٹ کی لائن لگ گئی اور بڑے بڑے ادارے ان سے رجوع کرنے لگے۔ 1990ء میں ان کا البم 'مست مست' ریلیز ہوا جس میں ان کے ساتھ یورپ کے نامور میوزیشن مائیکل بروک نے کام کیا تھا۔ اس البم نے پاکستان میں بھی دھوم مچا دی خاص طور پر اس کی ایک قوالی ''دم مست قلندر مست مست'' ان دنوں بچے بچے کی زبان پر ہوتی تھی۔ ملکی تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسی قوالی ہو جو اتنی مشہور ہوئی ہو۔ اس البم نے انہیں وہ پہچان عطا کی جو آج تک ماند نہیں پڑ سکی۔ اس دوران انہوں نے ہالی ووڈ کی کئی فلموں کا میوزک دیا جس میں ''ڈیڈ مین واکنگ'' اور ''نیچرل بورن کلر'' جیسی فلمیں بھی شامل ہیں۔ استاد نصرت فتح علی خان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ قوالی جیسی خالص مشرقی صنف میوزک کو انہوں نے جدید سازوں کے ساتھ ایسی مہارت سے ہم آہنگ کیا کہ یورپ کے گورے بھی ان کی قوالی کی دھنوں پر جھوم اٹھے۔ ان کی ٹریڈ مارک قوالی ''دم مست قلندر مست'' کو 1998ء میں ایک یورپی میوزک گروپ نے ری مکس کر کے دوبارہ ریلیز کیا۔ قوالی کو جدید ساز و آہنگ میں پیش کرنے پر انہیں تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اکثر کہا جاتا تھا کہ انہوں نے قوالی کو ''کرپٹ'' کر دیا ہے۔ اس بات پر استاد نصرت فتح علی مسکرا کر رہ جاتے اور بس اتنا ہی کہتے کہ پاکستان میں لوگوں کو موسیقی کی سمجھ نہیں ہے۔

یورپ کے بعد ان کے فن کا جادو جلد ہی انڈیا تک پہنچ گیا۔ 1994ء میں انہوں نے راجر وائٹ کے ساتھ مل کر بھارتی فلم ''بینڈٹ کوئن'' (پھولن دیوی) کا میوزک ترتیب دیا جس نے ہندوستان بھر میں دھوم مچا دی، اس کے علاوہ انہوں نے ''اور پیار ہو گیا''، ''دھڑکن'' اور ''کچے دھاگے'' نامی فلموں کا نہ صرف میوزک دیا بلکہ ان فلموں کا ایک ایک گانا خود بھی گایا۔ انڈین فلموں میں ان کے تمام گانے سپرہٹ ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ سنی دیول کی فلم ''دل لگی'' کے لیے ان کا گایا ہوا گیت ''سایہ بھی ساتھ جب چھوڑ جائے'' بھلا کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ یہ فلم ان کے انتقال کے دو سال بعد ریلیز ہوئی تھی۔ انہوں نے پاکستانی فلموں میں بھی گایا اور ان کا میوزک دیا۔ استاد نصرت فتح علی خان نے اردو، پنجابی اور فارسی تینوں زبانوں میں لاتعداد گیت اور صوفیانہ کلام بہت خوب صورتی سے گائے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے برج بھاشا اور ہندی میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ بھارت کے یوم آزادی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر معروف موسیقی کار اے آر رحمان نے ایک البم ''وندے ماترم'' ریلیز کیا جس کا ایک گیت ''گروز آف پیس'' نصرت فتح علی خان نے گایا تھا۔ اے آر رحمان ان کے بہت بڑے فین تھے اور نصرت فتح علی خان سے مزید گیت گوانا چاہتے تھے مگر ان کے انتقال کے باعث اے آر رحمان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی، تاہم انتقال کے بعد رحمان نے استاد نصرت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ''گروز آف پیس'' کے نام سے ایک البم ریلیز کیا جس میں ان کا ایک کلام ''اللہ ہو'' شامل تھا۔ اے آر رحمان کا 2007ء کا ایک اور گیت ''تیرے بنا'' بھی نصرت فتح علی کو خراجِ عقیدت تھا۔

استادنصرت فتح علی خان غیر معمولی آواز کے مالک تھے۔اپنے 25 برس کے کیریئر میں انہوں نے لاکھوں افراد کواپنی آواز کے سحر میں جکڑے رکھا۔انہوں نے قوالی کوایسے جدید قالب میں ڈھالا کہ کوئی بھی قوال یہ کارنامہ انجام نہیں دے سکا۔ یورپ کے کسی کنسرٹ میں جب وہ جدید سازوں کے ساتھ صوفیہ کلام پیش کرتے تو گورے جھوم اٹھتے تھے۔ ان سے پہلے کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ قوالی جیسی صنف یورپ کے انگریزوں میں اس طرح پاپولر ہوگی۔

وہ مسلسل کئی کئی گھنٹے کنسرٹ میں پرفارم کرتے تھے۔ قوالی اور صوفیانہ کلام کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کرانے کا کریڈٹ استادنصرت فتح علی خان ہی کو جاتا ہے۔ نقادوں نے انہیں ''شہنشاہِ قوالی'' کے لقب سے نوازا جس کے وہ بجا طور پر حق دار تھے۔ انہوں نے امریکہ' جاپان' یورپ' انڈیا اور پاکستان سمیت دنیا کے چالیس سے زیادہ ممالک میں اپنے فن کا جادو جگایا۔ ان کے نام کے ساتھ ''استاد'' کا لقب اس وقت دیا گیا جب انہوں نے لاہور میں اپنے والد کی برسی کے موقع پر اپنے فن کا لاجواب مظاہرہ کیا تھا۔ گینیز بک آف ورلڈز ریکارڈ کے مطابق وہ دنیا کے واحد قوال ہیں جن کے سب سے زیادہ (125) البمز ریکارڈ ہوئے۔ انہیں عالمی سطح پر موسیقی کے عظیم اساتذہ کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ بھارت' امریکہ' برطانیہ اور جاپان میں موسیقی کے طلبہ ان کے فن پر ڈاکٹریٹ کر رہے تھے۔ ایک امریکی یونیورسٹی نے انہیں اعزازی پروفیسر شپ دے رکھی تھی جہاں وہ موسیقی کے حوالے سے لیکچر دیا کرتے تھے۔ جاپانی سائنس دانوں نے استاد نصرت فتح علی خان کے ایجاد کیے ہوئے راگوں اور راگنیوں پر سائنسی تجربات کا ایک سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ بھارتی فلم سازوں نے ان پر کروڑوں کی سرمایہ کاری کی تھی۔

استادنصرت فتح علی کا فنی کیریئر اسی طرح آب و تاب سے جاری تھا کہ ہیپاٹائٹس کے مرض نے ان کے جگر میں اپنے پنجے گاڑنا شروع کردیے۔ اس مرض نے آہستہ آہستہ ان کے گردوں کو بھی متاثر کرنا شروع کردیا۔

نتیجتاً ان کا پیٹ پھول گیا۔ انہیں لندن کے کرامویل اسپتال میں داخل کیا گیا جہاں ایک ہفتے تک ان کا علاج کیا گیا۔ مختلف ٹیسٹوں کے بعد ڈاکٹروں نے ان کے گردے کی ٹرانسپلانٹ کا فیصلہ کیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کے جگر کا علاج شروع کردیا تھا تاکہ وہ اس قابل ہوسکیں کہ انہیں گردے کی ٹرانسپلانٹ کے لیے امریکہ بھیجا جاسکے مگر دورانِ علاج ایک رات ان کی حالت بگڑ گئی۔ انہیں سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی' تاہم ڈاکٹرز نے بھرپور کوششوں سے جلد ہی ان کی حالت پر قابو پالیا گیا مگر اگلی صبح ان کی حالت مزید ابتر ہونے لگی۔ رات تقریباً ساڑھے تین بجے ان کے ذاتی معالج ڈاکٹر محمد یعقوب کو اسپتال طلب کر کے انہیں آئی سی یو میں منتقل کردیا گیا۔ اس موقع پر استادنصرت فتح علی خان کے سیکریٹری حاجی اقبال بھی موجود تھے۔ ان کے مطابق آئی سی یو جاتے ہوئے وہ پورے ہوش و حواس میں تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے۔ صبح آٹھ بجے قومی کرکٹ کے ہیرو جاوید میانداد بھی اسپتال پہنچ گئے تھے۔ اُسی وقت ڈاکٹر نے حاجی اقبال کو کہا کہ فوراً پاکستان فون کر کے اُن کی مسز کو جلد از جلد بلانے کی کوشش کرو مگر صبح گیارہ بج کر پچپن منٹ پر جب پاکستان کی گھڑیاں چار بج کر پچپن بتا رہی تھیں' ڈاکٹر یعقوب آئی سی یو سے باہر آئے' ان کے افسردہ چہرے پر صاف لکھا تھا کہ وہ کون سی دہل دہلا دینے والی خبر لے کر آئے ہیں اور پھر وہاں موجود سب ہی نے یہ اندوہناک خبر سنی کہ استادنصرت فتح علی خان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ جس وقت ڈاکٹر موت کی تصدیق کر رہے تھے' اس وقت پاکستان سے نصرت صاحب کے بھائی استاد فرخ فتح علی خان کا فون آیا۔ وہ اپنے بھائی کی خیریت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ حاجی اقبال نے انہیں بتایا کہ اب تو سب ختم ہوگیا اور لائن کٹ گئی۔ ان کے انتقال کی خبر جونہی پاکستان پہنچی' ان کی گیارہ سالہ بیٹی ندا اور ان کی شریکِ حیات پر سکتہ طاری ہوگیا اور انہیں اسلام آباد کے ایک اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ 24 اگست کو ان کی بیٹی کی سالگرہ تھی جسے وہ دیکھ نہ سکے۔ نصرت فتح علی کے انتقال کی خبر ان کے گھر دینے والے جاوید میانداد تھے۔ یوں 16 اگست 1997ء کو بروز اتوار عظیم فنکار استادنصرت فتح علی خان کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ ان کے انتقال کی خبر پاکستان میں ان کے لاکھوں پرستاروں نے آہوں' سسکیوں کے ساتھ سنی اور بہت غمزدہ ہوئے۔

ان کے انتقال سے جہاں فنِ موسیقی کا ایک سنہرا باب بند ہوا' وہاں بھارتی فلم انڈسٹری کو بھی کروڑوں کا نقصان ہوا۔ کہتے ہیں کہ سنجے دت کی گرفتاری یا امیتابھ بچپن کے ایکسیڈنٹ سے بھی بھارتی فلمی صنعت کو اتنا بھاری نقصان نہیں پہنچا تھا جتنا نصرت فتح علی خان کی ناگہانی وفات سے پہنچا تھا۔ ان کی دھنیں انو ملک اور ندیم شروان جیسے موسیقاروں نے چوری کی تھیں۔ نصرت فتح علی خان کے ہونہار شاگرد اور ان کے بھتیجے راحت فتح علی خان آج اپنے استاد کا نام خوب روشن کر رہے ہیں۔

راگ' راگنیوں' سُر تال اور سنگیت کی تاریخ میں استادنصرت فتح علی خان کا نام ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور فنِ قوالی ان پر نازاں رہے گا۔

......☆☆......

اختر شہاب

# امانت رکھی تھی

محسن بھٹی کا خیال

عمر بھر یاد کریں سب محسن
کام کچھ ایسے نرالے کردے

**ایک عورت کی روداد' اس نے اپنی ہی ملکیت کو بطور امانت سنبھال رکھا تھا**

جب سے میری والدۂ محترمہ کا انتقال ہوا ہے' میرا قبرستان آنا جانا بہت بڑھ گیا ہے ورنہ اس سے پہلے میں عید' شبِ برات پر یا پھر کسی کے انتقال پر ہی قبرستان جایا کرتا تھا مگر اب ہفتہ' دس دن میں ایک چکر لگ ہی جایا کرتا ہے۔ قبر پر حاضری سے نہ صرف رُوحانی سکون ملتا ہے بلکہ قبر کی صفائی ستھرائی سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ میں اَب بھی اپنی والدہ کی خدمت کر رہا ہوں۔

والدہ کے انتقال کے بعد جب ہم والدہ کی قبر کے انتخاب کے لیے قبرستان گئے تو گورکن نے وہاں دو قبریں کھود کر بنائی ہوئی تھیں۔ کھود کر بنانا شاید کراچی سے باہر والوں کو عجیب سا جملہ لگے مگر پنجاب یا اُن علاقوں میں جہاں چکنی مٹی ہے' قبر صرف کھودی جاتی ہے جبکہ کراچی میں چونکہ ریتیلی مٹی ہے اس لیے پہلے گڑھا کھودا جاتا ہے اور پھر بلاک کی قبر بنائی جاتی ہے اور نئے قبرستانوں میں گورکن عام طور پر دو ایک قبریں پہلے سے تیار رکھتے ہیں کیونکہ بلاکوں پر لگا ہوا سیمنٹ اگر اچھی طرح نہیں سوکھے گا تو بلاک گرنے کا خدشہ ہوتا ہے اس لیے قبر پہلے بنا دی جاتی ہے تاکہ وہ پختہ ہو کر بلاکس کے اوپر ڈالے گئے سلیب اور مٹی کا وزن برداشت کر لے تو ان قبروں میں سے ایک ہم نے اپنی والدہ کے لیے منتخب کر لی اور جب ہم والدہ کو تدفین کے لیے قبرستان لے کر آئے تو اس سے دو دن پہلے برابر والی قبر میں کسی کی تدفین ہو چکی تھی اور ہاں! دو دن پہلے کی بات پہ چونک کر یہ مت سوچیے گا کہ ہم کوئی پہنچی ہوئی چیز ہیں جو ہم نے والدہ کے انتقال سے دو دن پہلے ہی اُن کی قبر کا انتخاب کر لیا تھا یا پھر ہم اپنی والدہ کی بیماری سے تنگ آ گئے تھے اور ہمیں اُن کے مرنے کی جلدی تھی لہٰذا ہم نے پہلے ہی قبر تیار کروالی تھی۔





اصل بات یہ ہے کہ ہماری والدہ کا انتقال امریکہ میں ہوا تھا اور میت آنے میں چند دن لگنے تھے لہٰذا ہمیں سہولت ہو گئی تھی کہ ہم اپنی والدہ کے لیے بہترین آخری آرام گاہ منتخب کریں۔ قبر چونکہ پکی کرنے کا حکم نہیں ہے لہٰذا ہم نے اتنا ضرور کیا کہ قبر کے چاروں طرف کنگورے والی اینٹیں لگوا دیں۔ قبر پر پھول پودے لگا کر پانی دینے کے لیے قبرستان میں کام کرنے والے ایک فرد کی ذمہ داری لگا دی۔

اپنی والدہ کی قبر پر جانے کے دوران ہم نے محسوس کیا کہ والدہ کی پڑوس والی قبر پر کوئی فاتحہ تک پڑھنے نہیں آتا بلکہ جب سے وہ دفنا کر گئے ہیں' انہوں نے شاید ہی دوبارہ آنے کی زحمت کی ہو' سو طے یہ پایا کہ جیسے ہماری والدہ اپنی زندگی میں پڑوسیوں اور محلے داروں کا خیال رکھتی تھیں اور جہاں جہاں وہ رہیں' وہاں کے پڑوسی اور محلے دار آج تک انہیں نہیں بھولے اور انہیں یاد کرتے ہیں' اُسی طرح ہماری بھی ذمہ داری ہے کہ ہم اُن کے پڑوس کی قبر کا خیال رکھیں' سو ہم نے اپنی والدہ کی طرح اُس قبر کا بھی خیال رکھنا شروع کر دیا۔ اُس پر اینٹیں لگائیں اور ویسے ہی پھول پودے لگائے جیسے ہماری والدہ کی قبر پر لگے ہوئے تھے۔ پانی والا بھی اَب دونوں قبروں پر پانی ڈالتا' سو اُن کی شکل یوں بن گئی کہ جیسے یہ ایک ہی خاندان کی قبریں ہوں۔ ہمارے اس فعل پر والدہ نے خواب میں آ کر خوشی کا اظہار بھی کیا تھا۔

اپنی والدہ کی قبر کی طرف آتے ہوئے مجھے راستے میں ایک پرانی سی قبر ملا کرتی ہے۔ میں ویسے تو اُسے پھلانگ کر یا سائیڈ پر ہو کر نکل آتا ہوں لیکن کبھی غلطی سے اُس پر پیر بھی پڑ جاتا ہے۔ ایک دن حسبِ معمول میں والدہ کی قبر پر لگائے ہوئے پھول پودوں کی صفائی کر رہا تھا کہ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ اُس دن میں اور میرا ایک کزن قبرستان گئے تھے۔ میں عام طور پر عصر کے

بعد قبرستان آجاتا ہوں مگر چونکہ مجھے اپنے دوست نما کزن کو بھی ساتھ لینا تھا اس لیے کچھ دیر ہوگئی تھی اور اُس وقت مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ میں چونکہ اپنے دھیان میں پودے صحیح کر رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ میرا کزن میرے پیچھے آ کے کھڑا ہوگیا ہے مگر فوراً ہی خیال آیا تھا کہ اُس نے خوشبو تو نہیں لگائی تھی تو پھر یہ ہلکی ہلکی بھینی بھینی سی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے؟ میں نے یہ سوچا اور مڑ کر دیکھا تو میرے پیچھے سفید کُرتے پاجامے میں ملبوس ایک بزرگ کھڑے تھے۔ سفید براق داڑھی میں اُن کا نورانی چہرہ چمک رہا تھا۔ میں انہیں دیکھ کر کھڑا تو ہوگیا تھا لیکن مجھے یہ حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ اچانک کہاں سے آ گئے؟ ’ہوسکتا ہے‘ یہ نزدیکی مزار کی طرف سے آئے ہوں گے؟‘ میرے دل میں والدہ کی قبر سے ذرا دور بنے مزار کو دیکھ کر خیال آیا تھا۔

وہ میرے بالمقابل کھڑے تھے اور سورج اُن کے پیچھے غروب ہو رہا تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سورج کی کرنیں اُن سے چھن کر میرے پاس پہنچ رہی ہیں اور اُن کا بدن سورج کی روشنی کو روک نہیں رہا۔ میں کچھ خوفزدہ سا ہوگیا۔ ’یہ کوئی انسان ہیں یا......؟‘ میں نے سوچا۔

”سب ماں کے لیے کرو گے؟“ انہوں نے گونجدار سی آواز میں کہا۔ ”وہ خوش ہیں‘ کچھ ہمارے لیے بھی کرو۔“

”جی؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اُن کی بات سن کر میرا تمام احترام ختم ہوگیا۔ ”ارے‘ یہ تو کوئی مانگنے والا ہے‘ اسے کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ یہ میری والدہ کی قبر ہے‘ اَب یہ خیر خیرات مانگنے آیا ہے۔“

”کسی کے بارے میں بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔“ وہ بولے۔ انہوں نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ ”کبھی اچھی باتیں بھی سوچ لیتے ہیں۔“

”جی......!“ پھر میرے منہ سے نکلا۔ مجھے حیرانی تھی کہ انہوں نے میری سوچ کیسے پڑھ لی؟

”اِدھر آؤ۔“ وہ بولے اور ایک طرف چل دیئے۔

میں نے اُن کے پیچھے جانے کے بجائے اپنے کزن کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ کچے رستے پر کھڑی گاڑی میں سے کچھ پھول وغیرہ نکال کر لا رہا تھا‘ تب مجھے بھی خیال آیا کہ قبر پر ڈالنے کے لیے پھول پتیاں اور چڑیوں کا باجرہ تو ہم گاڑی میں ہی بھول آئے تھے۔

”کہاں رک گئے میاں؟“ وہ بولے۔ ”جلد آؤ‘ دیر ہو رہی ہے۔“

میں اُن کی بات سن کر تیزی سے اُن کی طرف بڑھا تو وہ رستے میں پڑنے والی اُسی کچی قبر کے پاس رکے ہوئے تھے۔ ”یہ میری قبر ہے۔“ وہ بولے۔

”جِ......جی......!“ پھر میرے منہ سے جی ہی نکلا۔

”اسے بھی صحیح کرا دینا۔“ انہوں نے کہا۔

”بب......بھوت......“ اس سے پہلے کہ میں اُن سے کچھ پوچھتا‘ میرے پیچھے آنے والا کزن چیخ مار کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اُسے روکنے کے لیے آوازیں دیں مگر وہ تیزی سے بھاگتا ہی جا رہا تھا اور پھر میں نے مڑ کر اُن بزرگ کو دیکھنا اور اُن سے بات کرنا چاہی تو وہ غائب ہو چکے تھے۔

اَب میں نے اُن کی قبر پر مٹی ڈلوا دی ہے اور پانی والا مقرر کر دیا ہے اور اَب جب بھی قبرستان والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتا ہوں تو اُن بزرگ کی قبر پر بھی ضرور جا کر فاتحہ پڑھتا ہوں اور اکثر سوچتا ہوں کہ کاش‘ اُس دن میرا کزن ڈر کر نہ بھاگ جاتا تو اُن بزرگ سے مزید تعارف حاصل کر لیتا اور اِس کے ساتھ یہ خواہش بھی دل میں جاگتی ہے کہ کسی دن وہ بزرگ مجھ سے ملاقات کریں اور کہیں کہ ”شاباش......! میں تم سے بہت خوش ہوں......“ خیر‘

مندرجہ بالا واقعہ بیان کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں اتفاقات ہوتے رہتے ہیں اور یہ اتفاقات بہت سی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں اور اگر یہ اتفاقات نہ ہوں تو یکسانیت کی وجہ سے یہ دنیا بے کیف اور بے رنگ ہو جائے۔

میں جس راستے سے عموماً قبرستان آتا‘ وہ رستہ بوجوہ بند ہوگیا اور مجھے ایک لمبا چکر کاٹ کر جب قبرستان آنا پڑا تو مجھ پر قبرستانوں کے اور بھی راز منکشف ہوئے مثلاً یہ کہ قبرستان ہر شخص کے لیے جائے عبرت نہیں ہے بلکہ کچھ لوگوں کے لیے یہ جائے پناہ ہے تو یہ کچھ لوگوں کے لیے جائے عیاشی بھی ہے۔ یہاں نہ صرف شراب‘ جوا اور حرام کاری جیسے جرائم بھی ہوتے ہیں بلکہ قبرستان آنے والوں کو گلیوں اور بازاروں میں جانے والوں کی طرح لوٹ بھی لیا جاتا ہے لہٰذا جب بھی قبرستان جائیں‘ محتاط ہو کر جائیں۔ یہاں بھی قبریں کھودنے‘ انہیں پکی کرنے اور اُن پر پانی ڈالنے میں ٹھیکے داری ہے‘ جھگڑے ہیں اور اس کے علاوہ قبروں پر لگے ہوئے اچھے پودے کی چوری ہے۔ غرض یہ کہ دنیا کا کون سا ایسا کام ہے جو یہاں نہیں ہوتا۔ قبروں سے ہڈیاں اور عورتوں کے بال نکال کر بیچ دینا تو آپ میڈیا پر دیکھ ہی چکے ہیں۔

اُس دن میں قبرستان کے گیٹ پر کھڑا حسبِ عادت قبرستان میں داخل ہونے کی دُعا پڑھ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ بچپن میں سنا تھا کہ اگر آپ قبرستان میں بغیر دُعا پڑھے داخل ہوں اور بغیر فاتحہ پڑھے واپس ہوں تو آپ کے جانے کے بعد آپ کے مرحوم عزیز کے پڑوسی مُردے اُس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اُس سے جھگڑا کرتے ہیں کہ تمہارے پاس آنے والا ہمارے لیے کچھ نہیں لایا یا پھر اس لیے کہ یہ رسول پاک ﷺ کی سُنت ہے اور اس لیے بھی کہ یہ مرنے کے بعد نیک اعمال کے لیے ہمارے ہی محتاج ہیں کہ ہم اُن کے لیے کچھ کریں بلکہ یہ ذمے داری تو نماز میں ہی ہم پر ڈال دی گئی ہے اور ہمیں ہر نماز میں

رَبنا اغفرلی ولوالدیہ وللمومنین

یعنی اپنی‘ اپنے والدین اور تمام مومنین کی بخشش کی دُعا کرنے کو کہا گیا ہے لہٰذا جب نماز میں یہ حکم ہے تو عام زندگی میں تو یہ اور اہم ہو جاتا ہے کہ ہم اُن کی مغفرت کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں۔ خیر‘ میں دُعا پڑھ رہا تھا تو اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے برابر آ کر کھڑا ہوگیا ہے اور اُس کا سایہ مجھ پر پڑ رہا ہے۔ میں ڈر گیا کہ کہیں وہ بزرگ دوبارہ تو نہیں آ گئے!...... میں نے دائیں طرف گردن موڑی تو دیکھا‘ ایک صاحب میرے برابر کھڑے قبرستان کے گیٹ پر نصب سنگِ مرمر کی تختی پر لکھی ہوئی قبرستان میں داخل ہونے کی دُعا پڑھ رہے تھے۔

”میں کوشش کرتا ہوں مگر ابھی تک مجھے یہ دُعا یاد نہیں ہوئی۔“ وہ مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر مسکرا کر بولے۔

”عام طور پر ایسی دُعائیں لوگوں کو یاد نہیں ہوتیں بلکہ آج کل تو لوگوں کا دُعاؤں کو یاد رکھنے کا رجحان ختم ہوگیا ہے‘ لوگ نہ صرف دُعائیں یاد نہیں کرتے بلکہ آپ کی طرح اس کا اعتراف بھی نہیں کرتے۔“ میں نے اُن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام غفار بندیال ہے۔“ انہوں نے دُعا پڑھ کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی تقریر سن کر خوشی ہوئی۔“

”مجھے بھی آپ کی صاف گوئی نے مزہ دیا۔“ میں اُن کی بات پر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے مسعود کہتے ہیں۔“ میں نے اپنا تعارف کروایا۔

”آپ آئے ہیں یا جا رہے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا ہوں۔“

میں نے جواب دیا۔
"اتفاق سے میں بھی اپنی والدہ کی خدمت کو حاضر ہوا ہوں۔" وہ بولے۔
"خدمت......!" میں نے تعجب سے اُن کی طرف دیکھا۔ "وہ قبرستان میں کیا کر رہی ہیں؟"
"آپ کی والدہ کی طرح ابدی آرام فرما رہی ہیں۔"
"اوہ معذرت...... میں کچھ اور سمجھا تھا۔"
"کوئی بات نہیں۔" وہ بولے۔ "میں اپنی والدہ کی قبر کی صفائی ستھرائی اور پانی وغیرہ ڈالنے کو اُن کی خدمت ہی کہتا ہوں۔"
"آپ واقعی دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس پہلو سے تو کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ خدمت اس طرح بھی ہو سکتی ہے حالانکہ میں یہی کام ذمے داری سمجھ کر کرتا ہوں۔ پر آپ صحیح کہتے ہیں اگر یہ کام خدمت سمجھ کر کیا جائے تو اس کام کی بات ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔"
"لو بھئی، ہماری ماں کا آرام گھر آ گیا۔" وہ چلتے چلتے اچانک رک گئے اور بولے، تب مجھے احساس ہوا کہ ہم باتوں باتوں میں قبرستان میں کافی اندر تک آ گئے تھے۔ ہمارے بائیں طرف چونکہ قبرستان کی دیوار تھی لہٰذا میں نے دائیں طرف اُن کی انگلی کے اشارے کی سمت دیکھا تو مجھے دو ایک جیسی قبریں نظر آئیں جن پر چاروں طرف سے ماربل لگا ہوا تھا مگر درمیان میں سے کچی تھیں۔ دونوں قبروں پر کوئی کتبہ نہیں لگا ہوا تھا۔
"یہ ہماری والدہ کی قبر ہے۔" وہ دائیں طرف والی قبر کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولے اور درمیان والے کچے حصے سے گھاس پھونس اور تنکے صاف کرنے لگے۔
"دوسری قبر شاید آپ کے......" میں والد کہتے کہتے رک گیا اور بات بدل کر بولا۔ "کسی قریبی رشتہ دار کی ہے۔"
"نہیں، نہیں......" وہ بولے۔ "یہ ہمارے کسی عزیز کی نہیں ہے لیکن ہم اس کا خیال اپنے عزیز کی طرح ہی رکھتے ہیں۔"
"کیوں......؟" میں حیران ہوا۔
"یہ اصل میں ہماری اماں کی محسن ہے۔"
"محسن! میں سمجھا نہیں۔" میں حیرانی سے بولا۔
"بات لمبی ہے۔ اگر آپ کو فرصت ہو تو آپ ہمارے گھر آ جائیں پھر تفصیل سے بات کریں گے۔"
"بخوشی۔" میں نے کہا۔ "آپ یہیں انتظار کریں، میں بھی اپنی والدہ کی خدمت کر آؤں۔"
"آپ کی والدہ کی قبر کہاں ہے؟" انہوں نے پوچھا۔
"اُس طرف......" میں نے ہاتھ سے مشرق کی سمت اشارہ کیا۔
"تو پھر آپ اِدھر سے کیوں آئے؟" انہوں نے پوچھا۔
"دو باتیں ہیں، ایک تو اِدھر کا راستہ بند تھا اور دوسرے آپ سے ملاقات کا سبب بننا تھا۔"
"اچھا رکیں، میں فاتحہ پڑھ لوں تو آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ وہاں سے آگے نکل جائیں گے ورنہ واپس آنے جانے میں تو آپ کو بہت لمبا راستہ پڑ جائے گا۔" اور پھر وہاں سے فاتحہ پڑھ کر جب ہم قبرستان کے اُس حصے میں پہنچے جہاں میری والدہ کی قبر تھی۔
"یہ میری والدہ کی قبر ہے۔" میں نے انہیں بتایا۔
"ارے، آپ نے تو کچی قبر پر بہت خوبصورتی سے پھول پودے لگائے ہیں۔ مجھے پسند آئے۔ میں بھی اپنی والدہ کی قبر پر یہی طریقہ اپناؤں گا اور یہ دوسری قبر؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولے۔ "کسی عزیز کی ہے۔"
"نہ عزیز کی نہ محسن کی، بس پڑوسن کی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "بات یہ ہے کہ یہ قبر کسی نامعلوم خاتون کی ہے، دفنانے کے بعد سے اس پر شاید ہی کوئی فاتحہ پڑھنے آیا ہو، بس ایک دفعہ ایک صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہوتے ہیں اور انہوں نے باقی ذمہ داری اپنے چھوٹے بھائی پر ڈالی ہوئی ہے کہ وہ والدہ کی قبر کا خیال رکھے، پر اُس دن کے بعد سے تو اِس کی قبر پر میں نے کسی کو نہیں دیکھا، یہاں تک کہ برسی پر بھی کوئی نہیں آیا حالانکہ میں پانی والے سے پوچھتا بھی رہتا ہوں کہ اگر کوئی آئے تو مجھے بتائے، مگر اُس نے بھی کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ ہماری والدہ اپنی زندگی میں بھی اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھتی تھیں تو انتقال کے بعد بھی انہیں پڑوسیوں کا خیال ہے، سو انہوں نے ہماری ذمہ داری لگا دی ہے اس قبر کی دیکھ بھال کی۔"
"آپ اچھے لوگ ہیں۔" وہ بولے۔ "یہاں زندہ پڑوسیوں کو کوئی نہیں پوچھتا، اور آپ مُردہ پڑوسیوں کا بھی خیال رکھ رہے ہیں۔"
"ہم گناہ گار...... والدہ کی سکھائی ہوئی باتوں کے مطابق زندہ پڑوسیوں کا بھی حتی المقدور خیال رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔" میں نے انہیں بتایا تھا۔

......•......•......

اُس وقت ہم غفار بندیال کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس روز تو میں اُن کے ساتھ نہ جا سکا تھا کیونکہ اُن کا ایک ضروری فون آ گیا تھا، سو وہ مجھ سے معذرت کر کے رخصت ہو گئے تھے مگر اپنا رابطہ نمبر مجھے دے دیا تھا، یوں فون کے ذریعے ملاقات کا وقت طے کر کے اَب میں اُن کے گھر بیٹھا ہوا تھا۔
میں اُن سے دوبارہ ملنے کبھی نہ جاتا مگر بحیثیت کہانی کار میرا تجسس مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں معلوم کروں کہ دو ایک جیسی قبروں کا آخر کیا راز ہے؟ اور وہ کیا احسان تھا جس کی وجہ سے یہ لوگ ایک غیر خاتون کو والدہ کے برابر درجہ دینے پر مجبور ہیں؟
"اُس روز مجھے کوئی ضروری فون نہیں آیا تھا۔ وہ تو ایک عام سی کال تھی لیکن چونکہ آپ مجھے باتوں باتوں میں بتا چکے تھے کہ آپ کہانیاں بھی لکھتے ہیں تو یہ جاننے کے بعد میں دراصل سوچنے کا وقت چاہتا تھا کہ آپ کو یہ قصہ سناؤں یا نہ سناؤں، اس لیے میں نے آپ سے رخصت لے لی تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے اور میں اس کی تشہیر نہیں چاہتا۔"
"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے کہا۔ "مگر یہ یاد رکھیے گا کہ اگر آپ نے مجھے یہ قصہ بتایا تو مشتہر ہو جائے گا۔"
"خیر، اب جو بھی ہو آپ یہ کہانی سن لیں اور اگر اس کے شائع ہونے سے کسی کا بھلا ہوتا ہو تو شائع کیجیے گا۔ اصل میں یہ کہانی پاکستان بننے سے پہلے شروع ہوتی ہے۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے کہنا شروع کیا تھا۔
"ہم لوگ دلی کے رہنے والے ہیں۔ میرے والد وہاں کے ایک معروف سُنار تھے اور دلی کے صرافہ بازار میں ہماری دکان تھی چونکہ میرے والد صاحب کے پاس بہترین کاریگر تھے لہٰذا نہ صرف دلی کے معززین اور گورے بلکہ دور دور سے صاحبِ حیثیت لوگ زیورات بنوانے اُن کی دکان پر آیا کرتے تھے۔ جب تحریکِ پاکستان شروع ہوئی تو شروع میں میرے والد اس کے حامی نہ تھے، ویسے بھی وہ سیاست کے بجائے کاروبار میں مگن رہنے والے انسان تھے مگر جب انہوں نے دیکھا کہ

ہندوؤں نے اُن کے کاروبار کا مقاطعہ شروع کر دیا ہے، ہندو گاہک اُن کی دکان پر آنے سے کترانے لگے ہیں اور اُن کا کاروبار ٹھپ ہوتا جارہا ہے تو والد صاحب کی آنکھیں کھلیں۔ اسی دوران ہمارے ایک ماموں علی گڑھ سے ہمارے ہاں آ کے ٹھہرے۔ وہ پکے مسلم لیگی تھے۔ جب والد صاحب سے بحث کے دوران انہوں نے پاکستان کے حق میں دلائل پیش کیے اور ہندوؤں کی اصلیت واضح کی تو والد صاحب جو اپنے کاروبار کے ٹھپ ہو جانے کی وجہ سے پہلے ہی نیم رضامند تھے، پوری طرح پاکستان کے قائل ہو گئے۔ انہوں نے دھیرے دھیرے اپنا کاروبار سمیٹنا شروع کر دیا اور اپنے پیسوں کو قیمتی جواہرات میں بدلنا شروع کر دیا چونکہ وہ خود سُنار تھے اور صرافہ کا کاروبار تھا لہٰذا یہ کام اُن کے لیے بہت آسان تھا۔

والد صاحب پہلی فرصت میں پاکستان چلے جانا چاہتے تھے مگر چند اصحاب کے پاس اُن کی رقوم پھنسی ہوئی تھیں اور انہیں اندازہ تھا کہ اگر وہ پاکستان چلے گئے تو یہ رقوم ڈوب جائیں گی، سو وہ رقوم نکلوانا چاہ رہے تھے اور واپس کرنے والے ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے، یوں ہمارا پاکستان جانا ٹلتا رہا اور اسی اثناء میں پاکستان بننے کا اعلان ہو گیا۔ فسادات اور بلوے تو پاکستان کا اعلان ہونے سے پہلے ہی شروع ہو چکے تھے اور والد صاحب کو اندازہ تھا کہ وہ مال و دولت کے حساب سے پہلے ہی فسادیوں کے لیے ایک بڑا ٹارگٹ ہیں لہٰذا ہم ۱۴ اگست سے پہلے ہی خاموشی سے کینٹ ایریا میں والد صاحب کے ایک انگریز دوست کے بنگلے میں شفٹ ہو گئے تھے۔ ۱۴ اگست کو اعلانِ آزادی ہوتے ہی فسادات میں تیزی آ گئی اور شاید بیس یا اکیس اگست کو ہمارا گھر لوٹ لیا گیا۔ بلوائیوں کو امید تھی کہ ہمارے گھر سے انہیں بہت مال ملے گا مگر اُن کی توقع پوری نہ ہو سکی تو وہ بہت برافروختہ ہوئے اور انہوں نے ہمارا گھر نگرانی پر رکھ لیا اور جب چند ایک دن کے بعد والد صاحب اپنے انگریز دوست کے منع کرنے کے باوجود خود ہی اکیلے چھپتے چھپاتے اپنے گھر کا جائزہ لینے گئے تو اُن کا ٹارگٹ بن گئے، انہوں نے والد صاحب کو گھیر کر بری طرح زدوکوب کیا اور اُن سے مال و دولت کا پتہ پوچھتے رہے۔ والد صاحب کے نہ بتانے پر وہ انہیں اور مارتے اور ہو سکتا ہے اسی دوران اُن کی جان بھی چلی جاتی مگر خوش قسمتی سے فوجی وہاں پہنچ گئے اور اُن کی جان بچ گئی مگر اِس تشدد کے دوران اُن کے سر پر ایسی چوٹ لگی تھی کہ اُن کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ ہم وہیں کینٹ ایریا میں رہ کر اُن کا علاج کرواتے رہے۔ اَب ہمارا پاکستان جانا دشوار تھا کیونکہ اول تو ہم انہیں ایسی حالت میں پاکستان نہیں لے جا سکتے تھے اور دوسرے پاکستان خالی ہاتھ جا کر کیا کرتے کیونکہ والد صاحب کی دماغی کیفیت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ ہمیں وہ جگہ بتانے سے قاصر تھے جہاں انہوں نے اپنا مال و متاع چھپایا ہوا تھا۔ بلوائیوں نے اسی مال و متاع کے لیے اُن پر اتنا تشدد کیا تھا کہ جب بھی ہماری والدہ اُن سے ایسی کوئی بات پوچھتیں تو وہ نہایت خوف زدہ ہوتے ہوئے ذہنی ہراس کی کیفیت میں چلے جاتے۔ اِن حالات میں والد صاحب کے گورے دوست والٹن صاحب نے ہماری بڑی مدد کی۔ انہوں نے ہی ہمیں پناہ دی اور والد صاحب کا علاج بھی کرواتے رہے۔ یہ ان ہی کی توجہ کا اثر تھا کہ والد صاحب کی حالت میں چھ آٹھ ماہ کے علاج کے بعد کچھ بہتری آ گئی تھی اور پھر جب اُن کی حالت مزید بہتر ہوئی تو انہوں نے وہ جگہ بھی بتا دی جہاں رقم اور جواہر وغیرہ چھپائے ہوئے تھے اور وہ کوئی بہت خفیہ جگہ نہیں تھی۔ اُسی کینٹ ایریا والے مکان کا آتش دان تھا پھر اس کے بعد ہم پرانے مکان میں اٹھ آئے۔ والٹن صاحب جو محض دوستی میں والد صاحب کی خاطر ہندوستان میں ٹھہرے ہوئے تھے، وہ انگلینڈ سدھار گئے تھے۔

والد صاحب ابھی ذہنی طور پر مکمل صحت یاب نہیں ہوئے تھے، انہیں جب بھی دورہ پڑتا، وہ پوچھتے۔ ''پاکستان آ گیا؟'' گو اِس عرصے میں دلی کے حالات کافی بہتر ہو گئے تھے اور جاننے والے لوگوں کا مشورہ یہی تھا کہ اَب پاکستان جانے کے بجائے یہیں سیٹ ہو جاؤ مگر والد صاحب کے معالج کا مشورہ اِس کے برعکس تھا۔ والد صاحب کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر اُن کا مشورہ تھا کہ ہمارا پاکستان جانا زیادہ بہتر ہے۔ پاکستان پہنچ کر والد صاحب تیزی سے صحت یاب ہوں گے ورنہ ہو سکتا ہے کہ بعد میں اُن کی حالت اور بگڑ جائے اور یہ مکمل پاگل ہو جائیں، سو پاکستان جانے کا فیصلہ ہوا اور ماموں کو ہم لوگوں نے پہنچنے کا تار دے دیا اور پھر اماں نے ابا کو جب یہ بتایا کہ ہم پاکستان جا رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اُس دن انہوں نے نئے کپڑے پہنے بلکہ اماں سے اصرار کر کے مجھے بھی شیروانی پہنوائی۔

ٹرین جب واہگہ بارڈر پر پہنچی اور ہم وہاں اترے تو اماں نے دیکھا کہ وہاں تو بڑی سخت چیکنگ ہو رہی ہے اور تلاشی کے دوران جو کچھ بھی کسٹم والوں کے ہاتھ لگتا ہے، وہ چھین لیتے ہیں۔ اماں ٹھہریں پرانے زمانے کی سیدھی سادی عورت، وہ گھبرا گئیں۔ انہوں نے سوچا کہ بے ایمانی کیا کرنا۔ جس خدا نے یہاں اتنا دیا ہے، وہ وہاں بھی دے گا۔ یہ سارا مال میں یہاں راہِ خدا میں صدقہ کر دیتی ہوں۔ خدا پر اِس یقینِ کامل کے ساتھ انہوں نے اپنا جواہرات کا صندوقچہ نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھا تو انہیں اپنے پاس ہی ایک غریب سی عورت بیٹھی نظر آئی۔ انہوں نے وہ ڈبہ اُس کی طرف بڑھایا اور بولیں۔

''لو بی بی! یہ تمہارے ہوئے۔ بچا کے لے جا سکتی ہو تو لے جانا۔ ہمارے پاس تو نہیں بچیں گے کیونکہ جھوٹ ہم سے بولا نہ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑی تھیں۔

''ارے بیگم صاحبہ! یہ کیا ہے؟'' وہ عورت بولی اور جب اُس نے صندوقچہ کھول کے دیکھا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

''بیگم صاحبہ! یہ ہم نہیں لیں گے۔'' وہ اماں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ پر اماں تو اُس کی طرف متوجہ نہیں تھیں، وہ تو والد صاحب کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھیں کیونکہ انہیں پھر دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ عورت بھی اماں کی مدد کرنے لگ گئی اور جب میں خود کو اکیلا پا کر رونے لگا تو اُس نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ اماں اسی طرح ابا کو سنبھالے کسٹم ہاؤس کی طرف بڑھیں۔ کسٹم والوں نے جب ابا کی یہ حالت دیکھی تو سرسری چیکنگ کے بعد ہی ہمیں آگے جانے دیا۔

آپ کو شاید یہ بات افسانہ لگے کہ ایک عورت نے زندگی بھر کی پونجی خوفزدہ ہو کر یونہی کسی غیر عورت کو دے دی تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اُس وقت میری والدہ کی کیفیت کیا تھی، ایک تو وہ اکیلی، اُس پر ساتھ میں ذہنی مریض شوہر اور گود میں ڈھائی سال کا بچہ، دوسرے زندگی میں وہ پہلی مرتبہ گھر سے ایسے نکلیں، ساری زندگی تو وہ ابا کے سہارے چلیں۔ وہ ابا سے مشورے کا وقت تھا مگر ابا اُس وقت اِس قابل نہ تھے کہ کوئی مشورہ دے سکیں۔ اِس کے علاوہ وہ پیچھے کشتیاں جلا کر آئی تھیں تو واپس جانا بھی ممکن نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کسی بھی وجہ سے اُن کا جانا منسوخ ہو جائے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ اگر میرے پاس سے جواہرات نکل آئے تو مجھے مزید تفتیش کے بہانے روک لیا جائے گا کہ جب اتنے جواہرات نکلے ہیں تو باقی مال بھی ہوگا اسی لیے انہوں نے اپنے

آپ کوایک لحاظ سے محفوظ کرلیا تھا۔ ہاں! اِس دوران ایک خاص بات یہ ہوئی کہ وہ عورت جسے اماں نے جواہرات کا صندوقچہ دیا تھا' وہ مجھے کسٹم ہاؤس تک گود میں لے کر آئی اور جب اماں' والد صاحب کو سنبھالتی ہوئی کسٹم ہاؤس میں داخل ہوئیں اور جب تک کسٹم ہوا' وہ ہمارے ساتھ رہی۔ واہگہ بارڈر کے دوسری طرف ماموں ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو سنبھال لیا اور اماں نے مجھے گود میں لے لیا۔ میں گرمی کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا لہٰذا انہوں نے میری شیروانی اتار دی۔ ابھی انہوں نے شیروانی اتاری تھی کہ والد صاحب کو پھر دورہ پڑ گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح کہتے ہوئے قہقہے لگانے لگے۔ ''اچھا' پاکستان آ گیا۔'' اماں نے میری اتاری ہوئی شیروانی جلدی سے اٹیچی کیس میں بند کردی اور ماموں کے ساتھ مل کر والد صاحب کو سنبھالنے لگیں۔ وہ ایک ہاتھ سے والد صاحب کو سنبھال رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے انہوں نے مجھے گود میں اٹھایا ہوا تھا۔

ہم ماموں کے گھر پہنچے تو ممانی اور بچوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ماموں کو توقع تھی اور صحیح توقع تھی کہ ہم بہت مال لائے ہوں گے' پر جب اماں نے انہیں بارڈر پر جواہر کا صندوقچہ کسی عورت کو دینے کا بتایا تو انہیں یقین نہ آیا۔ اُن کے خیال میں اماں جھوٹ بول رہی تھیں اور اپنے بھائی کی مدد نہیں کرنا چاہتی تھیں' اس بات پر تلخیاں بڑھیں تو ہم الگ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف جب ابا کو یقین ہو گیا کہ وہ پاکستان میں ہیں اور محفوظ و مامون ہیں تو وہ اتنی تیزی سے صحت یاب ہوئے جیسے کہ وہ کبھی بیمار ہی نہ تھے اور پھر جب اماں نے انہیں جواہرات والے باکس کا ماجرا سنایا تو اماں کی توقع کے برعکس وہ قطعاً ناراض نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے کہا کہ ''تم نے خدا پر جس یقین اور توکل کا مظاہرہ کیا ہے' اِس سے مجھے یقین ہے کہ خدا ہمیں بہت دے گا۔ ویسے بھی وہ میرے ایمان داری سے کمائے ہوئے جواہر تھے اور میں نے ان کی زکوٰۃ بھی نکالی ہوئی تھی لہٰذا مجھے یقین ہے کہ مجھے ان کا بدل ضرور ملے گا۔'' اور پھر یوں بھی ہوا کہ اماں کبھی کبھار اگر افسوس کرتیں کہ میں کیوں گھبرا گئی اور میں نے کیوں وہ صندوقچہ اُس عورت کو دے دیا؟ ہماری تو ذرا بھی چیکنگ نہیں ہوئی' وہ جواہرات بھی بغیر چیکنگ کے چلے آتے تو والد صاحب' اماں کو منع کرتے کہ ''ایسی باتیں مت کرو' جو جس کی قسمت کا تھا' وہ لے گیا۔ میرا اللہ مجھے میری قسمت کا دے گا۔''

زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے ابا نے اپنا وہی سُنار کا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور مارکیٹ کا سروے کرنے لگے۔ ایک دن وہ گھر آئے تو انہوں نے اماں سے کہا۔ ''مارکیٹ میں موقع کی ایک دکان مل رہی ہے' پیسے ہوتے تو میں خرید لیتا مگر اتنا پیسہ موجود نہیں' یہاں تو کسی سے ادھار بھی نہیں لے سکتا۔ تمہارے بھائی سے کچھ امید تھی مگر وہ تو پہلے ہی ناراض ہو کر بیٹھا ہے۔''

''میں اُن کے پاس جاتی ہوں۔'' اماں بولیں۔

''ہرگز نہیں' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' والد صاحب بولے۔ ''مجھے تمہاری اور اپنی عزت بہت پیاری ہے۔''

چند روز بعد عید تھی' عید پر کپڑوں کے حوالے سے اماں کو اچانک بکس میں پڑی میری شیروانی کا خیال آیا تھا۔ یہ وہی شیروانی تھی جو پاکستان آتے ہوئے وہ مجھے پہنا کر لائی تھیں اور واہگہ بارڈر پر گرمی کی وجہ سے اتار کر بکس میں بند کردی تھی۔ انہوں نے وہ شیروانی نکال کر جھاڑی تو اُس میں سے وہ جواہرات نکل کر گرنے لگے جو اماں نے اُس



عورت کو صندوقچے میں دیئے تھے۔ اماں تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ''کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ کیا دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں؟'' انہوں نے سوچا۔

''سنیے!'' اماں نے والد صاحب کو آواز دی۔ ''دیکھیں' یہ کیا ہے؟'' اُن کی آواز میں جوش تھا۔

والد صاحب جلدی جلدی دوسرے کمرے سے آئے اور آپ یقین نہیں کریں گے کہ جب والد صاحب نے جواہرات کی گنتی کی تو تمام جواہرات پورے تھے' بس اُس میں صرف ایک ڈبیا نہیں تھی جس میں ہیرے کی وہ انگوٹھی تھی جو والد صاحب نے اماں کو منہ دکھائی میں دی تھی۔

''وہ ڈبیا کہیں رستے میں گر گئی ہو گی؟'' اماں نے سوچا تھا اور ویسے بھی اُن تمام جواہرات کے مقابلے میں اس ڈبیا کی کیا حیثیت تھی۔

وہ جواہرات ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے بہت زیادہ تھے' سو اُن سے والد صاحب نے نہ صرف دکان خریدی' کاروبار سیٹ کیا بلکہ ایک نیا مکان بھی خریدا اور آج ہم اسی وجہ سے اتنے خوشحال ہیں اور ہاں! جب اچھے دن آئے تو ابا نے ماموں کو بھی معاف کر دیا بلکہ انہیں اپنے کاروبار میں لگایا اور میری شادی بھی اپنی ماموں زاد سے ہی ہو گئی ہے اور پھر اس کے بعد اماں ہماری مرتے مر گئیں مگر اُن کے دل سے یہ ملال نہ گیا کہ ''میں نے آج تک کسی کا احسان نہیں لیا' کاش' وہ عورت مجھے مل جائے تو میں اُس کا احسان اتار سکوں۔''

وہ اکثر کہتیں۔ ''ارے' وہ غریب سی عورت کتنے بڑے دل کی مالک تھی؟ چاہتی تو تمام جواہرات لے جا کر امیر کبیر ہو جاتی اور پھر اس نے کوئی چوری تو نہیں کی تھی' جواہر میں نے خود اُسے دیئے تھے۔ یہ اُسی کی ملکیت ہوتے مگر وہ تو ذرا بھی لالچی نہ تھی۔ کاش' وہ مجھے مل جائے تو میں اُس کے ہاتھ چوم لوں۔ اُس کا احسان اتار سکوں۔ میرے مالک! مجھے ایک موقع دے کہ میں اُس عظیم عورت کی کچھ خدمت کر سکوں۔ کچھ تو اُس کے احسان کا بدلہ دے سکوں۔'' اُن کی ہمیشہ یہ دُعا رہی تھی۔

یہ سب کہانی سنا کر وہ خاموش ہو گئے تھے۔

''پھر کیا ہوا؟'' جب وہ کافی دیر تک خاموش رہے تو میں نے جو بڑی محویت سے یہ داستان سن رہا تھا' چونک کر پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں کو وہ عورت ملی؟''

''نہیں بھی ملی اور ہاں بھی۔'' یہ بڑا عجیب سا جواب تھا۔

''نہیں بھی اور ہاں بھی کا کیا مطلب ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ ''یا تو آپ کا جواب نہیں میں ہونا چاہیے تھا یا پھر ہاں! یہ دونوں باتوں کا ہونا تو بالکل قصہ چہار درویش کی طرح ہے جس میں پہلے درویش رویا اور پھر ہنسا۔''

''آپ اسے قصہ چہار درویش ہی سمجھ لیں۔'' وہ بولے۔ ''یہ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ قصہ چہار درویش کا کوئی قصہ لگتا ہے اسی لیے تو میں اسے لوگوں کو نہیں سناتا کہ اس پر لوگ مشکل سے یقین کرتے ہیں جیسے ہمارے ماموں کو بھی آخری وقت تک اس بات پر یقین نہیں آیا تھا اور وہ اسے ہم لوگوں کا ایک ڈرامہ کہتے تھے۔''

''چلیں' آپ آگے تو سنائیں کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس کہانی کا انجام جاننے میں بہت ہی زیادہ دلچسپی ہے۔''

''ہوا یوں تھا کہ اُن خاتون سے ملنا' اماں کے ساتھ ساتھ ہماری بھی خواہش بن گئی تھی کیونکہ یہ عیش و آرام' یہ کاروبار' نوکر چاکر سب کچھ ہمیں اُس عظیم خاتون سے ہی میسر ہوا تھا' سو ہم خود اُن سے ملنا چاہتے تھے۔ یہاں میں 'ہم' کا صیغہ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ پاکستان آتے وقت تو میں اکلوتا ہی

ماں باپ کے ہمراہ تھا مگر پاکستان آ کر میرے دو بھائی اور دو بہنیں اور پیدا ہوئے جو ماشاء اللہ حیات ہیں اور اپنا اپنا کاروبار کررہے ہیں جبکہ بہنیں اپنے اپنے گھر کی ہوچکی ہیں۔ بڑا ہونے کے ناتے مجھے چونکہ دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت اماں سے زیادہ محبت تھی اس لیے میں اُن کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔"

"تھی؟" میں نے چونک کر کہا۔

"آپ کو یاد نہیں' آپ کی اور میری پہلی ملاقات قبرستان میں اماں کی قبر کی طرف جاتے ہوئے تو ہوئی تھی؟" وہ بولے۔

"جی......! معاف کیجیے گا۔" میں نے کہا۔ "اصل میں کہانی کی روانی میں کھو کر میں یہ بات بھول گیا تھا۔"

"نہیں' اِس میں میری بھی غلطی ہے کہ میں نے کہانی کا تسلسل برقرار نہیں رکھا۔" وہ بولے۔ "تو میں بتا رہا تھا کہ ہماری اماں کی شدید خواہش کے باوجود کیونکہ خدا کو یہ منظور نہ تھا لہٰذا وہ حسرت دل میں لیے ہی اس دنیا سے چلی گئیں۔ صدمہ تو ظاہر ہے' سب کو ہی ہوا اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کا ہی دکھ بہت بڑا ہے مگر رفتہ رفتہ صبر آ ہی جاتا ہے تو شروع میں تو سب بھائی اور والد صاحب روزانہ ہی اماں کی قبر پر آ کر فاتحہ پڑھا کرتے تھے پھر آہستہ آہستہ غمِ دوراں نے اُن کو جکڑ لیا تو اُن کا آنا جانا کم ہوگیا لیکن میرا صدمہ کم نہیں ہوتا لہٰذا میں تقریباً روز ہی قبرستان آ جاتا ہوں۔ قصہ مختصر یہ کہ اماں کے انتقال کو تقریباً چھ ماہ سے زائد کا عرصہ ہوگیا تھا۔ اُس دن میں قبرستان پہنچا تو میں نے دیکھا کہ گورکن نے اماں کے پہلو میں خالی جگہ پر قبر کھود دی ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہوا کیونکہ والد صاحب نے مجھ سے اِس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اس جگہ کو اپنے لیے مخصوص کرانا چاہتے ہیں اور میں یہ کام کروانے کا سوچتا ہی رہا تھا اور وہاں قبر بھی بن گئی تھی۔ میں گورکن کی تلاش میں نکلا مگر وہ ملا نہیں تھا۔ گورکن کے کسی عزیز کا انتقال ہوگیا تھا لہٰذا وہ لوگ وہاں گئے ہوئے تھے اور اُن کے کمرے پر تالا پڑا ہوا تھا۔

"چلو' اس سے کل بات کرلیں گے۔" میں نے سوچا تھا مگر اُسی رات میری طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی تھی اور میں کئی روز تک قبرستان بھی نہ جاسکا تھا۔ تقریباً ایک ہفتے کے بعد جب میں اماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے پہنچا تو معلوم ہوا کہ اُس پڑوس والی قبر میں تدفین بھی ہوچکی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ جس مٹی نے جہاں آنا تھا' وہ آ چکی تھی۔

اگلے دن جب میں قبرستان پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اُس قبر کے سرہانے ایک صاحب کھڑے نہ صرف زاروقطار رو رہے ہیں بلکہ کچھ بڑبڑا بھی رہے ہیں۔ وہ اُس کیفیت میں ایسے مگن تھے کہ انہیں میرے آنے کا بھی احساس نہ ہوا تھا۔ میں نے نزدیک ہوکر سنا تھا' وہ کہہ رہے تھے۔

"امی! آپ مجھ پر بہت بڑی ذمے داری ڈال گئی ہیں۔ جن کا آپ کے پاس کوئی پتہ نہیں تھا' میں انہیں کہاں سے ڈھونڈوں گا؟"

میں اُس وقت ہلکا سا کھانسا تھا تو وہ صاحب میری موجودگی کا احساس کرکے خاموش ہوگئے تھے۔

"مسعود صاحب! آپ کو تو اس بات کا تجربہ ہو ہی چکا ہے کہ میں فوراً ہی بے تکلف ہوجاتا ہوں۔" بندیال صاحب بولے تھے۔ "سو میں نے اُن صاحب سے بھی بہت بے تکلفی کے ساتھ پوچھا تھا۔

"یہ آپ کی والدہ کی قبر ہے؟"

"جی!" اُن صاحب نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

"میں بھی اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا ہوں۔" میں نے انہیں بتایا تھا۔ "ویسے ماں سے محبت تو ہر شخص کو ہوتی ہے مگر ابھی آپ شاید ماں سے شکوہ کررہے تھے؟"

"شکوہ......!" اُن صاحب نے جیسے تڑپ کر کہا تھا۔ "میں شکوہ ہرگز نہیں کررہا تھا بلکہ یہ کہہ رہا تھا کہ جو ذمے داری وہ مجھ پر ڈال گئی ہیں' مجھے اُس کے پورا ہونے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔"

"دنیا میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ ہو۔" میں نے اُن صاحب کو تسلی دی تھی۔ "آدمی' آدمی کے کام آتا ہے اس لیے اگر آپ مجھے اپنا مسئلہ بتانا پسند کریں تو ہوسکتا ہے کہ میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں۔"

"چلیے' آپ اس خلوص اور یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں تو میں بتا دیتا ہوں ورنہ یہ قصہ تو میں لوگوں کو سُنا سُنا کر تھک گیا ہوں مگر آج تک میرا مسئلہ حل نہ ہوا۔"

"ہوگا' ضرور ہوگا۔" میں نے بے ساختہ کہا تھا۔ "آپ کی تڑپ دیکھ کر مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ خدا آپ کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل ضرور نکالے گا۔ آپ ہمت نہ ہاریے گا۔" میں نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت محبت اور خُلوص سے تسلی دی تھی۔

"یہ تقسیمِ ہند کے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے' میری امی اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان آرہی تھیں۔" وہ صاحب کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے تھے۔ "واہگہ بارڈر پر کسٹم کرانے کے پہلے کسٹم ہاؤس میں انہیں ایک امیر خاتون ملیں جو اپنے ذہنی مریض شوہر اور بچے کی وجہ سے پریشان تھیں اور انہوں نے کسٹم والوں کی تلاشی سے خوف زدہ ہوکر اپنا جواہرات سے بھرا صندوقچہ میری امی کے حوالے کردیا تھا۔"

"اور پھر بھی آپ کی ماں کا ایمان نہ ڈگمگایا۔ انہوں نے جواہرات صندوقچے سے نکال کر اُن بیگم صاحبہ کے بچے کی شیروانی کی جیبوں میں ڈال دیئے تھے جسے وہ کسٹم کے دوران گود میں اٹھائے ہوئے تھیں۔" میں نے بہت رَسان سے کہا تھا۔

"آپ...... آپ کو یہ کیسے معلوم؟" پہلے تو وہ صاحب شدید حیران ہوئے اور پھر جیسے خوشی سے بے قابو ہوگئے تھے۔

"میں وہی بچہ ہوں۔"

"امی......! امی......!" وہ صاحب قبر سے جا لپٹے اور زاروقطار رونے لگے۔ "میں سرخرو ہوگیا۔ امی......! وہ لوگ مجھے مل گئے ہیں۔"

"آپ ہم سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" میں نے انہیں قبر سے اٹھایا اور اُن کے آنسو پونچھ کر انہیں چپ کراتے ہوئے پوچھا تھا۔ "حالانکہ آپ کی والدہ سے ملنے کی سب سے بڑی خواہش تو میری والدہ بلکہ ہم سب کی تھی کہ ہم اُن عظیم خاتون کا دیدار کرسکیں' اُن کی کچھ خدمت کرکے اُن کا احسان کم کرسکیں کیونکہ اُن کے احسان کا تو کوئی بدل ہی نہیں ہے اور دیکھو' خدا نے انہیں ہم سے کب اور کہاں ملایا ہے!"

"میں...... میں دراصل آپ لوگوں کی ایک امانت واپس کرنا چاہتا تھا۔" وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولے تھے۔ مجھے لگا تھا جیسے وہ کچھ شرمندہ بھی تھے۔

"کیا......!" میں نے سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "ایسی کون سی ہماری امانت آپ کے پاس ہے جو ہمیں نہیں معلوم!"

"وہ...... وہ......" وہ پھر بولتے وقت ہچکچانے لگے تھے اور آخرکار ہمت جمع کرکے بولے تھے۔ "بات دراصل یہ ہے کہ جواہرات آپ کی جیب میں ڈالتے وقت میری امی کے دل میں لالچ آ گیا تھا اور انہوں نے اُس میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا اپنے پاس رکھ لی تھی لیکن یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ اس ڈبیا میں نمبروں والا تالا لگا ہوا تھا' ویسے تو وہ تالا توڑنا آسان تھا مگر وقت گزر جانے کے بعد امی اپنے لالچ

پر بہت شرمندہ ہوئیں اور انہوں نے اُس ڈبیا کو حفاظت سے رکھ لیا اور پھر انہوں نے اپنی زندگی میں آپ لوگوں کی امانت واپس کرنے کے لیے آپ لوگوں کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی، پر وہ ناکام رہیں۔ مرنے سے پہلے انہوں نے یہ امانت اس وصیت کے ساتھ میرے سپرد کی تھی کہ اگر میں اپنی زندگی میں آپ لوگوں کو نہ تلاش کرسکوں تو پھر اس کی ذمے داری اپنے دوسرے بھائی بند پر ڈال دوں۔"

"آپ کی والدہ واقعی ایک عظیم خاتون تھیں اور مجھے یقین ہے کہ اُن کی اولاد بھی ایسی ہی ہوگی۔" میں نے یہ بات اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ کہی تھی۔

ہمارے گھر آ کر وہ امانت، ڈبیا ابا کو پیش کرتے ہوئے اُن صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"اس ڈبیا میں میری یادیں بند ہیں۔" ابا نے اُس ڈبیا کو بہت محبت سے چوم کر کہا تھا۔ "میاں......! تمہارا نام کیا ہے؟"

"جی، میرا نام فاروق ہے۔" اُن صاحب نے نظریں جھکائے ابا کو جواب دیا تھا۔

"تو فاروق میاں! یہ ڈبیا میں تم سے دس لاکھ میں خریدتا ہوں، تم کو منظور ہے؟"

"مگر یہ تو آپ کی امانت ہے جو میں واپس کرنے آیا ہوں؟" فاروق صاحب بہت حیرانی سے بولے تھے۔

"کیسی امانت؟" والد صاحب بولے تھے۔ "کیا یہ کھوگئی تھی یا کسی نے چھین لی تھی۔ ارے بھائی! میری بیوی نے یہ تمہاری والدہ کو دے دی تو تمہاری ہوگئی بلکہ ہم سب بھی تمہارے ہوگئے۔ تمہاری والدہ اگر ہم پر احسان نہ کرتیں تو ہم کسی جگہ ملازمت کررہے ہوتے، یہ ٹھاٹھ باٹھ نہ ہوتے ہمارے۔"

"میں آپ سے بیوپار کرنے نہیں آیا ہوں۔ اپنی ماں کی خواہش پوری کرنے آیا ہوں۔ آپ ڈبیا رکھیں اور مجھے اجازت دیں۔" فاروق صاحب جانے کے لیے کھڑے ہوگئے تھے۔

"اچھے لوگوں کی اولاد بھی اچھی ہوتی ہے۔" والد صاحب جواباً بولے تھے۔ "مگر ہم کمینے اور احسان فراموش نہیں ہے۔ اب تم بھلا کہاں جاسکتے ہو میاں؟"

"مم......مگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں......" ابا بہت پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ بولے تھے۔ "آج سے ہم تمہارے اور تم ہمارے ہو۔"

فاروق بھائی اُن دنوں بڑی تنگی ترشی میں زندگی بسر کررہے تھے۔ ابا نے اُن کی بھرپور مالی اور معاشی مدد کی تھی اور اُن کو اِس قابل بنادیا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح خوشحال زندگی بسر کرسکیں۔

"بھائی......! اب یہ تو بتادیں، اُس ڈبیہ میں آخر تھا کیا؟" اُن کی داستان ختم ہونے کے بعد میں نے اپنا تجسس دور کرنے کو پوچھا تھا۔

"اُس میں......؟" وہ ہنسے تھے۔ "ہیرے کی وہ انگوٹھی تھی جو میرے والد صاحب نے میری والدہ کو منہ دکھائی میں دی تھی۔"

•......•......•

غفار بندیال کی داستان سن کر میں خود بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ جس طرح ہم بلاسبب اور بغیر کسی صلے کے اپنی والدہ کی پڑوسن کی قبر کا بھی خیال رکھ رہے ہیں تو یہ کہیں ہم کوئی بدلہ تو نہیں اتار رہے۔ اس کے پیچھے کوئی کہانی تو نہیں ہے۔ اب اگر وہ صاحب مل جائیں تو اُن سے ضرور پوچھوں گا۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے!!!







سلیم اختر

# انسانیت کا سفر

افتخار اجمل شاہین کا خیال

کہنے کو یوں تو لوگ ملیں گے بہت مگر
مشکل بہت ہے صاحب کردار دیکھنا

**ایسے صاحب کردار شخص کا ماجرا انسانیت جن پر فخر کرتی ہے**





راولپنڈی شہر کے محلہ ارجن نگر کی گلی نمبر دس میں تین بہن بھائیوں کے تین گھر ایک ہی لائن میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک گھر بڑے بھائی امجد علی کا' دوسرا چھوٹا بھائی ظہیر احمد اور تیسرا بہن انیسہ رحمان کا ہے۔ ان تینوں گھرانوں میں بہت زیادہ اتفاق اور محبت ہے۔ لوگ اُن کے اتفاق اور اعلیٰ اخلاق کی مثالیں دیتے ہیں۔ ان تینوں گھرانوں کا محلے والوں کے ساتھ بھی نہایت ہی اچھا سلوک اور یگانگت رہی ہے۔ یہ محلے والوں کے ہر دکھ سکھ میں بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ان تینوں خاندانوں کی اولادیں جوان ہوگئیں تو انہوں نے آپس میں ہی رشتے طے کر کے اپنے بچوں کی شادیاں کر دیں۔

امجد علی صاحب کی بہن انیسہ رحمان پانچ سال قبل فوت ہوگئی تھیں جبکہ گزشتہ ماہ اُن کے چھوٹے بھائی ظہیر احمد کا بھی انتقال ہوگیا اور اب وہ خود بھی بیمار رہتے ہیں' ویسے ان کی عمر بھی اتنی زیادہ ہے کہ نجانے کب موت کا بلاوا آ جائے۔ امجد صاحب کے بھائی ظہیر احمد کی وفات پر میں تعزیت کے لیے اُن کے پاس گیا تھا تو گفتگو کے دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ ظہیر احمد اور انیسہ رحمان' امجد علی صاحب کے سگے بہن بھائی نہیں تھے بلکہ اُن کی تو آپس میں دور کی رشتے داری بھی نہیں تھی۔ ہاں! ظہیر احمد اور انیسہ بیگم آپس میں سگے بہن بھائی ضرور تھے۔

یہ حقیقت جان کر مجھے حیرت ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ تجسس بھی بہت ہوا تھا اور میں اپنے اسی تجسس کو دور کرنے کے لیے ایک روز امجد علی صاحب کے پاس چلا گیا تھا۔ میرے پوچھنے اور اصرار پر انہوں نے یہ حقیقت تسلیم کی تھی کہ وہ ظہیر احمد اور انیسہ بیگم کے سگے بھائی نہیں تھے اور پھر انہوں نے میرے تجسس کو دور کرنے کے لیے اپنے ماضی کو میرے سامنے یوں عیاں کیا تھا۔

٭......٭......٭

تقسیم ہند و پاک سے قبل میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی میں رہتا تھا۔ جب تقسیم کا اعلان ہوا تو ہمارے خاندان نے بھی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا مگر یہ فیصلہ ہمیں بہت ہی مہنگا پڑا۔ پورے خاندان میں سے صرف میں ہی زندہ سلامت پاکستان پہنچا' یوں میں خود لاہور تو پہنچ گیا مگر پھر بھی مجھے انتظار تھا کہ میرے گھر والے کسی نہ کسی قافلے کے ساتھ پاکستان آ جائیں گے۔ میں اپنا سارا دن اور رات اسٹیشن پر ہی گزارنے لگا تھا۔ آنسوؤں اور انسانی خون کے چھینٹوں سے داغدار ریل کے ڈبے تھکے ہوئے مسافروں کی طرح پلیٹ فارم میں داخل ہوتے تو لوگوں میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا تھا۔ میں دیگر لوگوں کے ساتھ مسافروں کی طرف لپکتا۔ ہم کوئی خوش باش اور ہنستے بولتے لوگ نہ تھے جو اپنے پیاروں اور بچھڑے ہوؤں سے ملنے خوشی خوشی دوڑتے ہیں بلکہ رو رو کر سوجی ہوئی سرخ آنکھوں اور اترے ہوئے چہروں والے لوگ تھے۔

اُس روز بھی گاڑی اتنی آہستہ آہستہ آئی تھی کہ بغیر جھٹکے کے ہی ٹھہر گئی تھی۔ مسافروں کا سیلاب سا اُمڈ پڑا تھا۔ جو زخمی نہ تھے' ان کو دیکھ کر بھی دل دہل جاتا تھا۔ خون سے چپکے ہوئے کپڑے' خشک ہونٹ' آنکھیں پھٹی پھٹی' دہشت ناک اور ویران صورتیں' اجڑی ہوئی پریشان و حیران۔ جو لوگ اپنے سہارے اتر سکتے تھے' وہ بمشکل اترے اور پھر زخمیوں کی باری آئی تھی۔ طالب علم اور مختلف جماعتوں کے رضا کار اُن زخمیوں کو احتیاط سے اتارنے لگے تھے۔ ہر طرف رونے چیخنے اور آہیں بھرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو اگرچہ زخمی نہ تھے لیکن نا معلوم کتنی دیر سے کتنے وزن کے نیچے اس طرح دب گئے تھے کہ ان کے گھٹنے جڑ گئے تھے اور وہ کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تھے۔ خون میں لت پت لاشوں کو پلٹ پلٹ کر دیکھا جا رہا تھا کہ کہیں کوئی سسکتا ہوا نیم جان تو ان میں دبا ہوا نہیں ہے جس لاش کو اس کے عزیز پہچانتے' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے تھے۔ سینکڑوں گھر بے چراغ ہوئے تھے اور ہزاروں مانگیں اجڑ گئی تھیں۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گاڑی آنے سے قبل امید کے سہارے بچھڑے ہوئے عزیزوں' پیاروں کا انتظار کر رہے تھے اور اس موت کے میلے کو دیکھنے کے بعد انہیں معلوم ہوا تھا کہ اب اُن کا کوئی نام لیوا نہیں رہا ہے۔

دو رضا کار جوان خون میں لتھڑی ایک ایسی نابینا بڑھیا کو اٹھانے میں مصروف تھے۔ تین دن سے بیٹھے بیٹھے اور بوجھ میں دبے ہوئے جس کی ٹانگیں جڑ گئی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پوچھ رہی تھی۔

''کیا پاکستان آ گیا؟''

''ہاں اماں......! آ گیا۔'' ایک رضا کار بولا تھا۔

بڑھیا کی آواز میں فوراً ہی جوش پیدا ہوا تھا۔

''اری منی......! اٹھ جا' دیکھ پاکستان آ گیا' اب تو خوب جی بھر کے پانی پی لیجیو راستے بھر پانی پانی پکارتی آئی تھی ناں؟ یہاں کسی بات کا ڈر نہیں' ارے منی میٹی......! تو بولتی کیوں نہیں؟''

آنکھیں بڑی نعمت ہیں اور ان سے محرومی سب سے بڑی بدقسمتی ہے لیکن اُس وقت وہ ضعیفہ مجھے خوش قسمت معلوم ہو رہی تھی جو پاس پڑی ہوئی اپنی جوان بچی کی لاش کو نہ دیکھ سکی تھی۔

اسٹیشن پر ایک ہنگامہ برپا تھا' پانی اور کھانے کا وافر انتظام کیا گیا تھا مگر بہت سے بھوکے پیاسے لوگ پانی اور کھانے پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اُن میں کچھ ایسے بدنصیب بھی تھے جنہیں رضا کار خوشامدیں کر کے کھلا رہے تھے۔ وہ نابینا بڑھیا اب بھی اپنی بیٹی کو پکار رہی تھی اور آنکھوں والوں کے حلق سے نوالے خون میں ڈوب ڈوب کر اتر رہے تھے۔ یہ اُن بے گناہ شہیدوں کی حاضری تھی جو صرف مسلمان ہونے کے جرم میں برچھیوں اور بھالوں کی بھینٹ چڑھے...... کئی دن کی تڑپا دینے والی پیاس اور بھوک سے نڈھال لوگوں نے جب پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور سیر ہو کر پانی بھی پی لیا تو وہیں لیٹ گئے جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ لاشوں اور زخمیوں کو اسپتالوں اور مردہ خانوں میں بھیجنے کا کام خاصا دشوار اور طویل تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد نیم جان زندوں کو امدادی کیمپوں میں بھیجنے کا کام شروع ہوا۔ جن لوگوں کے عزیز رشتے داروں کے ہاں قیام کے ٹھکانے تھے' وہ رفتہ رفتہ جا چکے تھے۔ اب پلیٹ فارم پر صرف وہ لوگ رہ گئے تھے جن کا نہ کوئی سہارا تھا اور نہ ہی ٹھہرنے کا ٹھکانہ! اور پھر بہت سی موٹریں' بسیں اور ٹرک آ گئے اور روتے' آہیں بھرتے لاوارث لوگ اُن میں بیٹھنے لگے۔ ان لوگوں کے دلوں اور چہروں کے طور بدل گئے تھے جن کے دل میں کٹی ہوئی انگلی کو دیکھنے کی سکت نہ تھی' انہوں نے لوگوں کو ذبح ہوتے اور خون کے فوارے ابلتے دیکھے تھے' خونریزی کے مناظر نے ان لوگوں کے چہرے بہت وحشت ناک بنا دیئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے بسی کے عالم میں چاروں طرف نظریں دوڑاتے تھے۔ رضا کار مرد و خواتین بڑے صبر اور ضبط' خلوص اور دم دلاسے سے انہیں اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔

اسٹیشن کے باہر ایک طرف ٹوٹے پھوٹے

سامان، لکڑی کے خالی بکسوں اور ٹوکروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں اِس ڈھیر کے پاس بے تکلفی اور بے نیازی سے کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا کیونکہ نہ تو میرا وہاں کوئی واقف کار تھا اور نہ ہی کوئی عزیز! میں نے کاٹھ کباڑ کی طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی تھی تو دیکھا تھا کہ ایک نوعمر لڑکی ننگے پاؤں، ننگے سر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے لکڑی کے بکسوں کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ میں اُس کے قریب چلا گیا تھا اور ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو؟ کیا تم کیمپ میں نہیں جاؤ گی؟''

وہ لڑکی بڑی بے بسی سے بولی تھی۔ ''ابا کو دہلی میں قتل کردیا گیا تھا، اماں اور آپا کو راستے میں سکھوں نے برچھیوں سے شہید کردیا، نہ معلوم میں کیسے بچ گئی! میں تو زخمی بھی نہیں ہوئی، اب یہاں آ کر میں نے لاشیں اور زخمی تو جاتے ہوئے دیکھ لیے ہیں اور اَب باقی جانے والوں کو دیکھ رہی ہوں کہ شاید بھائی جان نظر آ جائیں، وہ بھی ہمارے ساتھ ہی چلے تھے مگر راستے میں سکھوں کے حملے کے دوران میں کہیں غائب ہوگئے۔ اَب کیونکہ پلیٹ فارم پر سوائے چند عورتوں اور بچوں کے اور کوئی باقی نہیں رہا، اسی وجہ سے میں بھی باہر آ گئی کہ میرے بھائی جان بھی نہ بچے ہوں گے۔ خبر نہیں، راستے میں اُن کی لاش کہاں پڑی ہوگی!'' اُس نے خشک آنکھوں سے یہ بات ایسے کہی تھی جیسے اَب اُس کے لیے موت کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی ہو۔

دکھ اور درد کی کیفیت سے میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ میرا بھی اس دنیا میں کوئی نہ رہا تھا۔ میرے دل میں اُس لڑکی کے لیے ہمدردی کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''میرا بھی اس دنیا میں کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلو! آج سے میں تمہارا بھائی جان ہوں!!'' میری یہ بات سن کر وہ لڑکی ہچکچائی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پا رہی تھی۔ میں نے اُسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''میری بہن......! میں تمہارا بھائی ہوں۔ تم یہاں کب تک پڑی رہو گی؟''

''مگر بھائی جان! میرے سر پر تو دوپٹہ بھی نہیں ہے۔'' وہ بھیگی آواز میں بولی تھی۔

یہ سن کر میں تیزی سے پلٹ کر پلیٹ فارم پر گیا تھا تو وہاں ایک چادر ہاتھ لگی تھی، اس چادر پر لگا بڑا سا خون کا داغ سوکھ کر اکڑ گیا تھا۔ میں نے چادر کا خون آلود حصہ پھاڑ کر پھینک دیا تھا اور باقی چادر لڑکی کے حوالے کی تھی۔ ''لو یہ اوڑھ لو، تمہارا نام کیا ہے؟''

''انیسہ......! اور آپ کا؟''

''امجد...... امجد علی! آؤ انیسہ! میرے ساتھ کیمپ چلو۔ میں وہاں لکھوا دوں گا کہ میری بہن بھی ساتھ ہے اور امدادی کیمپ میں قیام کے دوران میں تم سے ملتا رہوں گا۔''

انیسہ کو ننگے پیر چلنے کی عادت کہاں تھی؟ اس کے پیروں میں ہر چیز چبھ رہی تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اُس کے تمام کپڑے، آدھا سر اور چوٹی خون میں لتھڑی ہوئی تھی اور بال سوکھ کر کانٹے بن گئے تھے۔ اُس کے کپڑوں سے بو آ رہی تھی اور وہ اس بدبو اور بساندھ سے سخت الجھن میں لگ رہی تھی۔

•......•......•......•

کچھ عرصے امدادی کیمپوں میں رہنے کے بعد جب ہم تباہ حالوں کے اوسان کچھ درست ہوئے تھے تو ہم سب کو نئے سرے سے زندگی بنانے کی فکر ہوئی تھی۔ اپنے اپنے پیشوں اور کاروبار کے لحاظ سے مناسب جگہ کی تلاش میں لوگ چھوٹی بڑی ٹولیوں میں مختلف مقامات کی طرف رواں دواں ہوگئے تھے۔ یہاں آ کر یہ تفریق ختم ہوگئی تھی کہ کون کہاں کا ہے؟ ایک بڑے گھر کی طرح بہت سے کنبے مل جل کر رہنے لگے تھے۔ مخیّر لوگوں نے بھی دشمنوں کی درندگی کے شکار ہونے والے اپنے مہاجر بھائیوں کی ہر طرح مدد کی تھی۔ مہاجر زمینداروں نے زمینیں سنبھال لی تھیں اور اپنے خون پسینے سے سینچ کر مٹی میں سونا اگانے لگے تھے۔ انہیں جب اپنے پرانے گھر اور ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والے عزیز یاد آتے تو اُن کے دُکھی دلوں اور جلتی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کے چند مقدس قطرے اِس پاک زمین میں جذب ہوجاتے، اُن کے ہاتھوں کی گرفت ہل کے ہتھے پر اور زیادہ مضبوط ہوجاتی، دانتوں کی بتیسی اور زیادہ زور سے بند ہوجاتی اور افق کے پار خود بخود اُن کی نگاہیں اٹھ جاتیں اور ایک نیا عزم دل میں جنم لیتا تھا۔ اَب کوئی پوچھے کہ بھرے پرے، گونجتے، گنگناتے کنبوں سے محروم ہوکر اِن لٹے پٹے دنیا میں اکیلے رہ جانے والوں کے کیا عزائم؟ جن کے جوان بیٹے کٹ مرے، جن کے سہرے دیکھنے کی تمنا تھی، ان کی لاشیں دیکھیں، جن بیٹیوں کی باراتیں تصور میں بجتی تھیں اور شہنائیاں کانوں میں گونجتی تھیں، جنگل کے اندھیروں میں اُن کی چیخیں گونجیں! دشمن کے خیال میں ایسے کمر ٹوٹے اور دل اجڑے لوگ بھلا نئی دنیا کیا بساتے؟ مگر مسلمان قوم کی ہمت و استقلال کو کون بھول سکتا ہے؟ مسلمان نے ہمیشہ تیغوں کے سائے میں اسلام کی حفاظت کی اور وطن کی آبرو پر جان دی۔ قصہ مختصر تاجروں نے کاروباری بساط بچھائی، مزدوروں کا پسینہ چوٹی سے لے کر ایڑی تک آنے لگا، کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگلنے لگیں اور مشینوں کی دھمک سے زمین لرزنے لگی، نئی عمارتیں ابھرنے لگیں، زندگی کی ہماہمی سے پاکستان گونجنے لگا، ویرانوں میں اذانوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں، مسلمان جہاں اور جس حال میں بھی گیا، اپنا ایمان ساتھ لے کر گیا، تکلیفوں اور پریشانیوں سے اُس کا جذبۂ ایمانی اور مستحکم ہو جاتا ہے۔

•......•......•......•

جب امدادی کیمپوں سے مہاجر نئی منزلوں کی طرف رختِ سفر باندھنے لگے تھے تو ہمیں بھی زندگی گزارنے کے لیے منصوبہ بنانے کا خیال آیا تھا۔ کیمپ میں ہماری ملاقات ایک معمر اور نیک میاں بیوی سے ہوگئی تھی۔ وہ لاولد تھے مگر سب کو اپنی اولاد سمجھتے تھے۔ دونوں میاں بیوی اس قدر شیریں کلام اور ہمدرد طبیعت کے تھے کہ اُن کی باتوں سے ہی لوگوں کے غم چھٹ جاتے تھے۔ اگر انیسہ کبھی روتی تو بوڑھی اماں نفیسہ بڑی شفقت سے کہتیں۔

''ارے، تم تو بڑی نصیبے والی ہو کہ تمہارا بھائی بچ گیا۔'' اور پھر وہ کیمپ کے لوگوں کی مثالیں دیتیں کہ ''انہیں بھی دیکھو جن کا اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں رہا۔'' اور انیسہ یہ سن کر آنسو پونچھ لیتی۔

اماں نفیسہ کے میاں حکیم صاحب کہلاتے تھے۔ جب اُن کا سامانِ سفر جو کپڑوں کی ایک گٹھڑی، ایک لوٹے، ایک گلاس اور دو تام چینی کی طشتریوں پر مشتمل تھا، ایک پوٹلی میں بندھ گیا تو ہم بھی اُن کے ہمراہ طویل مسافت طے کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئے اور پھر کراچی پہنچ کر لوگوں نے ہر غیر آباد جگہ کو آباد کر ڈالا تھا۔

شہر سے باہر ایک ستھرے سے میدان میں حکیم صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے ایک جگہ منتخب

گی۔ زمین کے ایک مختصر سے قطعے پر حکیم صاحب اور میں نے مل کر رہنے کا فیصلہ کیا کیونکہ مجھے حکیم صاحب اور اُن کی بیوی کی ہر وقت ضرورت تھی کہ جوان بہن کو میں کہیں بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اُس وقت میری جیب میں صرف پچاس روپے تھے اور انیسہ کی انگلی میں صرف ایک سونے کی انگوٹھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بانسوں کے ٹھاڑ کھڑے ہوگئے اور ٹاٹ کے پردے پڑی چٹائیوں کی ایک بستی آباد ہوگئی۔ وہیں راشن کی دکان' گوشت' ترکاری' تیل' ایندھن غرض کہ ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز موجود اور میسر ہوگئی۔ انسانوں کے ساتھ زندگی کی رونق دس قدم آگے چلتی ہے' سو نہ بچوں کے ختنے اور عقیقے رکے نہ منگنی بیاہ۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ڈھولک کی تھاپ پر سہرے سہاگ اور زچہ گیریاں سنائی دینے لگی تھیں۔

ہمارے گھر کا ایک ہی ٹھاڑ تھا' چٹائیاں بھی مشترک تھیں' بس بیچ میں ایک چٹائی کی آڑ سے ایک گھر کے دو حصے ہو گئے تھے۔ اس بیچ کی چٹائی کے دونوں طرف دونوں گھروں کے باورچی خانے تھے۔ بیچ والی چٹائی میں ایک اتنا بڑا موکھا رکھا گیا تھا کہ گھر کے کام اور کھانا پکاتے وقت منہ بولی خالہ اور بھانجی آپس میں باتیں کرتی جاتیں اور وہاں سے ایک دوسرے کے لیے کھانے کے برتن گزارے جا سکتے تھے۔

میں صبح سے شام تک ملازمت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا مگر کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہ ملتی تھی پھر بھی میں چھوٹا موٹا کام کر کے گزارے کے لیے کچھ نہ کچھ کما لاتا تھا اور پھر حکیم صاحب نے مجھے ایک جگہ ساٹھ روپے ماہوار کی نوکری دلا دی تھی۔ بے روزگاری کے عالم میں ساٹھ روپے کیا' ساٹھ پیسے بھی غنیمت معلوم ہوتے تھے۔ میں ایف اے پاس تھا اس لیے امید تھی کہ جلد ہی کہیں نہ کہیں اچھی ملازمت مل جائے گی۔ اس دوران میں' میں انیسہ کی طرف سے بالکل بے فکر تھا۔ میں گھر سے جاتے وقت ''خالہ......! خدا حافظ! میں جا رہا ہوں۔'' کہہ کے جاتا اور وہ بھی مجھے ڈھیروں دُعائیں دے کر رخصت کرتیں۔ انہوں نے ہم دونوں کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ شام کو واپسی پر اگر مجھے دیر ہو جاتی تو انیسہ اور خالہ دونوں ہی پریشان ہو جاتیں کہ میں ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا؟ خالہ' انیسہ کو اطمینان دلاتیں کہ ''آ جائے گا خیر سے۔ ان موئے کافروں نے ہمارے دل کمزور کر دیئے ہیں ورنہ یہاں اَب کس بات کا ڈر اور کھٹکا؟'' اور جب میں اُن کو واپس آتا دکھائی دیتا تو حکیم صاحب وہیں سے پوچھتے۔ ''بھئی' کہاں دیر لگا دی؟ تمہاری بہن فکر کے مارے آدھی ہوئی جاتی ہے۔''

زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔ اس دوران میں اگر کبھی انیسہ' ماں باپ یا بہن بھائی کو یاد کر کے رو پڑتی تو میں اُسے دلاسہ دیتا اور کہتا۔ ''کیا تم کو ہی ماں باپ کا زیادہ غم ہے؟ کیا میرا دل پتھر کا ہے؟ کیا میں آنسو نہیں بہا سکتا؟''

خالہ میری آواز سن کر موکھے کے پاس آ بیٹھتیں اور صبر کے موضوع پر ایک طویل تقریر کر ڈالتیں کہ مجبوری کا نام صبر ہے! انیسہ رو دھو کر چپ ہو جاتی اور اُس چھوٹے سے گھر کو سنوارنے میں لگ جاتی۔

انیسہ کپڑے بہت اچھے سیتی تھی اور وہ بھی بغیر مشین کے۔ حکیم صاحب نے قرض لے کر اُسے ایک مشین خرید دی۔ اَب اُسے اڑوس پڑوس سے ہی نہیں' دور دراز سے بھی سلائی کا کام اتنا ملنے لگا کہ عید کے کپڑے' رمضان شریف میں ہی آ جاتے تو بمشکل عید تک تیار ہوتے۔ یوں مشین کی قیمت اُس نے دو مہینے میں ہی ادا کر دی تھی۔ دوسری طرف خالہ نے ایک روپیہ مہینے پر بچوں کو قرآن مجید پڑھانا شروع کر دیا تھا اور حکیم صاحب نے دو چادروں کے سائبان کے نیچے دواؤں کی ایک الماری اور ایک تخت بچھا کر مطب شروع کر دیا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں اللہ نے ایسی شفا دی تھی کہ دوسری مہاجر بستیوں سے بھی لوگ اُن کے پاس علاج کو آنے لگے تھے اور اُن کا مطب خوب چل نکلا تھا اور اللہ کے کرم اور میری مسلسل کوششوں سے مجھے ایک جگہ تین سو روپے ماہوار کی ملازمت مل گئی تھی۔ اس سے گھر کی حالت بہتر ہونی شروع ہوگئی۔ پہلے فرش پختہ ہو گیا پھر گھر کی دیواریں چٹائیوں کے بجائے لکڑی کے تختوں کی بن گئیں۔ اوپر ٹین کی چادروں کی چھت بھی ڈل گئی اور گھر میں کچھ ڈھنگ کی چیزیں بھی آ گئیں۔ گویا کہ زندگی اَب بہت سہل ہو گئی تھی اور اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے بی اے کرنے کا فیصلہ کر کے شام کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ مجھے کالج میں داخلہ لیتے دیکھ کر انیسہ کا بھی جی چاہا کہ وہ بھی میٹرک کر لے کیونکہ نویں کے بعد اُسے دیس نکالا ملا تھا۔ میں نے اُسے بخوشی آگے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی جبکہ خالہ نے اپنے بزرگانہ خیالات کے مطابق کہا تھا۔

''میاں......! سب سے پہلے بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر کرو' جوان بہن کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گے؟'' اور پھر انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ حکیم صاحب کے بھانجے انہیں حیدر آباد لے جانا چاہتے ہیں کہ انہیں وہاں بہت عمدہ پختہ مکان اور اچھی ملازمت مل گئی ہے۔ ''اگر ہم حیدر آباد چلے گئے تو انیسہ یہاں گھر میں اکیلی کیسے رہے گی؟''

اس سوال نے تو میرا ذہن چکرا دیا تھا۔ حکیم صاحب اور خالہ جان کے جانے کے خیال سے میرا دل بیٹھ گیا تھا اور انیسہ کے لیے آنسو بھی ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔

''خالہ جان......! آپ لوگوں نے تو ماں باپ کی کمی پوری کر دی ہے' اب ہم آپ کے بغیر کیسے رہیں گے؟'' انیسہ نے روتے ہوئے خالہ جان سے سوال کیا تھا۔

انیسہ کا سوال سن کر خالہ جان اپنے مخصوص لہجے میں ایک مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھیں۔ ''اری باولی' میں کوئی ابھی تھوڑی جا رہی ہوں' تمہاری وجہ سے تو ہمیں بھی اولاد کا لطف آ گیا ہے۔ آج اگر میری کوئی سگی بیٹی بھی ہوتی تو یوں مجھے ہر ماہ نت نئے کپڑے سی سی کر نہ پہناتی اور سگا بیٹا بھی ہوتا تو امجد جیسی فرمانبرداری نہ کرتا۔ اللہ تم دونوں بہن بھائی کو سلامت رکھے اور تمہارا دامن خوشیوں سے بھر دے!''

خالہ کی باتیں اور نصیحتیں سن کر مجھے انیسہ کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ستانے لگی تھی' سو میں نے فوری طور پر انیسہ کا جہیز تیار کرنے کی ذمہ داری خالہ کے سپرد کر دی تھی۔ اَب میں پس انداز کی ہوئی تمام رقم خالہ کے حوالے کر دیتا۔ انیسہ سلائی کر کے جو کچھ کماتی اور میرے ہاتھ میں دیتی تو میں وہ بھی خالہ ہی کے ہاتھوں میں دیتا تھا اور پھر رفتہ رفتہ خالہ نے انیسہ کے جہیز کے کپڑے' برتن' یہاں تک کہ کچھ زیور بھی خرید لیے تھے۔ غرضیکہ جہیز کی تمام ضروری چیزیں ہم نے تیار کر لی تھیں' بس اب مسئلہ تھا انیسہ کے لیے رشتے کا۔ ایک دو رشتے آ بھی چکے تھے مگر خالہ نے اُن کو جواب دے دیا تھا۔

•......•......•......•

رحمان بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا تھا' وہ بھی خالی ہاتھ! اُس کا خاندان بھی آزادی کی نذر

ہوگیا تھا' سو دنیا میں اکیلا تھا۔ وہ نہایت ہی شریف' مخلص اور اعلیٰ کردار کا مالک تھا۔ رحمان بھی اُس جگہ کام کرتا تھا جہاں میری ملازمت تھی۔ میں نے جب اُسے ہر طریقے سے پرکھ لیا تو وہ مجھے انیسہ کے لیے سب سے بہتر انتخاب لگا تھا پھر میں نے رحمان کا ذکر خالہ جان سے کیا تھا اور اُس کے بارے میں انہیں تمام معلومات بھی دی تھیں۔ خالہ اور حکیم صاحب' رحمان سے ملنے اُس کی رہائش گاہ پر گئے تھے۔ اُس نے کرایہ کا مکان لے رکھا تھا۔ وہ واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ رحمان کی تعریف کر کر کے دونوں کا منہ خشک ہوگیا۔ ''بسم اللہ کرو بیٹا! رحمان بہت شریف بچہ ہے۔ محلے والے بھی اُس کی بہت تعریفیں کرتے ہیں۔ اُس کے پڑوس میں رہنے والے' اُس کے منہ بولے رشتے دار' انیسہ کو دیکھنے آئیں گے اور اس کے بعد ہی ہم ہاں کریں گے۔'' خالہ جان اور حکیم صاحب کی اِس محبت' شفقت اور خُلوص سے میں بہت ہی خوش اور مطمئن ہوگیا تھا۔

رحمان میرا دیکھا بھالا تھا اور میری بہن انیسہ پوری بستی میں اس قدر عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی کہ سب ہی اس کی مثالیں دیتے تھے اور خالہ کا تو یہ حال تھا کہ جہاں کسی لڑکی کو بے باکی سے سر کھولے یا اوندھا سیدھا سنگھار کیے دیکھا اور ٹوکا۔ ''تو اتنی بڑی ہوگئی ہے لیکن تجھے نہ سر کا ہوش ہے نہ تن کا۔ ایک ہماری انیسہ ہے کہ بھائی نے بھی اُس کے سر سے دوپٹہ کھسکا ہوا نہ دیکھا۔ اُس چاند سی شکل پر نہ کاجل اور نہ ہی سرخی اور ایک تم ہو کہ دیوانی کی گجریوں کی طرح لال پیلی ہوئی پھرتی ہو۔''

چند روز بعد رحمان کے پڑوسی ہمارے گھر آئے تھے۔ انہوں نے انیسہ کو دیکھا تھا تو اُسے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ کیا تھا۔ حکیم صاحب نہایت ہی سنجیدہ اور سلجھے ہوئے مزاج کے انسان تھے۔ انہوں نے اس رشتے میں باپ اور خالہ نے ماں کا کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔

انیسہ کا سادہ سا مگر بہت نفیس اور عمدہ جہیز تیار ہوا تھا اور جو تھوڑی بہت کمی رہ گئی تھی' وہ بھی جلدی جلدی پوری کر دی گئی تھی۔ شادی سے ہفتہ بھر پہلے محلے کی بچیوں نے ڈھولک پر گیت گانے شروع کر دیئے تھے اور رات کو گیارہ بجے تک گیس کی لالٹین جلا کر گانے بجانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس دوران میں پڑوس کے سب ہی لوگوں نے حکیم صاحب اور مجھ سے آ کر پوچھا تھا۔ ''ہمارے لائق کوئی کام ہو تو بتائیں!'' یہ سب پڑوسی جیسے ایک ہی کنبے کے افراد تھے۔

شادی کے بلاوے میں تمام محلے والے اور میرے ایک دو دوست شریک تھے اور پھر بارات کا دن آ گیا تھا۔ شامیانے لگائے گئے تھے' دریاں بچھی تھیں اور نہایت عمدہ کھانا پکا تھا۔ نکاح کے وقت رحمان کے پڑوسی اور دوست سب اُس کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے' سب ہی کو معلوم تھا کہ دلہن ایک مہاجر لڑکی ہے اور اِس پورے کنبے میں صرف دو بہن بھائی بچے تھے۔ سب لوگ میری تعریفیں کر رہے تھے کہ بھائی نے اپنی ذمے داری احسن طریقے سے نبھائی ہے۔

میں نے اور انیسہ نے یہ طے کر لیا تھا کہ نکاح نامے میں انیسہ کے والد کا ہی نام لکھا جائے گا۔ نکاح کے وقت جب قاضی جی نے دلہن اور اُس کے والد کا نام پوچھا تو میں نے ہی انیسہ اور اُس کے باپ کا نام بتایا تھا اور پھر ہوا یہ تھا کہ جوں ہی میں نے اُن دونوں کے نام بتائے تھے تو باراتیوں میں سے ایک نوجوان اچانک چیخنے والے انداز میں بولا تھا۔



''انیسہ تو میری بہن ہے۔ میں بلوائیوں کے حملے میں زخمی ہو کر اپنے گھر والوں سے بچھڑ گیا تھا۔ میرا نام ظہیر ہے۔ ابھی جا کر دلہن سے پوچھ لیں۔ ہم دونوں فضل کریم کی اولاد ہیں۔ دہلی کے علاقے پہاڑ گنج میں ہمارا مکان تھا۔''

ظہیر یہ کہہ کر اپنی بہن سے ملنے کے لیے بے تاب ہوگیا تھا۔ حکیم صاحب نے اُسے تسلی دی تھی اور اُس سے اِس معاملے میں مزید وضاحت چاہی تھی تو اُس نے بتایا تھا کہ انیسہ کے سیدھے پاؤں کی پشت پر ایک سرخ نشان ہے۔

حکیم صاحب نے ظہیر کی یہ وضاحت تسلیم کر لی تھی' دوسری طرف جب انیسہ تک یہ خبر پہنچی تھی تو وہ ظہیر کا نام سن کر بے قرار ہوگئی تھی لیکن اَب حکیم صاحب اور تمام حاضرین کے لیے بہت ہی زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ میں اور ظہیر دونوں ہی خود کو انیسہ کا بھائی بتا رہے تھے مگر ہم ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے!...... ''یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا معمہ ہے؟'' وہاں سب کے دل اور ذہن میں یہی سوچ اور سوال تھا۔

میں ظہیر کو لے کر انیسہ کے پاس گیا تھا۔ انیسہ' ظہیر کو دیکھتے ہی اُس سے لپٹ گئی تھی۔ دونوں بہن بھائی دیر تک روتے رہے تھے اور پھر ظہیر مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے بولا تھا۔

''امجد بھائی......! تم انسان نہیں' فرشتہ ہو۔ تم واقعی انیسہ کے سگے بھائی ہو۔ تم نے ایک بھائی ہونے کا جو حق ادا کیا ہے' اس کا اجر تمہیں پروردگار دے گا۔ یہ انیسہ کی شادی تو میرا فرض تھا جو آج تم نے ادا کیا ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کیسے اتاروں گا؟''

''نہیں ظہیر! ایسا مت کہو' میں نے کسی پر احسان نہیں کیا ہے۔'' میں نے بہت خُلوص' محبت اور

## محبت خوبصورت ہے!

سنو! محبت خوبصورت ہے
اُداس زندگی میں
یہ رنگ بھرتی ہے
اِک بے نام سی اُمنگ بھرتی ہے
کبھی کبھی یہ بے خیالی میں مسکراتی ہے
کسی کی بے رخی سے محبت ہو ہی جاتی ہے
کسی کے پیار کرنے سے یہ شرما جاتی ہے
محبت کے ہزار رنگ ہیں
اور ہر رنگ کی اپنی دلفریبی ہے
محبت جب بھی ہوتی ہے
زندگی مہک اُٹھتی ہے
اِک بار میں نے زندگی سے کہا
''میرا ہاتھ تھام لو''
تو زندگی بولی
''مجھے پانے کی ایک ہی صورت ہے''
سُنو! محبت خوب صورت ہے

نازایم ملک۔ کراچی

شفقت سے اُس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا اور پھر یہ خبر ہر طرف آگ کی طرح پھیل گئی تھی کہ میں انیسہ کا سگا بھائی نہیں ہوں مگر لوگوں کو یقین نہ آیا تھا۔ خالہ نے آگے بڑھ کر میری پیشانی چومی تھی اور دُعائیں دی تھیں۔ حکیم صاحب مجھے گلے سے لگاتے ہوئے بولے تھے۔

''میاں! تم نے تو انسانیت کے نام پر چار چاند لگا دیئے ہیں' تم بہت عظیم انسان ہو!!''

اُس وقت سب لوگ دولہا کو چھوڑ کر میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اُن میں سے کئی میرے ہاتھ چومنے اور آنکھوں سے لگانے لگے تھے۔ ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر مجھے گلے سے لگا لیا تھا اور بولے تھے۔ ''بیٹا! تم فرشتہ صفت ہو۔ تم سچے مسلمان ہوں۔ تم انیسہ کے ہی نہیں' اُس جیسی ہزاروں بہنوں کے بھائی ہو۔''

میں سچ کہہ رہا ہوں' مجھے اِن باتوں سے کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ میرا دل بار بار کہہ رہا تھا۔ 'کاش' ظہیر اِس وقت نہ ملتا تو یہ راز کبھی نہ کھلتا۔' میں نے اُن لوگوں سے کہا تھا۔ ''کیا انسان بننا اتنا دشوار ہے کہ آپ سب اس قدر حیران ہو رہے ہیں؟ ایک بے سہارا' معصوم بچی نے مجھے بھائی کہہ کر پکارا اور اُس نے میری اُس مرحوم بہن کی جگہ لے لی جس کی لاش میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی تو پھر میں اس کے کھوئے ہوئے بھائی کی کمی کیوں نہ پوری کرتا؟ آپ سب مجھے آج اپنی تعریف سے یہ احساس دلا کر تکلیف پہنچا رہے ہیں کہ انیسہ میری حقیقی بہن نہیں ہے ورنہ اس سے قبل مجھے کبھی اس بات کا خیال نہیں آیا تھا۔ ایک بھائی کی حیثیت سے میں نے جو کچھ کیا ہے' مجھے اس کے لیے کسی تعریف' صلے یا سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے' بس میرے لیے یہی بڑا صلہ ہے کہ آج مجھے بھائی بھی مل گیا ہے۔

اَب تک میں نے بڑے بھائی کا فرض ادا کیا تھا اور آج سے یہ فرض تقسیم ہو گیا ہے' اَب میں آدھا فرض ظہیر کو سونپتا ہوں' اَب وہی اِس گھر کا مالک ہے۔ اَب ہم اس طرح بہن بھائی بن کر رہیں گے جیسے ہم نے ایک ہی کوکھ سے جنم لیا ہے۔''

انیسہ اور رحمان شادی کے بعد بہت خوش تھے۔ ظہیر کو میں اپنے پاس لے آیا تھا۔ کچھ عرصے بعد خالہ جان اور حکیم صاحب کو اُن کا بھانجا حیدر آباد لے گیا تھا۔ اُسی روز ہم سب ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئے تھے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد رحمان کو پتہ چلا تھا کہ اُس کے کچھ رشتے دار راولپنڈی میں ہیں۔ رحمان اور انیسہ اُن کو ملنے گئے تو وہ بھی وہاں ہی کے ہو کر رہ گئے تھے اور پھر انہوں نے مجھے اور ظہیر کو بھی وہاں ہی بلا لیا تھا۔ رحمان کے ماموں زاد ترنکاری بازار میں آڑھت کا کاروبار کرتے تھے۔ انہوں نے ہم تینوں یعنی رحمان' ظہیر اور مجھے بھی اسی لائن میں لگا دیا۔ ہم نے اُس کام میں دن رات ایک کر دیا' خوب محنت کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی بہت برکت دی اور پھر ہمارا شمار کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ میں نے اور ظہیر نے رحمان کے رشتے دار گھرانوں میں شادیاں کیں اور ارجن نگر میں ایک بڑی سی مگر خستہ حال حویلی خرید لی اور پھر اس کے تین حصے کر کے اپنے اپنے گھر بنا لیے۔ یہ گھر جہاں ہم رہ رہے ہیں' ہماری اولادیں ہوئیں اور اُن کی شادیاں بھی ہم نے آپس میں ہی کیں اور نہایت ہی اتفاق سے زندگی گزاری۔ ہماری اولاد بھی اُسی کاروبار سے وابستہ ہے۔ ظہیر اور انیسہ اَب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں بھی اب آخری منزل کا مسافر ہوں۔ اِس مسافرت میں کبھی کبھی ماضی اور والدین' بہن بھائی اور اُن کی شہادت کے منظر یاد آتے ہیں تو آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔





منزہ سہام مرزا

# شہید کی ڈائری

علامہ اقبال کی پروازِ خیال

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

**قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ**

پیارے ہم وطنو......! دسمبر کا مہینہ مجھے ہمیشہ دکھ' اذیت اور اپنوں سے بچھڑنے کی یاد دلاتا ہے۔ ہر دکھ سے بڑا دکھ اپنوں سے بچھڑنے کا ہوتا ہے۔ موت پر بھی صبر آ جاتا ہے مگر اگر کوئی اپنا کھو جائے' بچھڑ جائے تو پھر ساری زندگی قرار نہیں آتا۔ میں بھی بے قرار ہوں' افسردہ ہوں' صرف ایک دکھ ہے جس نے مرنے کے بعد بھی چین نہ لینے دیا۔ سال 71ء' مہینہ دسمبر' سقوطِ ڈھاکہ...... ہائے' میرا وطن دولخت ہو گیا...... میرے اقبالؒ کا خواب چکنا چور ہو گیا...... قائداعظم کی محنت برباد ہو گئی...... سارے بیٹے ناکام ہو گئے...... دشمن کا وار چل گیا' میرا گھر اجڑ گیا...... بٹوارہ ہو گیا...... یہ تیرا' یہ میرا ہو گیا...... پاکستان اپنی پیدائش کے صرف 24 سال بعد ٹوٹ گیا' بکھر گیا...... یہ قومی سانحہ ہے...... یہ معمولی بات نہیں کہ بھلا دی جائے...... اپنی ناکامیوں کو تو ویسے بھی بھولنا نہیں چاہیے...... کیونکہ انسان انہی سے تو سبق سیکھتا ہے۔ توڑنا تو بہت آسان ہوتا ہے' اصل کام تو جوڑنا ہے' چاہے وہ سرحدیں ہوں یا دل...... ماں جی کہا کرتی تھیں کہ پتر......! کبھی کسی کا دل مت توڑنا' دل میں اللہ جی رہتے ہیں...... خود تکلیف برداشت کر لینا مگر کسی کو اور کی تکلیف کا سبب مت بننا' بس میں نے تو یہی سیکھا تھا...... زندگی نے مہلت نہ دی' ماں باپ کو کاندھا بھی نہ دے سکا...... بلکہ بوڑھا باپ میری میت کو لحد میں اتار کر اپنی بوڑھی آنکھوں سے حسرت سے تکتا رہا اور یونہی حسرت لیے دنیا سے چلا گیا...... ماں جی تو رات میں سوئیں تو پھر صبح اٹھ ہی نہ سکیں...... جوان اولاد کا دُکھ صرف وہی جان سکتے ہیں جو اس قیامت سے گزرے ہوں۔ فاطمہ کی ماں کی آنکھوں میں میرے جانے کے بعد ہمیشہ ویرانیاں ہی رہیں' وہ اپنی بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر اور بہو کو گھر لا کر بھی ان ویرانیوں سے پیچھا نہ چھڑا سکی' چھڑاتی بھی کیسے' اس کے سر کا سائیں بچھڑ گیا تھا...... اُس کی چھت...... اُس کا سائبان بکھر گیا تھا...... سر پر چھت کتنی ضروری ہوتی ہے' یہ تپتی دھوپ میں

جھلنے والے سے پوچھیں، یہ طوفانوں کا سامنا کرنے والوں سے پوچھیں کہ گھر کی کیا اہمیت ہے، گھر جو ہر طوفان سے بچاتا ہے، گھر جس میں عزتیں محفوظ رہتی ہیں، گھر جو آرام وسکون کا سبب ہوتا ہے اور میرا تو گھر ہی ٹکڑے ہوگیا تھا، میں کیسے خوش ہوتا؟ دسمبر کی خنکی میری ہڈیوں میں اتر کر مجھے خالی ہاتھ ناکام رہ جانے کا احساس دلاتی ہے۔ اچھا ہوا، میں دنیا سے ہی چلا گیا ورنہ جیتے جی ہی مر جاتا...... روز جیتا، روز مرتا...... آخر حفاظت نہیں کر سکا، اقبالؒ کے خواب کو بچا نہیں سکا اور اب تو حیران ہوں، گنگ ہوں، جب سے ہے کہ میرے ملک کے اسمبلی کے ممبران ازراہِ مذاق کہتے ہیں کہ ریلوے کا محکمہ لالو پرشاد کو دے دیں، وہ ایسا گھناؤنا مذاق کر بھی کیسے سکتے ہیں؟ 14 اگست 1947ء کی سب سے بڑی اور خونی ہجرت وہ کیسے بھول سکتے ہیں؟ عورتوں کی بے حرمتی، جوانوں کی ادھڑی لاشیں، بچوں کو کرپانوں پر اچھالنا، یہ سب وہ کیسے بھول سکتے ہیں؟ اور اگر اپنے محکمے انہی کے حوالے کرنے تھے تو پھر 14 اگست 1947ء چہ معنی دارد......

شہیدِ وطن









مینا تاج

# کھولتی زندگی

قابل اجمیری کا خیال

برہم ہے کائنات مگر جی رہے ہیں ہم
مشکل سہی حیات مگر جی رہے ہیں ہم

**ایک پکوڑے فروش کا نوحہ جس کے خواب کھولتے تیل میں گم ہوگئے تھے**



پکوڑے، سموسے وغیرہ کو شہر، قصبہ، گاؤں، ہر جگہ اور ہر طبقے میں مقبولیت حاصل ہے۔ اعلیٰ ہوٹلوں سے لے کر اسٹیشنوں، فٹ پاتھوں اور بس، رکشہ اسٹینڈ تک یہ عوامی سوغات پائی جاتی ہے۔ اس مقبولِ عام سوغات کا جنم بہت قدیم ہے مگر وقت کی دھول نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور آج بھی یہ اُسی طرح پسند کی جاتی ہے بلکہ نت نئے انداز میں سامنے آتی اور ہمارے معدے سے گزرتی دل میں اترتی جا رہی ہے۔ سموسے کے بعد رول کی شکل متعارف ہوئی۔ اس میں قیمے کے ساتھ ساتھ چکن کا استعمال شروع ہوا پھر فیشن کے مطابق سبزیاں ڈال کر اس کا نام چائنیز رول رکھ دیا گیا۔ اسی طرح پکوڑوں کو بھی نت نئے انداز دیئے گئے۔ وقت کے تقاضے اور لوگوں کی نفسیات کے پیشِ نظر مختلف ناموں سے نواز دیا گیا۔ دال کے پکوڑے، سبزی کے پکوڑے، چائنیز پکوڑے، فش پکوڑے، یہی نہیں بلکہ ان کے فروخت کے طریقوں میں بھی جدت آتی چلی گئی۔

پر اتنی تبدیلی کے باوجود ان کے فروخت کرنے والوں کے حالات میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ پکوڑے، سموسے فروش برسہا برس سے اسی تنگ دستی اور مصیبتوں کے ساتھ جیے جا رہے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار طلال کا ہے۔

گلشن چورنگی کے پل تلے جہاں اور روز کمانے کھانے والے اپنا روزگار سجائے بیٹھے ہیں، وہیں پر ایک عدد ٹھیلا طلال کا بھی ہے۔ اپنے ٹھیلے پر سموسے، پکوڑے اور رول سجائے وہ اپنی ذات سے بے نیاز آتے جاتے لوگوں پر نظریں جمائے اس بات کا متلاشی ہوتا ہے کہ آج اس کا کتنا مال بکے گا؟ پورا مال بکے گا بھی یا نہیں؟ پر ساتھ میں خوف کی تلوار بھی اس کے ذہن پر لٹک رہی ہوتی ہے کہ کہیں قانون کے رکھوالے آج کی دیہاڑی پوری ہونے سے قبل ہی اس کا مال، مالِ غنیمت سمجھ کر اپنے پیٹ کا اید بھرنے نہ بیٹھ جائیں۔

غربت کی چکی میں پس کر جوان ہونے وا طلال کا تعلق پنجاب سے ہے۔ گاؤں میں اس ماں تھوڑے سے اناج کے عوض لوگوں کے گ اور کھیتوں میں کام کر کے اپنے کنبے کا پیٹ پال تھی، یوں صرف پیٹ بھرنے کا انتظام بمشکل ہو لیکن جوان ہوتی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنا اس بس میں نہ تھا۔ اس نازک صورتِ حال کے پیشِ بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا طلال کو جس کی عمر گیارہ سال کی تھی، ماں نے گاؤں میں شہر سے آ اپنے دور کے رشتے دار جو شہر کراچی میں مزدوری تھا، طلال کو روزی، مزدوری حاصل کرنے کی اس کے ہمراہ بھیج دیا۔ شہر میں تھوڑی سی تگ و دو بعد ایک بیکری میں اُسے نوکری مل گئی جہاں اُس عمر کو دیکھتے ہوئے چھوٹے موٹے کام پر مامور کیا تھا پر زیادہ عرصہ تک یہ عمر کا لحاظ برقرار نہ رہا۔

سخت گیر مالک نے اس کی نوعمری کو نظر انداز کر کے پانی بھرنے سے لے کر بیکری کی صفائی ستھرائی اور کڑھائی میں تیل ڈالنے اور کڑھائی مانجھنے تک سب کام اس کے کھاتے میں ڈالنے شروع کر دیئے۔

طلال زبان پر چپ کی قفل لگائے اپنے ہر کام میں مصروف رہتا۔ لاکھ جھڑکیوں اور ذلت آمیز القابات سے نوازے جانے کے باوجود خاموش رہتا۔ غربت چھوٹی عمر میں ہی بڑی سمجھداری وصبر لے آتی ہے۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی خاموشی اور ذلت کے عوض ہی اس کے گھر کا ایندھن چل رہا ہے۔

طلال کی ایمانداری اور خاموشی نے بیکری مالک کو نئی راہ دکھائی، اُس نے طلال کو سموسہ بنانے

پتیوں سے لے کر رول، سموسے، پکوڑے بنانے کا کام بھی سکھا دیا۔ جب وہ اس کام میں ماہر ہوگیا تو ایک عدد ٹھیلہ خرید کر اسے گلشن چورنگی کے پل کے نیچے کھڑا کردیا گیا جہاں سواری کے انتظار میں کھڑے افراد، رکشہ ڈرائیوروں اور اسکول، کالجوں کے طلباء کا جمگھٹا لگا رہتا، تھکے ہارے اور بھوک کے مارے افراد کے لیے اسی ٹھیلے کے لوازمات جوان کے بجٹ کے عین مطابق ہوتے اور کسی من و سلویٰ سے کم نہ لگتے۔

مالک نے طلال کو کھڑا کر کے اپنے نئے بزنس کی شروعات تو کردی جس سے اس کے بجٹ میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوا، پر طلال کی تنخواہ میں اضافہ نہ ہوا بلکہ اب تو نت نئی مشکلات میں اضافہ ہوگیا تھا اور کام کے ساتھ ان مشکلات سے نپٹنا بھی اس کے فرائضِ نوکری میں شامل ہوگیا۔ بیکری میں تو صرف مالک کی گالیاں اور جھڑکیاں اسے موصول ہوتی تھیں، پر اب ہر گاہک مالک کی کمی پورا کرتا۔

''طلال! مالک تمہیں کتنی تنخواہ دیتا ہے؟''

سموسے کی خالی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا۔

''چھ ہزار روپے، پانچ ہزار پنجاب اپنے گھر بھیجتا ہوں، ایک ہزار اپنے پاس رکھ لیتا ہوں کرائے کے لیے۔''

''کرایہ کتنا دیتے ہو؟''

''چار افراد مل کر رہتے ہیں۔ چار ہزار کرایہ ہے جو مل کر ادا کرتے ہیں۔''

''اس جگہ جہاں تم ٹھیلہ لگائے کھڑے ہو، اس کا تو کرایہ نہیں ہوتا ہوگا؟''

''اس جگہ کا بھی کرایہ ہوتا ہے۔ سو روپیہ ہفتہ اور پانچ سو روپے مہینہ الگ ادا کرتے ہیں، پر وہ مالک ادا کرتا ہے۔ کس کو ادا کرتا ہے، یہ ہمیں نہیں معلوم۔''

''اور تم یہاں کتنے بجے آتے ہو؟ میرا مطلب ہے، یہ ٹھیلہ لے کر؟''

''صبح دس بجے سے لے کر رات آٹھ بجے تک یہاں ہوتا ہوں۔''

''روزانہ کتنی سیل ہوتی ہے؟''

''تقریباً ڈھائی ہزار سے تین ہزار روپے۔'' اس نے سوچتے ہوئے بتایا۔ صبح سے شام تک اس کام میں جُتے رہنے کے عوض تمہیں صرف چھ ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے یعنی صرف مالک کو فائدہ پہنچ رہا ہے اس کاروبار سے؟''

''اب فائدہ ہو یا نقصان۔ باجی...... ! کیا کر سکتے ہیں؟ مجھے کوئی دوسرا کام آتا بھی نہیں اور جانے دوسرا مالک یہ چھ ہزار بھی دے کہ نہ دے۔ اسی مالک کے پاس برسوں سے ہوں۔''

''تو جب یہ کام تمہیں آ ہی گیا ہے تو اپنا ذاتی کاروبار...... میرا مطلب ہے، ذاتی ٹھیلہ لگالو؟''

اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیوں مذاق کرتی ہو باجی...... ؟ ابھی ساری بات تم کو بتائی تو ہے، پانچ ہزار گھر بھیج کر ایک ہزار میں سے آٹھ سو کرایہ ادا کرتا ہوں، اب بھلا دو سو روپے سے میں الگ ٹھیلہ لگا سکتا ہوں؟ کام آنے سے کیا ہوتا ہے، پیسہ بھی تو ہونا چاہیے۔''

''بھئی، قرضہ لے کر کام شروع کرو۔ بعد میں کام سے جو آمدنی ہو تو قرضہ ادا کردینا۔'' میں نے اپنے تئیں دانش مندانہ مشورہ دیا، پر اس کے جواب نے مجھے حماقت کی دہلیز پر کھڑا کردیا۔

''ہا...... ہا...... باجی...... ! قرضہ...... پھر وہی بات جس کی جیب میں سب کچھ ادا کرنے کے بعد دو سو روپے بچتے ہوں، اس کو بھلا کون قرضہ دے سکتا ہے؟ قرضہ بھی تو ان لوگوں کو دیا جاتا ہے نا، جن کے پاس پہلے سے کچھ ہو۔ یہاں تو عید کے بہانے ایک

جوڑا مالک بنا دیتا ہے یا پھر مالک کا پرانا جوڑا مل جاتا ہے ورنہ تو میری اوقات ایک جوڑا بنانے کی بھی نہیں، بس بھئی، یہ سوہنے رَب کی مہربانی ہے۔ ہمیں اسی طرح گزر بسر کرنا ہے۔" وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے ٹھیلے کے اطراف لگے شیشے کی صفائی کرنے لگا۔

"بھائی......! دس روپے کے پکوڑے دینا چٹنی ڈال کر۔"

"دو رول پکڑا بھائی......!"

طلال جلدی جلدی سب کی مطلوبہ اشیاء تھمانے میں مصروف ہوگیا۔

"دو رول اور تین سموسے دینا۔" ایک لڑکا اپنی ہی ہم عمر لڑکی کے ساتھ ٹھیلے کے پاس آ کھڑا ہوا جبکہ طلال پہلے سے کھڑے گاہک کو پلیٹ سجا کر دینے لگا۔

"بس ایک منٹ بھائی......!"

"چلو عاطف، یہ تو دیر لگا رہا ہے، دوسرے گاہکوں سے فرصت ہو تو یہ ہمیں دے۔" لڑکی نے ایک ادا سے ساتھ والے لڑکے سے کہا۔

"ارے نہیں، رکو یا جی......!"

"کیوں بھئی، کچھ زیادہ پیٹ بھر گیا ہے جو یوں نخرے دکھا رہا ہے؟"

"ارے عاطف، چھوڑو، مت بحث کرو، یہ کام کرنے والوں کی انکم بہت ہوتی ہے۔ جتنا ایک پڑھا لکھا بندہ کماتا ہے، اس سے کہیں زیادہ یہ یہاں کھڑے ہو کر کم وقت میں کما لیتے ہیں۔ بھئی اپنے شہر میں ہم کو روزگار نہیں، پر یہ باہر سے آئے نوٹ چھاپ رہے ہیں۔" لڑکی نے 'قابلیت' کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

"یہ لیجیے بھائی......!" بلال نے جیسے ان سنی کرتے ہوئے پلیٹ تیار کر کے آگے کر دی۔

دس منٹ کے لیے رش کم ہوا اور اس دوران طلال جلدی جلدی کڑھائی میں پکوڑے تلنے میں مصروف ہوگیا۔

"ارے، تو نے اتنی گندی پلیٹ میں چٹنی ڈال کر دی ہے۔ میری تو ابھی نظر پڑی۔ میں نے تو دیکھے سموسے کھا لیے بھوک کے مارے، پتا نہیں گندگی سے تلے ہوں گے؟ اب اگر بیمار پڑا تو ڈاکٹر کی فیس بھی تم سے آ کر لوں گا۔"

"معاف کرنا بھائی......! میں نے تو صاف پلیٹ میں چٹنی ڈال کر دی تھی۔"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" لڑکا غرایا۔

"آپ پیسے مت دیں، پر غصہ مت کریں۔"

"ابے، تیری اوقات کیا ہے جو پیسے نہ دینے کی بات کر رہا ہے، یہ لے بیس روپے۔" وہ ٹھیلے پر پیسے پھینکتا آگے بڑھ گیا۔ مجھ پر طلال کی نظر پڑی تو خفت مٹاتے ہوئے دھلی پلیٹ صاف کرنے لگا۔

"طلال، پلیٹ تو بالکل صاف تھی، میں نے دیکھی تھی جب تم نے اُسے چٹنی ڈال کر دی تھی پھر یہ لڑکا......"

"چھوڑیں جی، یہ تو روز کی بات ہے۔ کوئی نہ کوئی گاہک دن بھر میں ایسا ضرور کرتا ہے، پر میں ان لڑکوں کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔ اسکول سے تھکے آئے ہیں۔ میں نے تو اسکول پڑھا نہیں، پر میں اسکول پڑھنے والوں کی قدر کرتا ہوں اور پھر یہ دو باتیں سناتے ضرور ہیں، پر پیسے پورے دے کر جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ پریشانی مجھے پولیس والوں سے ہوتی ہے جو کھانے کے بعد پیسے ادا نہیں کرتے اور ہم ان کی وردی کے خوف سے پیسے نہیں مانگتے۔ ایک دفعہ جب میں نے نیا نیا ٹھیلہ لگایا تھا تو میں نے غلطی سے پیسے مانگ لیے تو ایسا رکھ کر چماٹ مارا تھا کہ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے، بس وہ میرا پہلا



اور آخری دن تھا جب مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی۔ اس کے بعد مالک اور آس پاس کھڑے جوس والے اور دوسرے پتھارے والوں نے مجھے سمجھایا کہ ان لوگوں سے پیسے کبھی نہ مانگنا ورنہ کسی کاروبار کے قابل نہ رہو گے۔ کبھی کبھی تو کئی پولیس والے جمع ہوتے ہیں اور ان کے جمع ہونے سے دوسرے لوگ قریب نہیں پھٹکتے خاص طور پر اسٹینڈ پر کھڑے رکشے والے اور موٹر بائیک والے لڑکے۔"

میں حیرت و افسوس سے اس غریب لڑکے کی شکل دیکھ رہی تھی کہ جس کی کہانی بیکری کے مالک کی جھڑکیوں سے شروع ہو کر تعلیم حاصل کرنے والے گروہ سے ہوتی ہوئی قانون کے رکھوالوں کی کارستانیوں تک دراز ہوگئی تھی مگر اُسے ابھی جانے کب تک اس زمین پر جینے کا تاوان ادا کرنا ہوگا؟ غور طلب امر یہ ہے کہ کوئی دوسری مخلوق یہ ظلم نہیں ڈھاتی بلکہ انسان ہی انسان کا دشمن ہے، ایک کمزور، دوسرا طاقتور جو ایک دوسرے کی ضد بنے ہوئے ہیں۔ بقول نظیر اکبر آبادی۔

دنیا میں بادشاہ ہے، سو ہے وہ آدمی
اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

تاہم پکوڑے، سموسے اور رول سے وابستہ تمام افراد کی حالت طلال جیسی نہیں ہے بلکہ اس کاروبار سے وابستہ بڑے نام خوب دولت سمیٹ رہے ہیں جیسے بہادر آباد میں واقع کریسنٹ، یونائیٹڈ بیکری، اسی طرح گلشن کا نمکو ہاؤس، بھاشانی سوئٹس و نمکو ہاؤس اور فریسکو وغیرہ۔ پوش علاقوں کی چھوٹی موٹی دکانوں میں بھی یہ کام بہت عزت سے کیا جاتا ہے جیسے ڈیفنس فیز فور میں واقع ایک چھوٹی سی دکان

## غزل

یہ وقت کی طنابیں ہیں کھینچا نہ کیجیے
جب ٹوٹ جائے تو ڈور تو باندھا نہ کیجیے

ہم جانتے ہیں آپ ہمارے نہ تھے کبھی
ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسلا نہ کیجیے

کشتی امید کی جو کبھی ڈوبنے لگے
ساحل سے ناخدا کو بلایا نہ کیجیے

دنیا کی بے ثباتی کا، کیا ذکر ہم کریں
اپنے سوا کسی پہ بھروسہ نہ کیجیے

کیسے کہیں کبھی وہ وفا دار ہی نہ تھا
پیارا ہے آج بھی اُسے رُسوا نہ کیجیے

ہم زندگی کی ناؤ کو کھینچیں گے کس طرح
تنہا ہوئے ہیں، اس طرح سوچا نہ کیجیے



رضیہ ناز

جہاں شام کی چائے کے لوازمات بڑے شائستہ طریقہ سے فروخت ہوتے ہیں اور گاہکوں کی آمد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے' وہی لوازمات جو طلال پُل کے نیچے کھڑا ٹھیلا سجا کر فروخت کررہا ہے اور بدلے میں دس باتیں سن کر معاوضہ وصولتا ہے جبکہ نثار اس فیشن ایبل پوش علاقے میں صرف شام پانچ بجے سے سات بجے تک دگنی قیمت میں اپنا سامان شام کے لوازمات کے نام پر کمالیتا ہے اور ساتھ ہی اس کی عزتِ نفس بھی محفوظ رہتی ہے اس لیے نہیں کہ ڈیفنس میں کوئی اور مخلوق رہائش پذیر ہے' وہاں بھی وہی انسان بستے ہیں جو شہر کے مختلف علاقوں میں' فرق صرف اتنا ہے کہ انہیں انسانیت کا نہیں بلکہ اس علاقے کا بھرم برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ یہ منظر میں نے اپنی چشمِ گناہ گار سے دیکھا ہے۔

گاڑیوں کی قطار نثار کی دکان کے آگے لگی ہوئی تھی جبکہ نثار کا بھائی دکان میں بیٹھا کیش وصول کررہا تھا اور نثار بھاگ بھاگ کر ہر گاڑی کے اندر حسبِ آرڈر سموسے' پکوڑے' چاٹ کا تیار پیکٹ گاہک کو تھماتا اور رقم وصول کرکے سلام کرتا اور گاڑی چل پڑتی۔ بعض پیدل آنے والے گاہکوں کو بھی اُسی مستعدی سے مطلوبہ اشیاء تھما کر رقم وصول کرتا ہے۔ اچانک ایک گاڑی کے اندر بیٹھے صاحب پر اُس کی نظر پڑی۔

''زیدی صاحب' آپ؟''

''ابے نثار......! تو یہاں' بڑا مال کمالیا ہے بھیے' تو نے جو یہاں ڈیفنس میں ٹھیہ جمالیا ہے اور یہ تیرا بھائی ہے نا پپو؟'' کاؤنٹر پر بیٹھے سفید کلف لگے کپڑے میں ملبوس کیش جمع کرتے ہوئے لڑکے پر نظر پڑتے ہی کہا گیا۔

''جی صاحب......!''

''یاد ہے جب تیرا ٹھیلا ناظم آباد میں ہوا کرتا تھا' روز شام تیرے ٹھیلے پر ہم چار جنے دھاوا بول دیتے تھے' تیرے دوسرے گراک (گاہک) بھی پریشان ہوجاتے تھے اور کہتے تھے۔ ''بھیا' پہلے ان لوگوں کو فارغ کردو۔'' یہ تمام باتیں گاڑی میں بیٹھا شخص قدرے آہستہ انداز میں کہہ رہا تھا جبکہ ساتھ بیٹھی بھاری بھرکم خاتون باچھیں پھیلائے اپنے شوہرِ نامدار سے مرعوب ہوئی جارہی تھیں۔

''صاحب' آپ یہ میرا سیل فون نمبر رکھ لیں آپ جب بھی یہاں آئیں' آنے سے پہلے مجھے فون کردیجیے گا' میں سب سے پہلے آپ کو سروس دوں گا۔'' نثار نے قدرے پریشان کن لہجے میں کہا۔

''ابے' پریشان کیوں ہورہا ہے' وہ حرکتیں تو ناظم آباد میں چل جایا کرتی تھیں' اب بھلا ڈیفنس میں یہ سب کرتا اچھا لگوں گا؟ میں تو بس اسی طرح تجھ سے چاٹ' سموسے لے جایا کروں گا جس طرح سے ڈیفنس والے بغیر کسی شور کے آرام سے سودا لے کر جاتے ہیں۔

بھیے' اب یہاں رہنا ہے تو یہاں کے طور طریقے بھی تو آنے چاہئیں' ہے کہ نہیں...... ورنہ تو لوگ ملنا بھی پسند نہ کریں گے' جانے کہاں سے اٹھ آئے ہیں بچ بچ کر۔''

''جی صاحب......'' نثار نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ گویا علاقے کا بھرم رکھنا شاید عوام کے نزدیک زیادہ اہم ہے بہ نسبت انسانیت کے۔

آئندہ آپ جب کبھی کسی سموسے' پکوڑے والے کے ٹھیلے پر اپنی بے وقت کی بھوک مٹانے کے لیے جائیں تو بس اتنا ضرور سوچیے گا کہ کھولتے ہوئے تیل میں لذیذ پکوڑے تلنے والے اُس شخص کے جانے کتنے خواب اس گرم تیل میں جل کر خاک ہوگئے ہوں۔ آپ اس کے خواب تو نہیں لوٹا سکتے مگر اُس کی عزتِ نفس کا خیال تو ضرور کرسکتے ہیں ناں!!!





سلیم فاروقی

# آتشِ جنوں

شاعر کا خیال

سو پریکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت' اس کے دل میں انتقام کا جو لاوا کبھی مہمیز کر رہا تھا۔ قسط نمبر 9

## خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے......ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کررہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کردیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں' اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہوجاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کرکے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جاکر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آجاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کردیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہوجاتا ہے۔ اسی دوران پولیس' عمران

کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورتِ حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان بیرسٹر ... کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں......

راستے میں تیمور اور عمران' شیر خان پر قابو پا لیتے ہیں یہاں تک کہ وہ بابر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ بابر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

''کیا ہوا فاروق بھائی؟'' میرے منہ سے بے اختیار دادا کی بجائے فاروق بھائی نکل گیا۔

''فاروق بھائی؟'' اس نے چونک کر عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''کسی نے میری گاڑی پر بے آواز رائفل سے فائر کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم ڈرائیونگ جانتے ہو؟'' فاروق دادا نے اچانک پوچھا۔

''مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو گاڑی میں کبھی کبھار ہی بیٹھا ہوں۔ ابا کے پاس تو موٹر سائیکل بھی نہیں تھی۔''

اس نے گاڑی کی رفتار خوف ناک حد تک بڑھا دی اور اچانک اسے ایک دفعہ پھر بائیں طرف کی سڑک پر موڑ لیا۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر شاید کوئی آفس تھا' وہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ فاروق دادا نے بہت مہارت اور عجلت سے اپنی گاڑی اُن گاڑیوں کے درمیان کھڑی کی اور گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ ''تم بھی جلدی اترو ہاشم!''

میں کچھ سمجھے بغیر تیزی سے نیچے اتر گیا۔

فاروق دادا میرا ہاتھ پکڑ کے اُسی آفس میں گھس گیا۔ وہ شاید کسی جہازوں کی کمپنی کا آفس تھا۔ دیوار پہ جگہ جگہ ہوائی جہازوں کی تصویریں لگی تھیں۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ٹریولنگ ایجنسی کا دفتر ہے۔

کاؤنٹر پر خوب صورت سی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے بہت گہرا میک اپ کر رکھا تھا۔ اگر میک اپ نہ ہوتا تو وہ مزید خوب صورت لگتی۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ''جی فرمایئے؟''

''مجھے لندن اور نیویارک کی فلائٹس کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔'' فاروق دادا نے کہا۔ ''لیکن پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ باتھ روم کہاں ہے؟''

لڑکی اس کی گھبراہٹ پر بے اختیار مسکرانے لگی۔ اس مرتبہ اس کی مسکراہٹ کاروباری نہیں تھی' اس نے ہنستے ہوئے اِشارہ کیا کہ باتھ روم اُس طرف ہے۔

’’دیکھیے خاتون! میرے کچھ دوست زبردستی مجھ سے ٹریٹ لینا چاہتے ہیں۔ میں فی الحال انہیں ٹریٹ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اگر وہ یہاں آ کر میرے بارے میں پوچھیں تو پلیز‘ آپ انکار کر دیجیے گا کہ یہاں کوئی نہیں آیا۔‘‘ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اُس سمت بڑھ گیا جہاں لڑکی نے باتھ روم کی نشاندہی کی تھی۔

لڑکی کے چہرے پر اُس وقت عجیب سی الجھن کے تاثرات تھے۔

وہاں لمبا سا ایک صوفہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے خوبصورت سی ایک میز تھی جس پر بہت خوبصورت انگریزی کے رسالے رکھے تھے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک رسالہ اٹھا لیا کہ ممکن ہے‘ لڑکی کو اس پر اعتراض نہ ہو۔ لڑکی پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس وقت پاکستان میں کمپیوٹر اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ میں نے تو کمپیوٹر دیکھا بھی نہیں تھا‘ صرف سنا تھا کہ کراچی کے کسی بڑے بینک نے کمپیوٹر لگایا ہے۔ لوگ خاص طور پہ وہ کمپیوٹر دیکھنے جاتے تھے البتہ ٹیلی فون کی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں اور وہ لڑکی ہر کال کا جواب مسکرا کر دے رہی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ایک ہی کام کرتے کرتے بور نہیں ہوتی۔

اچانک شیشے کا داخلی دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر آ گئے۔ وہ چہروں ہی سے بدمعاش لگ رہے تھے۔ ان دونوں نے بہت عمدہ قسم کی پینٹ اور شرٹ پہن رکھی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کپڑے انہیں زبردستی پہنائے گئے ہیں۔

وہ دونوں متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

لڑکی نے مسکرا کر ان سے بھی وہی سوال کیا۔ ’’جی فرمایئے؟‘‘

’’ابھی یہاں کوئی آدمی تو نہیں آیا تھا؟‘‘ ان میں سے ایک اکھڑ لہجے میں بولا۔

’’یہاں تو لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔‘‘ لڑکی نے کہا۔ ’’آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟‘‘

’’وہ لمبے قد کا آدمی ہے‘ سرخ و سفید رنگ اور بھورے بال‘ اس کی آنکھیں بھی بھوری ہیں اور بہت خوبصورت آدمی ہے۔ آپ نے اگر اسے دیکھا ہو گا تو آپ اسے بھول نہیں سکتیں۔‘‘

’’ایسا تو کوئی آدمی یہاں نہیں آیا۔‘‘ لڑکی نے کہا۔ ’’لیکن آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟‘‘

’’اپنے کام سے کام رکھو…!‘‘ وہ شخص درشت لہجے میں بولا۔ توہین کے احساس سے لڑکی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’میں اپنا کام ہی کر رہی ہوں۔ بتایئے‘ آپ کو کس فلائٹ کا ٹکٹ چاہیے؟‘‘

’’یار شبیر!‘‘ اس نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا۔ ’’وہ اپنی گاڑی کھڑی کر کے کہیں اور نکل گیا۔‘‘

’’سلطان‘ تم اس کی گاڑی اچھی طرح پہچانتے ہو؟‘‘

’’یار‘ مجھے تو اس کی گاڑی کا نمبر بھی یاد ہے۔‘‘ سلطان خان نے کہا۔ ’’پھر اس کی نظر اچانک مجھ پر پڑی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ’’اے لڑکے……! تو نے یہاں کسی ایسے آدمی کو دیکھا ہے؟‘‘

’’آپ پلیز‘ مجھ سے اس لہجے میں بات مت کریں۔‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔ ’’میں نے کسی ایسے آدمی کو نہیں دیکھا۔‘‘

’’تو یہاں کیا کر رہا ہے؟‘‘ اس نے انتہائی اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

’’اے مسٹر!‘‘ لڑکی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’آپ کو ہمارے کسٹمرز سے اس لہجے میں بات کرنے کا کوئی حق



نہیں ہے۔ پلیز‘ آپ باہر جائیں‘ یہ دفتر ہے‘ کوئی ایرانی ہوٹل نہیں ہے۔‘‘ لڑکی جتنی خوب صورت تھی‘ اتنی ہی پُراعتماد بھی تھی۔

’’یار‘ گاڑی میں دو آدمی تھے۔‘‘ سلطان خان نے کہا۔ ’’دوسرا آدمی کہاں گیا؟‘‘

’’ارے یار‘ ہمیں دوسرے آدمی سے کیا لینا‘ وہ بھی فاروق دادا کے ساتھ ہی ہو گا۔‘‘

’’اسے تلاش کرو‘ وہ یہیں کہیں ہو گا۔‘‘

میں نے اچانک کہا۔ ’’آپ جن صاحب کی بات کر رہے ہیں‘ میں نے انہیں دیکھا تھا۔ مجھے غور کرنے پر ابھی ابھی یاد آیا ہے۔‘‘

’’کہاں دیکھا تھا؟‘‘ سلطان خان نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

وہ کسی ٹیکسی والے سے بات کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔‘‘

’’تو نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی؟‘‘ سلطان خان نے برہم ہو کر پوچھا۔

’’مجھے تو یاد ہی ابھی آیا ہے‘ وہ بھی اس لیے کہ ان صاحب کی شخصیت بہت شاندار تھی۔‘‘

وہ دونوں تیزی سے باہر نکل گئے پھر میں نے انہیں ایک گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوتے دیکھا۔ گاڑی میں دو افراد پہلے سے موجود تھے۔

ان کے جانے کے چند منٹ بعد فاروق دادا بھی باہر آ گیا اور لڑکی سے بولا۔ ’’تھینک یو مس‘ آپ نے مجھے فضول کی ٹریٹ سے بچا لیا۔‘‘

"مسٹر فاروق......!" لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ آپ کے دوست نہیں تھے آپ جیسے آدمی کے ایسے جاہل دوست ہو بھی نہیں سکتے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں وہ میرے دوست نہیں تھے بلکہ دشمن تھے......" فاروق دادا نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس میں مجھ سے زیادہ کمال تو آپ کے بھائی کا ہے۔" لڑکی نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اس نے انہیں چکمہ دیا تھا ورنہ وہ لوگ اتنی جلدی یہاں سے نہیں ٹلتے اور مجھے پولیس کو بلانا پڑتا۔ یہ ٹریولنگ ایجنسی کسی معمولی آدمی کی نہیں ہے بلکہ آرمی کے ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر صاحب کی ہے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ مس......!"

"میرا نام تحریم ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"اچھا مس تحریم!" فاروق دادا نے کہا۔ "میں اکثر بیرونِ ملک جاتا رہتا ہوں اب مجھے کہیں جانا ہوا تو ٹکٹ آپ ہی کی ٹریولنگ ایجنسی سے لوں گا۔"

"یو آر ویلکم سر......!" لڑکی نے کہا۔

فاروق دادا باہر کی طرف بڑھا تو میں نے اسے روک دیا اور کہا۔ "آپ ابھی یہیں ٹھہریں میں باہر کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔"

میں باہر نکلا تو وہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس پر شبہ ہوتا۔

اچانک میری نظر فاروق دادا کی گاڑی پر پڑی۔ اس کے نزدیک ہی ایک بدمعاش قسم کا آدمی کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

میں فوراً اندر آ گیا اور بولا۔ "باہر ابھی خطرہ ہے وہ لوگ تو چلے گئے ہیں مگر اپنا ایک آدمی چھوڑ گئے ہیں وہ آپ کی گاڑی کے پاس کھڑا ہے۔"

"اس ایک آدمی سے تو میں نمٹ لوں گا......" فاروق دادا نے کہا۔

"آپ کو دیکھتے ہی وہ چوکنا ہو جائے گا۔ ممکن ہے وہ مسلح بھی ہو اور آپ کو دیکھتے ہی فائر کر دے۔" میں نے کہا۔ "آپ یہیں رکیے اس آدمی سے تو میں بھی نمٹ سکتا ہوں۔"

"تم......؟" فاروق دادا نے حیرت سے کہا۔ "ہاں مجھے یاد آیا تم واقعی اس سے نمٹ سکتے ہو۔"

"آپ یہیں بیٹھیے میں ابھی آتا ہوں۔" میں آفس کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

وہ آدمی فاروق دادا کی گاڑی کے ساتھ ہی پارک دوسری گاڑی سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونک رہا تھا۔

میں نے بغور اس کا جائزہ لیا اس کا قد درمیانہ لیکن جسم بہت گٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پہ چھوٹے چھوٹے بال تھے جنہیں اُس زمانے میں 'کروکٹ' کہا جاتا تھا۔ اس نے گھسی پٹی ایک پینٹ اور اسی کی طرح شرٹ پہن رکھی تھی۔

میں ٹہلتا ہوا وہاں پہنچا اور فاروق دادا کی گاڑی کے پاس پہنچ کر جیب میں یوں ہاتھ ڈالنے لگا جیسے میں گاڑی کی چابی نکال رہا ہوں۔

"اے لڑکے......!" وہ کوے جیسی آواز میں بولا۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"



میں نے چونک کر اسے یوں دیکھا جیسے پہلی دفعہ اس پر نظر پڑی ہو۔ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "کیا کہا آپ نے؟"

"میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں؟" میں نے کہا۔ "اور تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ گاڑی تیری ہے؟" اس نے پھر انتہائی اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں یہ گاڑی میری ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"مجھے تو لگ رہا ہے کہ تو اس گاڑی میں سے کچھ چرانا چاہتا ہے؟" اس نے کہا۔

"شکل سے تو مجھے تم چور لگ رہے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"تو مجھے چور کہہ رہا ہے؟" اس نے درشت لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر میرے چہرے پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی۔

میں تیزی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ میری بجائے گاڑی کی باڈی پر پڑا۔

میں نے جھکے بیٹھے بیٹھے اچانک اس کے پیٹ میں زوردار ٹکر ماردی۔ اس کے حلق سے "اوغ......" کی آواز برآمد ہوئی اور چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہو گئے۔

اس وقت وہاں فاروق دادا آ گیا اور ڈپٹ کر بولا۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" پھر وہ چونک کر بولا۔ "تم اس بچے کو مار رہے ہو؟"

"میں......میں تو......اس سے......"

"کیا میں تو میں تو لگا رکھی ہے؟" فاروق دادا نے اسے جھڑک دیا۔ "کیوں مار رہا تھا اس لڑکے کو؟"

"میں اسے نہیں مار رہا تھا بلکہ اس نے مجھے مارا ہے۔" وہ آدمی بولا۔

"تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟" فاروق دادا نے اچانک ڈپٹ کر پوچھا۔ "میرے انتظار میں؟"

"نہیں دادا! میں یہاں اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔"

اس کی بات سے ظاہر ہوا کہ وہ فاروق دادا کو پہچانتا ہے۔

فاروق دادا نے جیب سے گاڑی کی چابی نکالی اور اس کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جن لوگوں نے تجھے یہاں کھڑا کیا ہے ان سے کہہ دینا کہ اب میں ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ تجھے قربانی کا بکرا بنا کر یہاں چھوڑ گئے ہیں تو کیا مجھے پکڑ کر ان کے پاس لے جا سکتا ہے؟" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "تم بھی گاڑی میں بیٹھو۔"

"دادا! انہوں نے مجھ سے صرف یہ کہا تھا کہ اگر فاروق دادا اس گاڑی کی طرف آئے تو تم فوراً سامنے والے فٹ پاتھ کی طرف آ جانا۔ ہم لوگ وہیں کھڑے ہیں۔"

"جا جا کر انہیں بتا دے کہ فاروق دادا چلا گیا لیکن ابھی دس منٹ تک ہلنا نہیں ورنہ میرے آدمی تجھے گولی مار دیں گے تو کیا سمجھتا ہے میں اتنی دیر تک یہاں کیوں رکا رہا؟ میں اپنے آدمیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر تجھے یقین نہ ہو تو یہاں سے دس منٹ پہلے نکل جانا پھر لوگوں کو تیری لاش ہی یہاں ملے گی۔" فاروق دادا نے ہاتھ

اٹھا کر یوں اشارہ کیا جیسے وہ اپنے کسی آدمی کو اشارہ کر رہا ہو۔

پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس سڑک کی مخالف سمت میں موڑ لی جدھر اس نے اپنے آدمیوں کی موجودگی کا اشارہ کیا تھا۔ وہ لوگ یقیناً وہاں کھڑے ہوں گے۔

فاروق دادا نے گاڑی آندھی طوفان کی طرح دوڑائی اور پندرہ' بیس منٹ بعد ایک وسیع و عریض بنگلے کے دروازے پر رک کر ہارن دیا۔

''فاروق دادا! آپ......''

''تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے فاروق بھائی کہا تھا نا؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے فاروق بھائی ہی کہو۔''

اس وقت بنگلے کا مین گیٹ کھلا اور فاروق بھائی نے گاڑی اندر لے جا کر پورچ میں کھڑی کر دی۔ ''یہ پورچ لاؤنج' کچن' ورانڈہ' پورٹیکو' انیکسی وغیرہ کے الفاظ تو میں نے بہت بعد میں سیکھے تھے۔ اُس وقت تو میں کچن کو باورچی خانہ کہتا تھا اور باتھ روم کو غسل خانہ۔'' ہاشم ہنس کر بولا۔

فاروق بھائی نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں گاڑی سے اترا تو وہ بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔ برآمدے میں ایک لمبا تڑنگا چوکیدار نما شخص موجود تھا۔ فاروق بھائی نے اس سے کہا۔ ''بہادر خان! اس گاڑی کی چھت پر گولی کا نشان ہے' اسے ابھی لے جا کر صحیح کراؤ۔''

''جی صاحب......!'' بہادر خان نے کہا پھر وہ جھجک کر بولا۔ ''خیر تو ہے صاحب......! کیا آپ کا کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔''

فاروق بھائی نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ گڑبڑا گیا اور جلدی سے گاڑی کی چابی فاروق بھائی کے ہاتھ سے لے لی۔

میں ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو اس کی سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایسا سجا سجایا اور خوب صورت ڈرائنگ روم تو میں نے فلموں میں ہی دیکھا تھا بلکہ فلموں میں بھی اتنے خوب صورت ڈرائنگ روم نہیں ہوں گے۔

دیوار پر سامنے ہی خوب صورت فریم میں ایک سینری لگی تھی۔ بائیں جانب کسی شخص کی تصویر تھی۔ اس تصویر والے کی شخصیت بھی بہت شان دار تھی۔

فاروق بھائی نے بتایا۔ ''یہ میرے والد ہیں۔ اب سے پانچ سال پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اور والدہ؟'' میں نے پوچھا۔

''والدہ تو میرے بچپن ہی میں انتقال کر گئی تھیں۔ ان کی میں نے صرف تصویریں ہی دیکھی ہیں۔''

اچانک ایک لڑکے کی تصویر دیکھ کر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس لڑکے کے چہرے کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے پھر اچانک مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا' اس تصویر میں تو میری مشابہت تھی' اس کے بال' آنکھیں اور چہرے کی بناوٹ بالکل میری طرح تھی۔ وہ میرا ہم شکل تو نہیں تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا ہی بھائی ہو۔

''یہ انور ہے۔'' فاروق بھائی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''میرا چھوٹا بھائی! میں اسے خود سے بڑھ کر چاہتا



تھا۔''

''یہ بھی آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' فاروق بھائی کی آواز بھرا گئی۔ ''یہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گیا ہے۔'' فاروق دادا نے کہا۔ ''اس نے پچھلے سال خودکشی کر لی تھی......''

''خودکشی......؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں' غلطی میری تھی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھے اس غلطی کی اتنی کڑی سزا دے گا؟'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''فاروق بھائی......! مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ افسردہ ہو گئے۔''

''ارے نہیں۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔ ''یہ انور تو بہت ہی بے وفا نکلا ہے ہاشم......! یہ تو مجھے زندگی بھر رلائے گا۔''

''مجھے معلوم ہے فاروق بھائی کہ اپنے جب اس دنیا سے چلے جاتے ہیں تو ان کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ ابھی چار دن پہلے تو میرے والد کا انتقال ہوا ہے۔''

''ہاں' تم نے بتایا تو تھا۔'' فاروق بھائی نے کہا۔ ''لیکن مجھے ایک بات بتاؤ' تم میں اتنی ہمت اور جرأت کیسے آ گئی؟ تم نے لڑنا بھڑنا کہاں سے سیکھا ہے؟''

''ہمت اور جرأت تو مجھ میں ہمیشہ تھی۔ میں نے آج تک کسی کی ناجائز بات برداشت نہیں کی۔ ہاں' میری غلطی ہو گی تو میں سو دفعہ معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ لڑنا بھڑنا بھی میں نے کہیں سے سیکھا نہیں ہے' یہ بھی کوئی سیکھنے کی چیز ہے؟ اسکول کے زمانے میں اکثر میری لڑائی ہو جاتی تھی پھر میں یہ نہیں دیکھتا تھا کہ مجھ سے لڑنے والا میرے برابر ہے یا مجھ سے بڑا ہے' میں بھڑ جاتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا' یہ مجھے زخمی کر دے گا' میرے جسم کی کوئی ہڈی توڑ دے گا یا میری جان لے لے گا لیکن اتنے لڑکوں کے سامنے اس نے مجھے گالی دی ہے' اب اگر میں اس سے ڈر جاؤں گا تو لڑکے میرا مذاق اڑائیں گے۔''

''تمہاری عادتیں اور مزاج بھی انور والا ہے۔'' فاروق بھائی نے کہا۔

''فاروق بھائی......! اب مجھے اجازت دیجیے' گھر میں اماں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''یار' تم تو بہت خوش نصیب ہو' تمہاری تو اماں بھی ہیں اور بہن بھائی بھی۔'' فاروق بھائی نے ہنس کر کہا۔ میں انہیں اپنے بھائی اور بہن کے بارے میں بتا چکا تھا۔ ''ایک میں ہوں' نہ ماں ہے' نہ باپ۔ ایک بھائی تھا' اب وہ بھی نہیں رہا۔''

''فاروق بھائی! کیا آپ مجھے اپنا بھائی نہیں سمجھتے؟'' میں نے کہا۔

''بھائی سمجھ کر ہی تو تمہیں یہاں لایا ہوں ورنہ مارکیٹ میں کس کی جرأت ہے کہ وہ فاروق دادا کے آدمیوں کو انکار کرے۔ میں تو تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ تم نے میرے دو بہترین آدمیوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ تم نے دیکھا تھا' مارکیٹ میں لوگ مجھے دیکھ کر کتنے خوف زدہ ہو گئے تھے؟''

''ہاں' میں نے دیکھا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یقین مانیے' آپ کو دیکھ کر تو زندگی میں پہلی دفعہ میں بھی خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اگر آپ مجھے مارتے تو شاید میرا ہاتھ آپ پر نہ اٹھتا۔ آپ کی شخصیت میں کچھ ایسی ہی بات

ہے۔''
فاروق بھائی نے مجھے سینے سے لگالیا اور بولے۔ ''ہاشم......! آج کے بعد تم انور کی جگہ ہو۔ ہمیشہ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھنا۔'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''ہاں' اب میں تمہیں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔''

''لیکن فاروق بھائی! وہ......''

''تمہاری اماں جانتی ہیں کہ تم دکان بند کر کے ہی آؤ گے۔ ابھی دکانوں کے بند ہونے میں بھی دو گھنٹے باقی ہیں۔''

پھر ہاشم ہنس کر بولا۔ ''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ اپنی داستان لے کر بیٹھ گیا' بس ماضی کی باتیں جب ذہن میں آتی ہیں تو پھر زبان پر قابو نہیں رہتا خاص طور پہ جیسے آپ لوگوں جیسا کوئی ہمدرد بھائی مل جائے۔''

میں نے فاروق بھائی کو بھائی کہا تھا اس لیے انہیں دوبارہ دادا سے بھائی بنادیا۔ اس کے لیے مجھے زیادہ جتن نہیں کرنا پڑے' انہیں مجھ میں اپنے بھائی کی جھلک نظر آتی تھی۔ میں اُن سے کوئی بھی بات کہتا تھا' وہ تھوڑی سی بحث کے بعد مان لیتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تمام ناجائز کام چھوڑ دیں۔ انہوں نے سختی سے انکار کردیا۔ میں دو دن ان سے روٹھا رہا۔

آخر تیسرے دن وہ میرے پاس آئے اور بولے۔ ''ہاشم! یہ تو سوچ کہ اگر میں یہ سب کچھ چھوڑ دوں گا تو کھاؤں گا کہاں سے؟''

''فاروق بھائی......! رزق دینے والا تو اللہ ہے۔ پھر آپ صحت مند ہیں' جوان ہیں' محنت کر سکتے ہیں تو آپ اس کی فکر کیوں کرتے ہیں؟''

''لیکن میں کروں گا کیا؟'' انہوں نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''آپ میرے ساتھ برتنوں کے کاروبار میں شریک ہو جائیں' اس کام میں اچھا خاصا منافع ہے۔''

''پھر ایسا کرتے ہیں کہ ہم برتنوں کا کاروبار بڑے پیمانے پر شروع کرتے ہیں۔ میں کسی اچھے علاقے میں کوئی بڑی دکان دیکھتا ہوں پھر اس میں ان برتنوں کے ساتھ ہم چینی اور شیشے کے امپورٹڈ سیٹ بھی رکھیں گے۔''

''چلیے' مجھے منظور ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن میری ایک شرط ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اس کے لیے تو میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سوچ لے ہاشم......!'' فاروق بھائی نے کہا۔

''ارے' عمل کرنے والے سوچا نہیں کرتے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر سن۔'' انہوں نے کہا۔ ''تو میٹرک تو کر چکا ہے' اب کسی کالج میں ایڈمیشن لے لے۔ دکان پر میں بیٹھوں گا۔''

''لیکن فاروق بھائی! ......میں......''

''اب لیکن ویکن مت کر۔'' فاروق بھائی نے کہا۔ ''اگر میری شرط منظور ہے تو بتا؟''

''میں پہلے اماں سے تو بات کرلوں۔'' میں نے کہا۔

''اماں سے میں خود بات کرلوں گا۔'' فاروق بھائی نے کہا۔ وہ اب ہمارے گھر بھی آنے جانے لگے تھے اور



اماں سے بھی بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ اماں بھی بیٹوں ہی کی طرح ان کا خیال رکھتی تھیں۔ وسیم اور سعدیہ تو ان کے آگے پیچھے گھومتے تھے۔

انہوں نے اماں سے بات کی اور دلائل دے کر اماں کو منالیا پھر انہوں نے جوڑیا بازار میں برتنوں کی ایک بہت بڑی دکان کھول لی اور وہاں دنیا بھر کے امپورٹڈ برتن جمع کر لیے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی فاروق بھائی ہیں جن کے نام سے لوگ دہشت کھاتے تھے۔

میں نے اس دوران میں بی اے کرلیا۔ اماں کی کوشش تھی کہ فاروق بھائی کی شادی کرادیں۔ وہ ان کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی تھیں لیکن فاروق بھائی کے لاکھ اصرار کے باوجود اماں نے اپنا پرانا مکان نہیں چھوڑا تھا۔

میرے بی اے کا نتیجہ آچکا تھا اور میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو چکا تھا۔ اب میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ کاروبار میں پوری طرح فاروق بھائی کا ہاتھ بٹاؤں۔

اس دن میں دکان پر جانے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ اماں چکر کھا کر گر پڑیں۔

میں نے جھپٹ کر اماں کو اٹھایا۔ وسیم اور سعدیہ اسکول گئے ہوئے تھے۔ اس وقت گھر میں صرف میں تھا۔

اماں گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔ ان کا چہرہ پسینے میں تر ہو رہا تھا۔

میری آنکھوں میں وہی منظر گھوم گیا جب ابا کی ایسی حالت ہوئی تھی۔ میں نے اماں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور انہیں فوراً اسپتال لے گیا۔ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور وہ آئی سی یو میں تھیں۔ میں نے اسپتال ہی سے فاروق بھائی کو ٹیلی فون کردیا۔ وہ فوراً بھاگے بھاگے اسپتال پہنچے اور ڈاکٹروں سے بات کی۔

ڈاکٹر نے جواب دیا کہ مریضہ کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر آئندہ بارہ گھنٹے خیریت سے گزر گئے تو ان کی زندگی کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ ہم لوگ پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آپ لوگ بھی دُعا کریں۔

لیکن ڈاکٹروں کی کوششیں اور ہماری دُعائیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ اماں نے دو گھنٹے بعد ہی ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔

اماں کے انتقال پر فاروق بھائی یوں بلک بلک کر روئے جیسے اُن کی سگی ماں کا انتقال ہو گیا ہو پھر انہوں نے فوراً خود پر قابو پالیا اور مجھے' وسیم اور سعدیہ کو دلاسہ دینے لگے۔

اماں کے بعد فاروق بھائی ہمیں اپنے ساتھ ڈیفنس لے آئے۔ کچھ دن بعد زندگی پھر پرانی ڈگر پر چل نکلی۔

فاروق بھائی کو خود سے زیادہ میری شادی کی فکر تھی۔ وسیم ان دنوں سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا اور سعدیہ نے میٹرک کرلیا تھا۔

اُن ہی دنوں سعدیہ کے لیے ایک اچھے اور شریف خاندان کا رشتہ آ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اتنی کم سنی میں اُس کی شادی کردوں لیکن فاروق بھائی نے زور دیا کہ رشتہ اچھا ہے' ہمیں فوراً سعدیہ کی شادی کردینا چاہیے۔

''لیکن فاروق بھائی! لڑکا کینیڈا میں ہے۔ سعدیہ تو مجھ سے رخصت ہو کر بہت دور چلی جائے گی؟'' میں نے کہا۔

''یار' بہنیں نزدیک ہوں یا دور' وہ ہوتی تو پرائی ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑے گا کہ سعدیہ کینیڈا چلی جائے گی؟ میں اسے ہر سال پاکستان بلاؤں گا یا ہم لوگ کینیڈا چلے جایا کریں گے۔''

فاروق بھائی نے مجھے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا اور بہت دھوم دھام سے سعدیہ کی شادی کر دی۔

اس کے جانے کے بعد گھر بہت سونا سونا ہو گیا۔ اب میں نے فاروق بھائی پر زور دیا کہ آپ شادی کر لیں تا کہ بھابی کے آنے کے بعد سعدیہ کی کمی پوری ہو سکے۔

وہ بھی راضی ہو گئے اور ہنس کر بولے۔ ”یار! میرے لیے کوئی لڑکی تو دیکھو۔ اماں زندہ تھیں تو وہ کتنی شد و مد سے میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی تھیں۔“

”پڑوس میں آنٹی صفیہ رہتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے سعدیہ سے اکثر آپ کی شادی کا تذکرہ کیا تھا۔ ان کی کوئی بھانجی ہے۔ بہت سلجھی ہوئی اور اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ آپ کہیں تو میں ان سے بات کروں؟“

”میاں! شرافت، اعلیٰ تعلیم اور خاندان اپنی جگہ۔“ فاروق بھائی نے کہا۔ ”یہ بتاؤ، وہ خوبصورت بھی ہے؟“

”میں نے انہیں دیکھا تو نہیں ہے لیکن صفیہ آنٹی بتا رہی تھیں اور سعدیہ بھی کہتی تھی کہ سائرہ باجی بہت حسین ہیں۔“

”یار! میری ایک شرط ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”لڑکی کو ایک نظر دکھا دو پھر میں کوئی فیصلہ کروں گا۔“

میں نے صفیہ آنٹی سے بات کی۔ وہ آزاد خیال لوگ تھے۔ سائرہ بھابی کونوینٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک دن سائرہ باجی کو اپنے گھر بلا لیا اور ہم دونوں کو بھی ڈنر کی دعوت دے ڈالی۔

سائرہ باجی واقعی حسین تھیں۔ فاروق بھائی تو پہلی ہی نظر میں ان پہ عاشق ہو گئے۔ شادی کی تاریخ بھی آناً فاناً طے کر لی گئی۔

شادی سے ایک دن پہلے عجیب واقعہ ہوا۔ سائرہ باجی کا ایک کزن ہمارے گھر آیا اور بولا۔ ”فاروق کہاں ہے، مجھے اس سے بات کرنا ہے۔“

اس کی آواز سن کر فاروق بھائی بھی اپنے کمرے سے نکل آئے اور بولے۔ ”کیا بات ہے، کون ہیں آپ؟“

”میں سائرہ کا کزن ہوں۔“ اس نے نخوت سے کہا۔

”ارے، تو تشریف رکھیے، آپ کھڑے کیوں ہیں؟“ فاروق بھائی نے کہا۔

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔“ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تم نے سائرہ سے شادی کرنے کی جرأت کیسے کی؟“

”کیا مطلب؟“ فاروق بھائی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”سائرہ کیا کسی کی میراث ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے کوئی جرأت کی جائے؟“

”ہاں، وہ میری ملکیت ہے، میری زندگی میں وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“

”اب تو وہ میری ہو چکی ہے۔“ فاروق بھائی نے کہا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”میری بات غور سے سن......“ وہ تم سے تو پر آ گیا۔ ”اس شادی سے فوراً انکار کر دے......“

”کیا نام ہے تیرا؟“ فاروق بھائی نے بھی اسی کے لہجے میں پوچھا۔



”میرا نام خالد ہے۔“ وہ یوں بولا جیسے امریکا کا صدر ہو۔

”تو خالد! ایک بات میری بھی سن لے۔“ فاروق بھائی نے کہا۔ ”اب تو یہ میری عزت کا سوال ہے، تجھے اگر سائرہ سے شادی ہی کرنا تھی تو اب تک کہاں مرا ہوا تھا؟“

”تو شاید مجھے جانتا نہیں ہے؟“ خالد غرا کر بولا۔ ”میں تجھے ایسا غائب کراؤں گا کہ تیری لاش بھی نہیں ملے گی......“

”بس بہت ہو گیا......“ میں نے بپھر کر کہا۔ ”کھڑا ہو جا اور نکل یہاں سے......“

”تو جانتا ہے تو کس سے بات کر رہا ہے؟“ اس نے غرا کر کہا۔

میں نے اچانک اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔ ”میں ابھی تک صرف یہ خیال کر رہا تھا کہ تو سائرہ کا کزن ہے اور عمر میں مجھ سے بڑا ہے لیکن کوئی میرے بھائی کی توہین کرے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ ”دفع ہو یہاں سے......“

اس نے ایک دم جیب سے ریوالور نکال لیا۔ فاروق بھائی کے ہاتھ میں اس وقت چائے کا مگ تھا، وہ چائے پیتے ہوئے ہی باہر آئے تھے۔ انہوں نے برق رفتاری سے چائے کا مگ اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

وہ کربناک انداز میں چیخا۔ میں نے آگے بڑھ کر ریوالور اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور ایک اور تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ ”نکل یہاں سے ورنہ تو یہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔“

اس کا چہرہ اور آنکھیں چائے سے جل گئی تھیں۔ وہ تو غنیمت ہے کہ چائے زیادہ گرم نہیں تھی ورنہ وہ اندھا ہو جاتا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا کیونکہ چائے کا وہ مگ خاصا بھاری تھا۔

وہ بکتا جھکتا وہاں سے چلا گیا۔

فوراً ہی صفیہ آنٹی ہمارے گھر آ گئیں اور بولیں۔ ”خالد کو کس نے مارا ہے؟“

”میں نے مارا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ فاروق بھائی کو گالیاں دے رہا تھا۔“

”یہ تم نے کیا غضب کر دیا، وہ اچھا آدمی نہیں ہے، شہر کے بدمعاشوں سے اس کے تعلقات ہیں اور وہ خود بھی بہت بڑا غنڈہ ہے اسی لیے تو سائرہ کی شادی ہم نے اس سے نہیں کی۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ فاروق بھائی نے کہا۔ ”اگر وہ غنڈہ ہے تو آج کے بعد ساری غنڈہ گردی بھول جائے گا۔“

آدھے ہی گھنٹے بعد ہمارے گیٹ کے سامنے دو جیپیں آ کر رکیں۔ خالد اپنے ساتھ چند غنڈوں کو لے کر آیا تھا۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ وہ سائرہ کو بھی اٹھا لایا تھا۔

اس نے چیخ کر کہا۔ ”فاروق......! میں ابھی اور اسی وقت تیرے سامنے سائرہ سے نکاح کروں گا اور اسے یہاں سے لے جاؤں گا تو مجھے روک سکتا ہے تو روک لے......“

”تو تو بہت بڑا غنڈہ ہے۔“ فاروق بھائی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس کے باوجود اپنے ساتھ اتنے آدمی لے کر آیا ہے؟ تو اگر واقعی مرد ہے تو مجھ سے اکیلے مقابلہ کر لے، اس کا فیصلہ ہم دونوں میں سے کسی کی موت پر ہو گا یا تو میں مر جاؤں گا یا پھر تو نہیں رہے گا......“

”اچھا؟“ خالد نے مضحکہ خیز لہجے میں پوچھا۔ ”اگر تجھے میرے ہی ہاتھوں مرنے کا شوق ہے تو پھر مجھے کیا

اعتراض ہو سکتا ہے۔"

سائرہ باجی نے چیخ کر کہا۔"فاروق......!اس کی باتوں میں مت آؤ' یہ بہت کمینہ آدمی ہے۔"

"تو خاموش رہ......" خالد نے انہیں بری طرح جھڑک دیا۔"اب میں اس کی موت کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور فاروق بھائی کی گردن پکڑنا چاہی لیکن اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ جس آدمی پر وہ ہاتھ ڈال رہا ہے' وہ کسی زمانے میں دہشت کی علامت تھا۔

فاروق بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔"میں تجھے آخری موقع دے رہا ہوں۔"

اس نے جواب میں دوسرے ہاتھ سے فاروق بھائی کو تھپڑ مارنے کی کوشش کی۔ فاروق بھائی نے اس کی دوسری کلائی بھی پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچ کر اس کی ناک پر زوردار ٹکر ماری' اس ضرب سے وہ حواس باختہ ہو گیا۔ فاروق بھائی نے بائیں ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور دائیں ہاتھ سے اس کی تھوڑی پکڑ لی۔

میں نے چیخ کر انہیں روکنا چاہا لیکن اس وقت تک وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ انہوں نے اس کی تھوڑی پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ چٹاخ کی آواز گونجی اور خالد فرش پہ گر کر تڑپنے لگا۔

اس کے ساتھیوں نے اچانک ریوالورز نکال لیے۔ فاروق بھائی کے ساتھ ساتھ میں بھی فرش پر گر گیا پھر فاروق بھائی نے پلک جھپکنے میں نہ جانے کہاں سے ریوالور نکالا اور انتہائی برق رفتاری سے ان لوگوں پر فائر کر دیئے۔ خالد سمیت وہ پانچ آدمی تھے۔ خالد تو پہلے ہی مر چکا تھا' فاروق بھائی نے اس کے چاروں ساتھیوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔

سائرہ باجی مسلسل ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھیں۔ فائرنگ کی آواز سن کر صفیہ آنٹی اور ارد گرد کے دو پڑوسی اور آ گئے۔

کسی نے پولیس کو خبر کر دی۔ پولیس نے فاروق بھائی کو گرفتار کر لیا پھر دو سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ میں نے اچھے سے اچھا وکیل کیا' پانی کی طرح پیسہ بہایا اور کراچی کے قابل ترین وکیلوں نے اپنی پوری صلاحیتوں کو خرچ کر کے فاروق بھائی کو بچا لیا۔ عدالت نے اسے سیلف ڈیفنس کا حق دیتے ہوئے فاروق بھائی کو بری کر دیا۔

وکیلوں نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ خالد اور اس کے ساتھی ڈکیتی کی نیت سے گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت فاروق بھائی کی منگیتر سائرہ بھی موجود تھی۔ ان لوگوں نے گن پوائنٹ پر پہلے کیش کا مطالبہ کیا پھر سائرہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ فاروق اور اس کے کزن کی مداخلت پر ان لوگوں نے فائرنگ کر دی جس کے جواب میں فاروق نے بھی فائرنگ کی اور وہ لوگ مارے گئے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق خالد گردن ٹوٹنے سے ہلاک ہوا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور پھسل کر سیڑھیوں پر گر گیا تھا۔

فاروق بھائی بری ہو کر کورٹ سے باہر نکلے تو خالد کے ساتھیوں نے ان پر کلاشن کوف کے دو برسٹ مارے اور کورٹ کے احاطے ہی میں ہلاک کر دیا۔ ان لوگوں نے تو ہاشم کو مارنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ بچ گیا۔

فاروق بھائی کی موت میرے لیے بہت بڑا سانحہ تھی۔ میں تو دنیا سے بالکل کٹ کر ہی رہ گیا تھا۔ میں نے دکان پر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ میرا دل دنیا ہی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا کہ اب تم ہی دکان پر جایا کرو۔ وسیم پہلے بھی میرے ساتھ دکان پر جایا کرتا تھا اس لیے اسے کاروبار کا تھوڑا بہت تجربہ تھا۔



ایک دن میں اپنے بیڈروم میں پڑا ہوا تھا کہ سائرہ باجی اچانک ہمارے گھر آ گئیں۔ وہ بھی اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ رونے لگیں۔ میرے آنسو بھی بہنے لگے پھر سائرہ باجی نے سنبھل کر کہا۔"ہاشم......! تم ایسے کب تک دنیا سے کنارہ کیے پڑے رہو گے؟ مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا۔ مجھے دیکھو' کیا میں مر گئی؟"

میں ان سے کہنے والا تھا کہ آپ تو ابھی کچھ عرصے سے فاروق بھائی کو جانتی تھیں' میں تو انہیں برسوں سے جانتا تھا۔ وہ میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔

ان کے سمجھانے بجھانے پر اور وسیم کے مستقبل کی خاطر میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ کل سے میں کاروبار میں دلچسپی لینے کی کوشش کروں گا۔

انہوں نے زبردستی مجھے شیو کرنے کو کہا' میرے لیے بہترین کپڑے نکالے' پرفیوم نکالا اور مجھے تاکید کی کہ کل سے تم مجھے پہلے والے ہاشم کی طرح نظر آنا ورنہ میں بھی تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔

فاروق بھائی کی موت پر سعدیہ نے بھی آنے کی کوشش کی تھی لیکن آ نہیں سکی تھی۔ میں نے اسے منع کر دیا کہ آخر وہ آ کر کرتی بھی کیا۔

دوسرے دن میں دکان پر پہنچا تو سائرہ باجی کی تاکید کے مطابق خاصا ہشاش بشاش تھا۔ میں تھوڑی دیر دکان پر بیٹھ کر گاڑی لے کر گھر سے نکل گیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج تاریخ اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر دہرائے گی۔

وسیم سے کچھ لوگ بھتہ لینے آئے اور اسے بھتے کی پرچی دے کر چلے گئے۔ وسیم کے انکار پر انہوں نے اسے گالیاں دیں اور ان میں سے ایک کو تو اس نے بری طرح پیٹ کر بھی رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ باقاعدہ تیاری کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ کر وہاں آئے۔

عین اسی وقت میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ ان میں سے ایک نے وسیم کا نشانہ لے کر اس پر فائر کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ میں نے اسے فائر کر کے ڈھیر کر دیا تھا۔ میں فاروق بھائی کے قتل کے بعد ریوالور رکھنے لگا تھا۔ وسیم نے بھی دو آدمیوں کو مار گرایا۔ وہاں ایک دم ہنگامہ شروع ہو گیا۔ ہمارے ہاتھوں تین آدمی ہلاک ہوئے تھے۔ میں نے وسیم کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

وہ بہت مضبوط گروپ تھا۔ ہم ان کے خوف سے ایک شہر سے دوسرے شہر بھاگتے رہے۔ ان لوگوں نے ہمارے کاروبار پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور بنگلے پر بھی۔ ان کی پشت پناہی ایک مرکزی وزیر اور سینیٹر کر رہا تھا۔

ایسے میں مجھے مشہدی کا ایک آدمی ٹکرایا اور وہ مجھے مشہدی کے پاس لے گیا۔ مشہدی بھی بہت رسوخ والا آدمی تھا' اس نے نہ صرف مجھے اور وسیم کو پناہ دی بلکہ ہمارا کاروبار اور بنگلا بھی واپس دلایا اور ہم سے کام بھی لیتا رہا۔ اب میں اچھے برے کی تمیز کھو چکا تھا۔ میں نے اچھے لوگوں کا انجام بھی دیکھ لیا تھا اس لیے مجھے اچھا بننے کی خواہش بھی نہیں تھی۔ میں نے نادانستگی میں وسیم کو بھی جرم کی ان ہی کالی راہوں پر دھکیل دیا۔

آگے کی کہانی تو آپ کو معلوم ہی ہے' مشہدی مجھ سے زیادہ وسیم پر اعتبار کرتا تھا پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے بھائی کو ہلاک کر دیا۔"

ہاشم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”اب دنیا میں صرف سعدیہ اور سائرہ باجی کے علاوہ میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ سائرہ باجی کی بھی شادی ہو چکی ہے'ان کے شوہر نے بھی خالد کے آدمیوں کے خوف سے لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ سعدیہ کو تو وسیم کی موت کا بھی علم نہیں ہے۔

•......•......•......•

اس کی داستان سن کر میرا دل بھی خون کے آنسو رونے لگا۔

ہم سبھی کی تقریباً ایک ہی کہانی تھی۔ سبھی کسی نہ کسی طرح مشہدی کے ڈسے ہوئے تھے۔

میں نے اپنے بنگلے کی دیوار خاصی بلند کر لی تھی اور اس پہ خاردار تار بھی لگا دیئے تھے۔ تیمور تو چاہتا تھا کہ ان خاردار تاروں میں بجلی کا کرنٹ بھی ہو۔ اس نے اصرار کر کے ان تاروں میں کرنٹ کا بندوبست بھی کر دیا۔ رات کو نعیم کے کتے بھی چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ ہم لوگ ان کتوں سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیمور اور میں تو زیادہ وقت کتوں کے ساتھ ہی گزارتے تھے۔ ہم لوگ انہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاتے تھے۔ چند ہی دن میں وہ خوں خوار اور خوف ناک کتے ہم سے مانوس ہو گئے۔ گیٹ پر جو گارڈ تھے' وہ ان سے زیادہ مانوس تو نہیں تھے لیکن انہیں پہچانتے تھے۔ ارسلان' عدنان' ہاشم اور گھر کے دیگر ملازم کتوں سے دور ہی رہتے تھے۔ اب مجھے عدنان کی فکر تھی' وہ امریکا چلا جاتا تو میں یکسو ہو کر مشہدی سے نمٹ سکتا تھا۔

اس دن ہم ناشتے کے بعد بیٹھے ہی تھے کہ دفتر سے جی ایم صاحب کا ٹیلی فون آ گیا۔ وہ کسی معاملے میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”آپ اس ادارے میں اتنے سینئر ہیں' آپ کو میرے مشورے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ جو مناسب سمجھیں' کریں' مجھے آپ پر اعتبار ہے۔“

اچانک پھر میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیل فون پر مشہدی کا نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو۔“ میں نے کہا۔

”عمران......! لگتا ہے' تمہیں اپنی بہن سے بالکل محبت نہیں تھی؟“

”مجھے اس سے کتنی محبت تھی' یہ بات تو میں اس وقت بتاؤں گا جب تم سے سامنا ہوگا۔ تم نے اس کی جان لے کر اچھا نہیں کیا۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں ایک اہم بات بتاؤں؟“ مشہدی نے کہا۔ ”تمہاری بہن ابھی زندہ ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”یہ تمہاری کوئی نئی چال ہے؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”اب میں تمہاری کسی چال میں آنا نہیں چاہتا۔“

”تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ تمہاری بہن زندہ ہے؟“ مشہدی نے پوچھا۔

”مجھے تو اب تمہاری کسی بھی بات پر یقین نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جن پر اعتبار کیا جا سکتا ہو۔ وقت پڑنے پر تم اپنی ماں اور بہن کو بھی بیچ سکتے ہو۔“

”عمران!“ مشہدی نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اپنی زبان کو لگام دو' تم میری نرمی سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہو۔“

”میں تم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے مجھے ٹیلی فون کیوں کیا ہے؟ اب اگر تم میں ذرا سی مردانگی اور غیرت ہے تو میرے سامنے آ کر بات کرو پھر میں دیکھوں گا کہ تم کتنے بڑے بین الاقوامی بدمعاش ہو۔“

”وہ تو خیر' تم دیکھ ہی رہے ہو۔ تم مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے تو نہ کرو لیکن اپنی بہن سے تو بات کرو۔“

”سنو حرام زادے......“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ ”میں اب تمہاری کسی چال میں نہیں آنے والا۔ تم سے کچھ بعید نہیں کہ تم نے اس کی آواز ریکارڈ کر لی ہو اور وہی مجھے سنوا دو۔“

”میرے خیال میں تم اتنے احمق تو نہیں ہو کہ ریکارڈنگ میں اور اصل آواز میں فرق محسوس نہ کرو۔ تم اپنی بہن سے کھل کر بات کر سکتے ہو۔ ریکارڈنگ میں تو یہ ممکن نہیں ہے نا؟“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”تم پہلے شائستہ سے بات کر لو پھر میں تم سے بات کروں گا۔“

دوسرے ہی لمحے مجھے سیل فون پر شائستہ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو بھیا......!“

”شائستہ......! تو ٹھیک تو ہے گڑیا؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں بھیا......! ابھی تک تو میں ٹھیک ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہے لیکن مشہدی اکثر مجھے دھمکیاں دیتا رہتا ہے کہ اگر تمہارے بھائی نے میری بات نہ مانی تو میں تمہیں بہت سفاک انداز میں قتل کر دوں گا اور تمہاری لاش تمہارے بھائی کے گھر کے سامنے پھنکوا دوں گا۔“

”اس نے تو پہلے بھی مجھ سے یہ کہا تھا کہ تمہاری بہن نے خودکشی کر لی۔“

”ہاں' اس نے مجھے بتایا تھا۔“ شائستہ نے کہا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟“

”یہیں ہے اور آپ کی باتیں بھی سن رہا ہے۔ بھیا......! پلیز' مجھے اس قید سے رہائی دلوا دیں۔ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔“

”میں کوشش تو کر رہا ہوں گڑیا......!“ میں نے کہا۔ ”تو فکر مت کر' میں تجھے جلد ہی وہاں سے نکال لوں گا۔“

”ہاں عمران......!“ مجھے مشہدی کی مکروہ آواز سنائی دی۔ اس نے شاید شائستہ سے سیل فون چھین لیا تھا۔ ”اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ تمہاری بہن زندہ ہے؟“ اس نے مکروہ انداز میں ہنس کر کہا۔

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ میں نے کہا۔ ”میری تم سے کیا دشمنی ہے؟“

”سب سے بڑی دشمنی تو یہ ہے کہ تم عبداللہ کے ساتھ مل گئے تھے۔“

”لیکن اب تو عبداللہ نہیں رہا' اب کیا پرابلم ہے؟“

”ہاں لیکن تم تو موجود ہو۔ تم میرے ساتھ کام کرو۔ میں تمہاری بہن کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟“ میں نے کہا۔ ”میں تو ایک سیدھا سادہ بزنس مین ہوں۔ اپنا کاروبار چلانے کے بعد وقت ہی کب ملتا ہے کہ میں کچھ اور سوچوں۔“

”ارسلان اور تیمور میں بہت دوستی ہے؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن تیمور کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے۔ وہ تو خود تم سے چھپتا پھر رہا ہے۔“

"بکواس کرتے ہو تم؟" مشہدی اتنے زور سے چیخا کہ میرے کان میں جھنجھناہٹ ہونے لگی۔ "تیمور روز ہی تمہارے گھر پر آتا ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے یہاں دن کو بھی ہر بات کی خبر رہتی ہے۔" اس نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "تم کب آفس جاتے ہو' کب آتے ہو' کس راستے سے جاتے ہو' مجھے سب معلوم ہے۔"

مجھے اس پہ ہنسی آئی۔ وہ مجھ سے بلف کر رہا تھا۔ میں تو گزشتہ ایک مہینے سے آفس گیا ہی نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں کس راستے سے آفس جاتا ہوں۔

"اب ذرا مطلب کی بات کرلو۔ مجھے ابھی آفس جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم تیمور سے معلوم کرو کہ وہ فائل کہاں ہے؟" مشہدی نے کہا۔ "مجھے اس فائل کی شدید ضرورت ہے۔"

"تیمور میرا ملازم تو نہیں ہے۔ اگر اس نے بتانے سے انکار کردیا تو میں اس پر تشدد تو نہیں کرسکتا؟ پھر وہ کئی دفعہ بتا چکا ہے کہ فائل کا علم اسے خود بھی نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے خود بھی کسی کو بتایا ہے کہ وہ فائل اس کے پاس ہے۔"

"اس نے بتایا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کسے بتایا ہے؟"

"کسی ایرے غیرے کو نہیں بلکہ ایک ذمے دار آدمی کو بتایا ہے۔" مشہدی نے جواب دیا۔

"اور وہ ذمے دار آدمی کون ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ "تم شاید بابر خان کی بات کررہے ہو؟"

"بابر خان!" مشہدی نے حیرت سے کہا۔ "وہ عبداللہ کا رائٹ ہینڈ؟ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں بلکہ کل تو میں نے اس کے گھر پہ دھاوا بھی بولا تھا لیکن وہ کم بخت دوبارہ بچ نکلا۔"

"وہ تم جیسے آدمی سے بچ گیا؟" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تم ریٹائر ہوجاؤ۔ اب تم پر بڑھاپا طاری ہورہا ہے۔ بابر خان جیسا معمولی آدمی تم سے بچ نکلا۔ تمہارے مقابلے میں تو وہ معمولی ہی ہے؟"

"تم جانتے ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کئی بار کی ہے لیکن اس کا سیل فون آف ہے یا پھر اس نے سم ہی تبدیل کرلی ہے۔"

"ایک بات اچھی طرح سن لو' اگر مجھے وہ فائل نہ ملی تو میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔" اس نے درشت انداز میں کہا۔ "میں تمہیں صرف چوبیس گھنٹے کا نوٹس دے رہا ہوں۔"

"تم چوبیس سال کا نوٹس بھی دے دو تو میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکوں گا۔ مجھے تیمور کچھ بتائے گا تو میں بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میری بات کو مذاق مت سمجھو عمران......!" اس نے بپھر کر کہا۔ "تمہارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں' اس کے بعد تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟"

"چلو' یہ ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "تم میری ماں اور باپ کی جان تو پہلے ہی لے چکے ہو' میرے دوست کو مار چکے ہو' اب شاید تم مجھے بھی مار دو' میں مرنے سے نہیں ڈرتا اس لیے مجھے دھمکی مت دینا۔"

"اسے دھمکی مت سمجھنا۔" مشہدی نے کہا۔ "تمہارے پاس صرف اور صرف چوبیس گھنٹے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

ارسلان' تیمور اور ہاشم بہت غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے سیل فون کا اسپیکر آن نہیں کیا تھا۔

میں نے انہیں سب کچھ تفصیل سے بتادیا۔

"بھیا! اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔" تیمور نے کہا۔ "لیکن وہ فائل میں کہاں سے لاؤں؟"

"تم یاد کرنے کی کوشش تو کرو۔" میں نے تیمور سے کہا۔ "تمہارے والد اپنی چیزیں عموماً کہاں محفوظ رکھتے تھے؟"

"میں نے ایک ایک جگہ چھان ماری ہے بھیا!" تیمور نے کہا۔ "لیکن اس مردود کو یقین ہی نہیں آرہا ہے۔ وہ اتنا خبیث آدمی ہے کہ بابر خان سے بھی انجان بنا ہوا ہے۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا ہے کہ بابر خان ابھی تک اس کے خلاف کام کررہا ہے۔"

"ایک صورت ہوسکتی ہے۔" ہاشم نے کہا۔ "آپ مشہدی کو ٹیلی فون کریں اور کہیں کہ تمہارا ایک اہم آدمی ہاشم خان میرے قبضے میں ہے۔ تم اس فائل کو رو رہے ہو' میرے ہاتھ تو تمہاری ایک مائیکرو فلم بھی لگ گئی ہے' وہ فلم میں نے ہاشم خان سے چھینی ہے۔ اب تم اس مائیکرو فلم کے بدلے میں شائستہ کو رہا کردو تو اچھا ہے ورنہ چوبیس گھنٹے بعد وہ مائیکرو فلم میں حساس ادارے کے حوالے کردوں گا۔"

"آئیڈیا برا نہیں ہے' وہ ابھی تک یہ ہی سمجھ رہا ہوگا کہ ہاشم خان نے اس کے ساتھ غداری کی ہے جیسے وہ بابر خان کو اپنا دشمن بنا کر پیش کررہا ہے۔ آپ بھی ہاشم خان کو اس کے آدمی بنا کر پیش کریں۔"

"بلکہ بھیا......! آپ ابھی اس سے بات کرلیں۔"

میں نے دوبارہ مشہدی کا نمبر ملایا لیکن نمبر انگیج تھا۔ تھوڑی دیر بعد خود ہی اس کا ٹیلی فون آگیا اور وہ ہنس کر بولا۔ "ہاں عمران......! تم نے تیمور سے بہت جلدی معلوم کرلیا۔"

"تم اب اس فائل کو بھول جاؤ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اور ایک بات سن لو' تمہارا ایک اہم آدمی ہاشم خان میرے قبضے میں ہے۔"

"ہاشم خان...... تمہارے قبضے میں ہے؟" مشہدی نے حیرت سے کہا۔ "وہ تمہارے قبضے میں کیسے آگیا؟"

"جیسے ایک دن تم آؤ گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"خیر' مجھے ہاشم خان کی اتنی فکر نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "تم اسے مار دو یا ٹکڑے کردو لیکن وہ فائل مجھے ہر قیمت پر چاہیے۔"

"ہاشم خان کے پاس سے مجھے ایک ایسی مائیکرو فلم ملی ہے جو تمہیں تباہ کرکے رکھ دے گی۔ کم سے کم پاکستان میں تو تمہارا رہنا دوبھر ہوجائے گا۔ میں نے فلم ملک کے کسی حساس ادارے کے حوالے کردی تو وہ لوگ چن چن کر تمہارے آدمیوں کو ماریں گے کیونکہ اس فلم میں بہت کچھ ہے۔"

"میں تمہیں ابھی کال کرتا ہوں۔" مشہدی نے تشویش سے کہا۔

آخر میری چال کامیاب رہی تھی اور وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"اب وہ جا کر مائیکروفلم تلاش کرے گا۔" ہاشم خان نے ہنس کر کہا۔ "جب اسے فلم نہیں ملے گی تو وہ پہلے تو اپنے ایک دو آدمیوں کو موت کی نیند سلائے گا پھر آپ سے بات کرے گا۔ اسے شاید اب تک یہ علم ہی نہیں ہوا کہ مائیکروفلم غائب ہے۔"

تھوڑی دیر بعد پھر مشہدی کا ٹیلی فون آ گیا۔ اس کے لہجے میں ایک اضطراب تھا۔ وہ بولا۔ "عمران! دیکھو، تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ اگر تم نے اس مائیکروفلم کا تذکرہ بھی کسی سے کیا تو میں تمہارا نام و نشان مٹا دوں گا۔ میں خود تباہ و برباد ہونے سے پہلے تمہیں تباہ کر دوں گا' تمہارا کاروبار ختم کر دوں گا' تم فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

"تم نے پھر بکواس شروع کر دی۔" میں نے اس کی جھنجلاہٹ اور پریشانی سے مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں وہ مائیکروفلم تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں لیکن تم اس فائل کو بھول جاؤ' وہ فائل تیمور کے پاس نہیں ہے۔"

"چلو بھول جاتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "لیکن تم ہاشم خان اور مائیکروفلم کو میرے حوالے کر دو۔"

"اتنی بے صبری مت دکھاؤ یار......!" میں نے کہا۔ "تم پہلے شائستہ اور بابر خان کو میرے حوالے کر دو۔ میں جانتا ہوں کہ بابر خان ہی نے عبداللہ کو قتل کیا ہے اور آج کل تمہارے لیے کام کر رہا ہے۔"

"مجھے تمہاری یہ شرط بھی منظور ہے۔" مشہدی نے جلدی سے کہا۔ "شاید وہ مائیکروفلم اس کے لیے اتنی ہی اہم تھی کہ وہ میری ہر بات مانتا چلا جا رہا تھا۔

"تو پھر شائستہ اور بابر خان کو میرے حوالے کر دو اور وہ مائیکروفلم لے لو۔"

"اس ہاتھ دے' اس ہاتھ سے لے' والا معاملہ ہو گا۔" مشہدی نے کہا۔

"نہیں' ابھی کوئی بات نہیں ہو گی۔ تم پہلے ان دونوں کو میرے حوالے کرو گے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم ان کی رہائی کے بدلے مائیکروفلم میرے حوالے کر دو گے؟"

"کوئی گارنٹی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا پڑے گا اور میں تمہاری طرح جھوٹا نہیں ہوں۔ جو بات کہہ دیتا ہوں' اس پر قائم رہتا ہوں۔ تم نے مجھے چوبیس گھنٹے کا وقت دیا تھا لیکن میں تمہیں اڑتالیس گھنٹے کا وقت دے رہا ہوں اور تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب۔" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "اپنی گھڑی میں وقت دیکھ لو' اس وقت دس بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ اب سے ٹھیک اڑتالیس گھنٹے بعد وہ مائیکروفلم پاکستان کے ایک انتہائی اہم خفیہ ادارے کے پاس ہو گی۔" یہ کہہ کر میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

"یار تیمور......!" ارسلان نے کہا۔ "تمہیں کچھ یاد نہیں ہے کہ تمہارے والد اہم نوعیت کے کاغذات کہاں کہاں رکھتے تھے؟"

یہ پرتجسس، سنسنی خیز اور لرزہ خیز آپ بیتی ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں





تحریر: عطیہ ہدایت اللہ

# پتھر دل لوگ

شاداب صدیقی کا خیال

ایک سا ہو گیا موسمِ زندگی
فرق کوئی بہار و خزاں میں نہیں

**ایک پتھر دل محبوب کا قصہ' وہ اپنی محبت کو پرایا ہوتا نہ دیکھ سکا تھا**



میرے میاں اقبال واپڈا میں ایس ڈی او کے عہدے پر فائز ہیں۔ دو برس قبل جب ان کی ٹرانسفر اس بڑے سے گاؤں میں ہوئی تو میرے لیے شہر کے خوبصورت ماحول' گہما گہمی' رشتہ داروں' دوست احباب سمیت سب کچھ چھوڑ کر آنا کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز کی جگہ چھوٹی چھوٹی ہٹیاں' دو رویہ پکی صاف و ہموار سڑکوں کی جگہ مٹی دھول اڑاتے کچے راستے...... اس ماحول سے میرا جی اوبنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ذرا ذرا سی بات کا بہانہ بنا کر شہر بھاگ آئی تھی لیکن ہوٹل کا یا خود کا بنایا الٹا سیدھا کھانا کھا کھا کر جب اقبال تنگ آ گئے تو ایک دن انہوں نے غصے سے کہا۔

''تم یہاں خوش نہیں ہو تو وہاں شہر میں کرائے پر گھر لے دوں گا یا پھر والدین کے گھر رہو۔ ویک اینڈ پر آ جایا کروں گا۔ یہاں کسی کھانا بنانے والے کا انتظام کر لوں گا۔ پر یہ تمہاری روز روز کی بہانے بازی سے میں تنگ آ گیا ہوں۔''

لیکن اس بات کی نوبت ہی نہیں آئی' جلد ہی ہمیں گاؤں سے کچھ باہر ایک صاف ستھری آبادی میں گھر مل گیا۔ میری بیٹی صائمہ تو ابھی ڈھائی سال کی تھی البتہ پانچ سالہ درمان کو ہم نے وہیں انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ گھر گڑ منڈی کے مالک ماحل خان کا تھا۔ سامنے کی طرف ایک قطار میں چار کشادہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ آگے بڑا سا برآمدہ' برآمدے سے اتر کر ایک سرے پر باورچی خانہ اور دوسرے سرے پر غسل خانہ تھا۔ کچے وسیع صحن میں امرود' لوکاٹ' آلوچے اور ناشپاتی کے درخت لگے تھے۔ درمیانی چھوٹی دیوار کے دوسری طرف ماحل خان کا اپنا وسیع و عریض گھر تھا۔ ان کی ایک بیٹی گل ورینہ شادی شدہ تھی جبکہ دوسری اٹھارہ سالہ مومنہ تھی۔ ان کی نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی' یوں جو کچھ تھا' ان دو بیٹیوں کا ہی تھا۔ ان کی بیوی بی بی جان مرنجان مرنج خاموش سی خاتون تھیں۔ تمام گھر میں مومنہ کا راج تھا۔ جلد ہی میری دوستی مومنہ اور اس کی ماں سے ہو گئی۔ مومنہ تو موٹی تازی' گھنگھریالے بالوں والی ننھی صائمہ کی دیوانی ہو گئی۔ اسے جب بھی فرصت ملتی' درمیانی دیوار پر چھوٹی سی سیڑھی لگا کر دھم سے ہمارے آنگن میں کود آتی۔ صائمہ کے کپڑے بدلتی' چھوٹے چھوٹے کلپوں سے اس کی پونیاں بناتی۔ کبھی اپنے گھر لے جاتی تو خوب کھلا پلا کر بھیجتی۔ میری طبیعت خراب ہوتی تو وہ میرے آنگن میں اتر کر منٹوں میں سارا کام نبٹا دیتی۔ میں اکثر فرمائش پر یا اپنی طرف سے بھی شہر سے آتے وقت کچھ نہ کچھ اس کے لیے لے آیا کرتی۔ میں نے کوکنگ بیکنگ کے کئی کورسز کر رکھے تھے۔ ہر نئی چیز جو میں بنا کر ان کے ہاں بھیجتی تو دوسرے دن وہ مُصر ہوتی کہ اسے بھی سکھائی جائے۔ سوئٹرز کے نمونے' کشیدہ کاری اور کرائے اس نے اتنی جلدی سیکھے کہ میں اس کی بے پناہ ذہانت کی قائل ہو گئی۔ جب کبھی وہ بڑے انہماک سے کسی کام میں مصروف ہوتی تو میری نظریں اس کے چہرے پر اٹک کر رہ جاتیں۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ سرخ گلاب کی نئی نویلی کھلتی کلی کا گمان ہوتا تھا۔

سپید بے داغ چہرے پر سبز بلوری ہراساں سی آنکھیں یوں جیسے جنگل میں شیر کے ڈر سے بھاگتی ہرنی کی نظریں ہوتی ہوں' سر پر گھنے ہلکے براؤن بالوں کا چھتہ جسے وہ ایک دن نہ سنوارتی تو ٹوکرا سر پر دھرا دکھائی دیتا۔ اکثر کہتی۔

''باجی......! اتنے لمبے' اتنے گھنے بالوں سے میں تنگ آ چکی ہوں۔ بی بی جان تخت پر کھڑا کر کے پائپ سے پانی ڈالتی ہیں۔ بیچ بیچ میں سے لٹیں کاٹ نہ لوں۔''

''پگلی' ایسے بال ہی تو عورت کی خوبصورتی کہلاتے ہیں۔ کبھی انہیں کاٹنے کا سوچنا بھی مت۔'' میں اسے سمجھاتی۔

مومنہ کی بڑی بہن گل ورینہ کی شادی آٹھ سال قبل اسی گاؤں کے ایک متمول خاندان میں ہوئی تھی۔ اس کی ساس اور دو کنواری نندیں نہایت ہی تیز طرار اور چالاک تھیں۔ عید' شب برأت' بچوں کی پیدائش یا شادی غمی میں اس کے میکے سے لین دین کی ذرا بھی کوتاہی ہوتی تو طعنے مار مار کر اس کا جینا دوبھر کر دیتیں۔ اگر گھر میں کام کرتے ہوئے کوئی برتن وغیرہ ٹوٹ جاتا تو اس کی ساس چیخ پڑتی۔

''ہاں...... ہاں...... بیگم صاحبہ...... توڑ دے سارے برتن چورا چور کر دیئے۔ ماں باپ ٹرک بھر بھر کے اور بھیج دیں گے۔ نہ جانے کس دن کے لیے جمع جتھا بنا رہے ہیں۔ والی وارث تو ہے نہیں۔ بیٹی پر بھی خرچ کرنے میں کنجوسی کرتے ہیں۔''

بیٹی کی زندگی سکھی بنانے کی خاطر ماحل خان اور اس کی بیوی ڈھیروں لین دین کرتے' باغوں کے تازہ پھل' سبزیاں' گندم' جوار' گڑ کی بوریاں' کپڑا لتا سب کچھ دیتے لیکن سسرالیوں کے منہ ہل من مزید کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اس کا شوہر دل کا اچھا لیکن کانوں کا کچا تھا جو ماں نے کانوں میں انڈیل دیا' بس وہی صحیح ہوتا۔ ماں کے حکم سے انحراف اس کے نزدیک دوزخ کی آگ کمانا تھا۔ ان حالات سے تنگ آ کر گل ورینہ اکثر میکے میں آ جاتی' تاہم ماحل خان ایک بے حد سمجھدار اور زمانہ شناس آدمی تھا۔ ایک دو دن بیٹی کو رکھ کر اسے سمجھا کر بہت سے تحفوں کے ساتھ واپس بھیج دیتا۔

''دیکھو بیٹی......! اپنے گھر میں سانپ' بچھو کاٹیں تو انہیں اپنی چپل سے اسی وقت کچل دینا چاہیے' یہ نہ کہ دوسرے گھر سے مدد مانگی جائے۔ تم اب اُس گھر کی ایک اہم فرد ہو' اپنے مسائل خود حل کرنے کی عادت ڈالو۔ میں تنہا اور بوڑھا شخص ہوں' میرے لیے دشمنیاں مول مت لو۔'' باپ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بڑے آرام سے سمجھاتا۔

سسرال میں اس کا دیور حسن خان ہی اس کا اکلوتا ہمدرد تھا جو اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر آواز بلند کرتا' بہنوں کو برا بھلا کہتا' ماں کو سمجھانے بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھی بڑے بھائی سے بھڑ جاتا کہ وہ اگر اچھا بیٹا ہے تو اچھا شوہر کیوں نہیں بن جاتا؟ اپنی بھتیجیوں پر جان چھڑکتا۔

گل ورینہ کا ایک اور سب سے بڑا قصور تین بیٹیوں کی پے در پے پیدائش بھی تھا۔ حسن خان ان کے بارے میں ایک لفظ بھی سننے کا روادار نہ تھا۔ وہ اپنی بھابھی کی دلجوئی بھی کرتا۔

''بھابھی......! تھوڑا برداشت سے کام لیں۔ یہ دو چڑیلیں جلد ہی بیاہی جائیں گی پھر میری بیوی آئے گی تو آپ دونوں ماں کے مقابلے میں دو ہو جائیں گی پھر اماں سہم کر ایک طرف بیٹھ جائیں گی۔'' حسن خان' بھابھی کو دلاسہ دیتا۔

مومنہ اکثر اپنی آپا سے ملنے جاتی یا گل ورینہ خود بیمار ہوتی یا بچیاں بیمار ہوتیں تو مومنہ کو بلا لیتی۔ اسی آمد و رفت میں نجانے کون سا لمحہ تھا جب حسن خان اور مومنہ کے دلوں میں کچھ انجانے جذبوں نے جنم لیا۔ پاس سے گزرتے ہوئے زیر لب محبت بھرے جملوں کا تبادلہ' شرمیلی مسکراہٹ' والہانہ نظروں کا تعاقب۔ مومنہ آئی ہوئی تھی تو حسن خان بہانے بہانے سے اب مومنہ کے گھر آنے لگا تھا۔ جب مومنہ کی ہر بات میں حسن خان اور آپا کے گھر کا ذکر ہونے لگا تو مجھے شبہ ہوا اور ایک روز میں نے اس سے اگلوا لیا۔

''ہونہہ...... تو دال میں کچھ کالا ہے۔ اب جلدی سے بتا' یہ معاملہ کیا ہے؟'' میں نے مومنہ کے سر پر

دھول جما کر پوچھا پھر کچھ شرما کر' آنکھوں پر گوری کلائی رکھ کر' سر کو نیچے جھکا کر اس نے بہن کو حالِ دل سنا ہی ڈالا اور حسن خان کے والہانہ جذبوں کے بارے میں بھی بیان کر ڈالا پھر وہ آئے دن حسن خان کے بارے میں ہی باتیں کرنے لگی۔

''باجی......! یہ دیکھیں' حسن خان نے یہ ڈھیروں چوڑیاں میری جھولی میں ڈال دیں۔''

''باجی......! آج اس نے یہ رنگین کلپ' کیچر ز اور یہ مہندی کے کون دیئے ہیں۔''

''باجی......! اتنے بہت سے تحائف کو میں کہاں سنبھالتی پھروں؟''

''باجی جان......! حسن خان تو دیوانہ ہے' دیوانہ' اسے آپا سے پتہ چلا ہے کہ مجھے رس گلے پسند ہیں۔ جب شہر جاتا ہے' ڈبہ بھر کر لے آتا ہے۔ دروازے میں دے جاتا ہے کہ کاکا جی اور چاچی کے لیے لایا ہوں۔'' اس کی بھولی باتوں پر میں ہنس پڑتی۔

وہ اکثر فکرمندی سے کہتی۔ ''باجی......! گل ورینہ آپا تو اس گھر سے سخت نفرت کرتی ہے' اسے پتہ چل گیا تو وہ تو میرا جینا حرام کر دے گی۔ اب میں حسن خان کو کیسے سمجھاؤں؟'' مومنہ کی سفید چوڑی پیشانی پر تشویش بھری لکیریں ابھر آتیں۔

''ارے بھئی' گل ورینہ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ اپنی بہن دیورانی بن جائے گی۔ دونوں ملکہ بن کر ساس' نندوں کو کلین بولڈ کر دینا۔'' میری بات پر شفق کی ساری لالی اس کے گالوں کو گل رنگ کر دیتی۔ منہ پر آئی ہنسی دبانے سے اُس کے سرخ یاقوتی لب ہولے ہولے کانپنے لگتے۔

''باجی......! آپ بھی نا......''

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں کی والہانہ محبت اس مقام کو چھو چکی ہے جہاں سے واپس آنا ایسے ہی ہے جیسے جلتے انگاروں پر ننگے پاؤں چلنا۔ مومنہ کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کی بہن گل ورینہ کو اس بندھن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ان دونوں کی محبت بھری نظروں کا تبادلہ دیکھ دیکھ کر گل ورینہ کی آنکھوں میں جاڑے کی سرد ترین رات جیسی سفاک ٹھنڈک اتر آتی اور اس کی پیشانی سلوٹوں سے بھر جاتی۔ اسے حسن خان بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ اس کا بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی لیکن اسے اپنی بہن اور اپنے دیور کا یہ رشتہ قبول نہیں تھا۔ وہ اپنی بھولی بھالی لاڈلی بہن کو اس آگ میں جلتے نہیں دیکھ سکتی تھی جس میں وہ خود جل رہی تھی۔

مومنہ چند دنوں کے لیے اپنے ماموں کے گھر گئی ہوئی تھی جہاں اس کی ماموں زاد اور بچپن کی عزیز ترین سہیلی کی منگنی تھی۔ بی بی جان روزانہ دیوار کے اُدھر سے میرا حال پوچھتی لیکن مومنہ کے بغیر عجیب خالی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ ننھی صائمہ الگ مومو' موموکہہ کر گرلاتی پھر رہی تھی۔

''بی بی جان......! آخر یہ مومنہ کی بچی کب آئے گی؟ اگر میری بیٹی بیمار پڑ گئی نا تو میں اس بھوتنی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی' بس اب بلا بھی لیں۔''

پھر دو روز بعد ہنستی مسکراتی' بالوں کی لمبی چوٹی گھماتی مومنہ ہمارے آنگن میں آ کھڑی ہوئی اور صائمہ کو دیوانہ وار چومتی' سارے آنگن میں چک پھیریاں کرتی میرے گلے لگ گئی۔

''باجی جان! سچ' آپ سب بہت یاد آ رہے تھے' پر وہ کشمالہ چڑیل مجھے آنے ہی نہیں دے رہی تھی۔''

''صرف ہماری یاد آ رہی تھی یا......؟''

''اوہ......باجی......! آپ......'' اس نے شرما کر نازک ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔

ہمارے آنگن میں لگے آلوچے اور ناشپاتی کے درختوں پر سفید اور گلابی شگوفے کھل اٹھے تھے جن پر سارا دن چڑیاں چہچہاتی رہتیں۔ شہد کی مکھیاں اور بھونرے بھی منڈلانے لگے۔ رنگ برنگے پھولوں نے کیاریوں میں سر اٹھا کر سارے ماحول کو گل رنگ بنا ڈالا تھا۔ میں کمرے میں بستر ٹھیک کر رہی تھی کہ بی بی جان کی طرف کی دیوار سے کوئی دھڑام سے ہمارے آنگن میں کود آیا۔ ہڑبڑا کر میں باہر نکلی تو مومنہ کیاری سے ایک سرخ نازک سی کلی توڑ کر چہرے کے نزدیک گھما رہی تھی۔ ایک نرم اور شرمیلی مسکراہٹ اس کے چہرے پر جھلملا رہی تھی۔

''اللہ خیر......! بڑی مسکراہٹیں بکھیر رہی ہو۔ ماجرا کیا ہے؟''

''ششش......شش......'' ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''ذرا ہمارے آنگن میں جھانک کر دیکھو تو کون آیا ہے؟'' اپنی آنکھوں کو کلائی سے ڈھانپتی وہ منہ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

اپنے لانبے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے چند اینٹیں دیوار کے ساتھ لگا کر دوسری طرف جھانکا۔ دور درختوں کی گھنی چھاؤں تلے سرخ پایوں والے پلنگ پر رنگین چادریں بچھی تھیں جن پر گاؤ تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے گل ورینہ کی ساس' دو نندیں اور ایک چچی ساس بڑے ٹھسے سے براجمان تھیں۔ سامنے بڑی ساری میز پر چائے کے ساتھ انواع و اقسام کے لوازمات رکھے تھے۔ بی بی جان اور دو ملازمائیں پلیٹیں اٹھا کر ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مجھے یہ لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ ان کی شاطر و مکار نگاہیں ایک تفاخر و طنطنے کے ساتھ یہاں سے وہاں گھوم رہی تھیں۔

بعد میں بی بی جان نے بتایا کہ یہ لوگ حسن خان کے لیے مومنہ کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔ بی بی جان نے اُن سے سوچنے اور صلاح مشورہ کرنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ ویسے وہ خود کچھ کچھ آمادہ نظر آ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا' دونوں بہنیں ساتھ ہوں گی تو گل ورینہ کی حالت میں بھی سدھار آ جائے گا۔ مومنہ کے ہونٹوں پر ہنسی بکھر گئی تھی۔

چند دن اسی طرح گزر گئے۔ اچانک ایک دن گل ورینہ چھوٹی بیٹی کو گود میں اٹھائے اپنے گھر کے آنگن بیچ آ کھڑی ہوئی۔

''بی بی جان' تم لوگوں نے کیا سوچ کر انہیں مہلت دی ہے؟ کیا تم سب کو میری جلتی بھنتی زندگی نظر نہیں آ رہی' مجھے اس گھر میں سوائے رونے' جلنے کڑھنے کے اور کیا ملا جو اپنا بچا کچھا سرمایہ بھی داؤ پر لگا دینا چاہتے ہو؟ یاد رکھیں' میرے جیتے جی میری معصوم بہن ان ظالموں کے ہتھے نہیں چڑھے گی۔'' مومنہ کا نازک وجود کسی سوکھے پتے کی طرح آندھیوں کی زد میں تھا۔ وہ وحشی ہرنی کی طرح گھائل نظروں سے ماں اور بہن کی طرف گھبرا گھبرا کر دیکھ رہی تھی۔ اس دن میرے کمرے میں بیٹھ کر وہ بلک بلک کر روئی تھی۔

''باجی' میں کسی اور کے سنگ ڈولی میں بیٹھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی' میں کیا کروں؟''

شام کو جب گل ورینہ واپس سسرال جانے لگی تو اپنی دانست میں اس نے اپنے سسرالیوں کو شکست دے دی تھی۔ ان سے اپنی بے عزتیوں کا بدلہ لے لیا تھا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ وہ آج دو معصوم دلوں کا خون کر کے جا رہی تھی۔

ماحل خان اور بی بی جان نے بیٹی کے بگڑے تیور دیکھ کر اس رشتے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی اپنے بھتیجے انور خان کو مومنہ کا رشتہ دینے کا اعلان بھی کر دیا۔ اگلے ہی ہفتے مومنہ کی منگنی کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔ اس روز مومنہ میرے گھر کے ایک گوشے میں بیٹھی تمام دن روتی رہی تھی۔ میں تقریب میں تو

شریک ہوئی لیکن دل مومنہ میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ صائمہ کی دودھ کی بوتل لانے کا بہانہ کر کے میں گھر آ گئی۔

''باجی! مجھے زہر لا دیں یا میرا گلہ گھونٹ دیں' میں حسن خان کے سوا کسی کی ڈولی میں بیٹھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ باجی...... !باجی...... ! میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ اے خدا! انور خان کے گھر جانے سے پہلے مجھے موت دے دے۔'' مومنہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شدتِ غم سے میرا دل بھی پھٹا جا رہا تھا' پر میں جانتی تھی' اب وہ مر کر بھی کسی دوسرے کا نام زبان پر نہیں لا سکتی۔ اب مجھے اسے ان تاریک راہوں میں بھٹکنے سے بچانا تھا۔

''ارے پگلی' کیا حسن خان اور کیا انور خان' شادی کے بعد سارے مرد صرف خاوند بن جاتے ہیں اور اس خاوند یا آقا کے پیچھے پیچھے بلا کسی چون و چرا کے سر جھکا کر چلنا عورت کا مقدر بن جاتا ہے۔ جس دن کوئی محبوبہ اپنے عاشق کی ڈولی میں بیٹھ کر اس کی دہلیز پار کرتی ہے' اسی وقت محبوب کی محبت' والہانہ پن اور جذبوں کی شدت دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے اور تیرا تو مقدر بن رہا ہے' چاند' ستارے تیری جھولی میں گرنے والے ہیں' انور خان کی اونچی وسیع حویلی' دو سو جریب زمین' نوکر چاکر اور اکلوتا بیٹا۔ واہ' کیا قسمت لے کر آئی ہو' چھوڑو حسن خان کو وہ اس کی پھاپھا کٹنی ماں' مکار و چالاک بہنیں' دو دن میں تیری ساری محبت اڑن چھو ہو جاتی۔''

''بس' بس باجی' اب ایک لفظ بھی نہ کہنا ورنہ میرا اعتبار اٹھ جائے گا آپ پر سے۔'' منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ اندر بھاگ گئی اور اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت مجھے چڑانے لگی۔

اس دن کے بعد سے میں نے مومنہ کی ہنسی نہ سنی' اس کے سرخ سیبوں جیسے گالوں پر زردیوں نے بسیرا کر لیا۔ اُدھر بی بی جان نے زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں بھی ان کی پوری پوری مدد کرنے لگی۔ جب میں اس کے جہیز کی کسی چیز پر تبصرہ کرتی تو مومنہ ایسی گھائل نظروں سے دیکھنے لگتی کہ میں چند لمحوں کے لیے کانپ جاتی۔ حسن خان کے بارے میں مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ بالکل بت بن کر رہ گیا ہے۔

میں اکثر سوچتی' اس سنگلاخ چٹانوں والے دیس کے باسی بھی اسی طرح پتھر دل ہوتے ہیں رواج و روایات کی اس اونچے قلعے کی پتھریلی دیواروں سے محبت کرنے والے سروں کو ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر جاتے ہیں لیکن اصولوں کی اس دیوار میں معمولی سا شگاف بھی نہیں پڑتا۔

گل ورینہ کے سسرال والوں نے اس پر طعن و تشنیع کے تیر برسانے شروع کر دیئے تھے۔ ان کی انا اور غرور کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ان کی نظریں ماحل خان کی دولت پر تھیں' اس دولت کی وارث دونوں بیٹیاں تھیں۔ جو کچھ تھا' بہوؤں کے ذریعے ان کی تفویض میں آتا تھا ورنہ انہیں نہ گل ورینہ سے واسطہ تھا نہ مومنہ کی چاہ تھی۔

اس روز مومنہ کی مہندی تھی۔ معلوم نہیں کیوں' صبح سے کچھ انجانے خدشات کی پرچھائیاں میرے وجود پر چھائی ہوئی تھیں۔ اتنی پیاری' اتنی مخلص لڑکی کے بچھڑ جانے کا غم اور کچھ اس کی معصوم محبت کے پارہ پارہ ہونے کا دکھ مجھے بے حال کر رہا تھا۔ میں نے اس کے جہیز کے سارے کپڑوں پر دوپٹے ٹانک کر برتنوں' کراکری اور زیور وغیرہ کے ساتھ ہال کمرے میں سجا کر اسے تالا لگایا اور چابی گل ورینہ کو دے دی پھر میں تھکی تھکی سی صائمہ کو گود میں لیے مومنہ کے پاس آ گئی۔ چھوٹے سے نسبتاً اندھیرے کمرے میں ہلکی پیلی چادر اوڑھے وہ خاموش اپنے مہندی رچی ہتھیلیوں میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ شاید تقدیر کی لکیروں میں سے معجزے کی کسی پتلی سی لکیر کی متلاشی تھی۔ اس کے چہرے پر زردیوں کا رقص تھا' لٹی پٹی' ویران سی مومنہ کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مسلسل ہچکیوں سے اس کا نازک وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

''باجی...... ! آپ بھی میرے لیے کچھ نہ کر سکیں؟'' میرا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی نم آنکھوں سے لگا لیا اور میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ میری آنکھوں سے نکلنے والے چند گرم گرم آنسو اس کے بالوں میں جذب ہو گئے' تب ہی باہر موٹروں' بسوں کے بے ترتیب ہارنوں کے ساتھ لڑکیوں بالیوں کے بے ساختہ قہقہے' گانوں' ڈھولک کی آواز سنائی دی۔ عورتوں کا ایک ریلا سا ہاتھوں میں مہندی کے سجے تھالوں میں جلتی موم شمعوں اور بتی ڈلے چراغوں کے ساتھ امڈ آیا تھا۔ کمرے میں بیٹھی ساری لڑکیاں اور مہمان خواتین باہر کو لپکیں۔ مہندی کی رسم ادا کرنے مومنہ کے سسرالی پہنچ چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دولہا ''اور بل'' کے لیے اندر آیا۔ میں نے مومنہ کے بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ اس کے سامنے کر لی جسے اس نے چھوٹے سے چاقو سے کاٹ کر جیب میں ٹھونس لیا۔ مبارک سلامت کے شور میں لڑکا باہر چلا گیا۔ باہر آنگن کے بیچوں بیچ لڑکیاں گول میز پر مہندی کے سجے سجائے تھال رکھ کر ہاتھوں میں شرشراتے ستارے پکڑے لڈی ڈالنے لگی تھیں۔ میں مومنہ کو اکیلا چھوڑ کر باہر آنگن میں نکل آئی تھی۔ اسی وقت میری نظر اس چھوٹے کمرے کی طرف اٹھی۔ گل ورینہ کی چھوٹی نند خوبانہ سرخ بھاری کام والے دوپٹے اور لمبے قد والی ایک عورت کے ساتھ مومنہ کے کمرے کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا لیکن ننھی سی صائمہ نے ستارے پکڑنے کے لیے وہ اودھم مچایا کہ میں اسے سنبھالتی ہوئی سب

## موسم

گئے موسموں کی پکار پر
اب التفات کیسی؟
گزری بہار کا لاشہ
دفنانے کا موسم ہے
بے گھر پرندوں کے ٹھکانوں
جیسی
کچھ لاپتا مسرتوں کو لاپتا ہی رہنے دو
کہ خواہش کے کشکول میں
آس کے سب ہی سکے ہم پہلے ہی
دان کر چکے
بوجھل سے سہی
دل کی شکست تسلیم کر چکے
تم سے وابستہ خواب کا
کانچ چور کر چکے!
دشوار ہی سہی
اب مگر
خواب سے جاگنے کا موسم ہے
ہاں
تم سے بے تعلق پُروا
کے آنے کا موسم ہے!!

شازیہ سعید مغل

بھول گئی۔ تھوڑی دیر بعد خوبانہ بڑے والہانہ انداز میں لڈی ڈانس میں شریک تھی۔

''بھئی' مہندی لگانے کی رسم میں جلدی کرو۔ کھانا لگ رہا ہے۔ باہر اندھیرا گہرا ہو رہا ہے' واپسی میں کھیتوں کے ساتھ ساتھ گزرنا ہوگا۔'' ایک مردانہ آواز نے پکارا۔ دولہا کی بہنوں' بھابیوں وغیرہ نے مہندی کی تھالی اور مٹھائی کا ٹوکرا اٹھا کر دلہن کے کمرے کا رخ کیا۔ صائمہ کو باہر باپ کے پاس بھیج کر میں بھی ہمراہ ہولی۔ سب سے پہلے اس کی ساس نے پہلو میں رکھا اس کا ہاتھ ٹٹول کر باہر نکالا۔

''بھئی چلو' سات سہاگنیں دلہن کو مہندی لگاؤ۔ اللہ' میری بہو کا ہاتھ کتنا ٹھنڈا ہے۔ گھبرا رہی ہو' ارے تو' تو میرے گھر کا چراغ ہوگی۔ میری گڑیا' تو میری بیٹی بن کر راج کرے گی۔''

دوسری نند نے آگے بڑھ کر اس کا گھونگھٹ اٹھا کر سینے سے ٹکا سر اٹھایا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مومنہ کا وجود ہلانے سے مٹی کی ڈھیری کی طرح ایک طرف کو لڑھک گیا تھا۔ اس کی سبز' بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت جھلک رہی تھی۔ اس کی ایک بھابھی نے لپک کر اس کی پیلی چادر کھینچ لی۔ اندر اس کا سارا وجود سرخ خون میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے عین دل کے اوپر ایک جھلسا ہوا نشان تھا۔ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ ذرا دیر پہلے جس گھر میں رنگ و نور کا سیلاب امڈ آیا تھا' وہاں اب قبرستان کی سی گمبھیر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بی بی جان غش کھا کر گر گئیں۔ ماحل خان بلک بلک کر رو رہا تھا اور گلورینہ پھٹی پھٹی نظروں سے بہن کی خون میں نہائی ہوئی لاش کو تکے جا رہی تھی۔ روشنیوں کے جلو میں بڑے سے آنگن کے بیچ مومنہ کی لاش پلنگ پر بکھری پڑی تھی۔ اس کی کھلی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

قیامت کی وہ رات میں نے اس کے پلنگ کا پایہ پکڑے ہوئے گزار دی پھر پولیس آئی' پوسٹ [مارٹم] ہوا' تفتیش شروع ہوئی۔ جنازہ اٹھانے سے پہلے [مومنہ] کے دولہا کو اندر بلا کر دلہن کا دیدار کرایا گیا۔ [اس] نے حیا بار نظروں کو جھکا کر شرم کے مارے چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا نہ شرمائی' لجائی۔ انور نے ذرا کی ذرا اپنی ہونے والی دلہن کا [چہرہ دیکھا پھر] جیب سے خوشبوؤں میں نہائی ہلکے بھورے رنگ [کے] بالوں کی لٹ نکال کر لاش کے سینے پر ڈال دی۔ آنکھوں کو رومال سے ڈھکتا باہر نکل گیا۔

تیسرے دن قاتل پکڑا گیا۔ وہ جو مومنہ کی [ذرا] سی تکلیف پر پہروں بے قرار رہتا' اسی حسن [خان] نے مومنہ کے دل پر پستول رکھ کر قتل کیا تھا۔

حسن خان نے اپنے اعترافی بیان میں بتایا تھا [کہ] وہ داخلی دروازے کے ساتھ بنے مویشیوں کے کوٹھے میں بنے بھوسے کے اونچے ڈھیر میں شام میں آ کر چھپ گیا تھا پھر اس کی رازدار چھوٹی بہن اسے سر پر دوپٹہ اوڑھا کر اندر لے گئی اور کام ختم کر کے بھائی کو آرام سے پچھلے دروازے سے نکال دیا۔ پٹاخوں [اور] ڈھول کی آواز میں فائر کی آواز دب گئی۔

حسن خان پر مقدمہ چلا' دونوں ہی فریقوں [نے] پیسہ پانی کی طرح بہایا لیکن جب تک قانون [کے] تقاضے پورے ہوئے' ضمیر کی خلش سے جلتا [ہوا] حسن خان قدرت کے انتقام کا شکار ہو گیا۔ اس [نے] جیل میں خودکشی کر لی۔ کچھ عرصے بعد میرے میاں [کا] تبادلہ دوبارہ شہر میں ہو گیا اور ہم وہاں سے چلے آ[ئے]۔ ویسے بھی اگر میں وہاں رہتی تو کسی کل چین نہ پاتی۔ مومنہ کا چہرہ ہمیشہ میری نگاہوں میں رہتا۔ [آج] زندگی کے ہنگاموں اور وقت کی دوڑ نے میرا غم [کم] کر دیا ہے لیکن کبھی کبھی مجھے مومنہ کے منہ سے [نکلا] گنگناتا ہوا ماہیا یوں کونوں کھدروں سے سنائی [دیتا ہے تو] لگتا ہے جیسے وہ یہیں کہیں چل پھر رہی ہو۔



شمر احمد

# عشق آشنا

خلیل اللہ فاروقی کا خیال

وہ محبتوں کی کہانیاں' جو غبار بن کے بکھر گئیں
انہیں رائیگاں نہ سمجھ انہی سے جہانِ غم کا جمال ہے

**محبت قربانی مانگتی ہے اور اس لڑکی نے محبت کا یہ تقاضہ پورا کر دیا تھا**



میرے جذبات قابو میں نہیں تھے' نم آنکھیں برسنے کو تیار تھیں' میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے' یوں لگتا تھا' اگلے پل میری سانس رک جائے گی۔ وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ آج اس کے روپ میں کئی چاند چمک رہے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے کبھی مہمانوں کے سلام کا جواب دیتی تو کبھی مبارکباد قبول کرتی شرما رہی تھی۔ وہ میری چاہت تھی' ہم نے بچپن سے اب تک تمام وقت ساتھ گزارا تھا۔ ساتھ کھانا پینا' اسکول ساتھ' کالج ساتھ' ہر جگہ ہم ساتھ ساتھ مگر آج وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھی۔ وہ دلہن بنے بیٹھی تھی اور کچھ دیر میں رخصت ہو کر اپنے خوابوں کے شہزادے کے ساتھ جانے والی تھی جو دولت مند تھا' خوبصورت تھا اور اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ ملک سے باہر رہتا تھا۔ یہ سب اس کے خواب تھے' اس کے اپنے ہم سفر میں وہ یہی خوبیاں چاہتی تھی اسی لیے میں کبھی اپنے پیار کا اظہار نہ کر سکا۔ اس کی رخصتی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں مزید رکنے کی ہمت نہیں کر سکا اور بھاگ کر گھر آ گیا۔ میرے اندر باہر ہر طرف سناٹا تھا' ویرانی تھی' ہر شے پر اداسی تھی۔ وہ جا چکی تھی' اپنی زندگی جینے اور میں تنہا ہو گیا تھا۔ میں ساری رات روتا رہا۔ اب کوئی مجھے ڈھونڈتا ہوا' مجھے پکارتا ہوا نہیں آئے گا۔ پہلے میں کچھ دیر نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا تو وہ مجھے تلاش کرتی' مجھے پکارتی رہتی۔ میں کسی دعوت میں کھانا نہ کھاتا تو وہ اپنی پلیٹ لیے میرے پاس آ بیٹھتی اور کہتی۔

''داستان' اگر تم کھانا نہیں کھاؤ گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔'' اور میں اس کی ادا پہ مسکرا کے کھانے لگتا۔

میں اکثر اُس سے مذاق میں کہتا تھا۔ ''تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو تو مجھ سے شادی کر لو۔''

پر وہ کہتی۔ ''چل ہٹ! پاگل' میں تو کسی دولت مند سے شادی کروں گی جو میری ہر خواہش [illegible] کرے گا اور جو ملک سے باہر رہتا ہو تا کہ میں [illegible] میں بیٹھ کر اس کے گھر جاؤں۔''

اُس کی دُعا قبول ہوئی اور وہ چلی گئی [illegible] زندگی کی ہر خوشی' ہر مزہ وہ اپنے ساتھ لے گئی۔

''بیٹے! کب تک بھوکا رہے گا میرے [illegible] تھوڑا کھانا کھا لے۔'' اماں سے میری اداسی دیکھی [illegible] جاتی۔

میرا اپنا کوئی نہ تھا' انور علی صاحب ہی میرے سب کچھ تھے' انہوں نے مجھے یتیم خانے سے لا کر پالا تھا' تعلیم دلائی۔ اُن کی تین بیٹیاں عروج باجی سب سے بڑی پھر مہک اور سب سے چھوٹی میری محبت ثانیہ۔ انور صاحب کپڑے کی دکان پر جاتے تھے جہاں سے ٹھیک ٹھاک تنخواہ ملتی۔

''اماں......! ثانیہ کے بنا یہ گھر ویران ہو گیا ہے۔ میرا ایک دوست ملک سے باہر میری نوکری کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ آپ کیا کہتی ہیں' چلا جاؤں؟'' میں اماں کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

''میں جانتی ہوں میرے بچے......! وہ تو گھر کی رونق تھی' تم دونوں ہی سارا دن گھر میں شور مچا کر رکھتے تھے۔ اب تیرا بھی دل کہاں لگ رہا ہے گھر میں' دیکھ لے نوکری' اپنے ابا سے بات کر لے۔'' اماں اداس ہو گئی۔

''اداس کیوں ہوتی ہو میری پیاری اماں؟ میں آتا جاتا رہوں گا۔ میں کسی قابل بننا چاہتا ہوں۔'' میری بات اماں کی سمجھ آ گئی۔ ابا کو رضامند کرنے میں ماں نے میرا خوب ساتھ دیا پھر اماں کی دُعاؤں اور ابا کی مدد سے میرا کام آسان ہو گیا اور میں دبئی چلا آیا۔

دبئی آ کر میں نے خود کو کام میں مصروف کر لیا دن رات کام کرتا تا کہ ثانیہ کی یاد سے تڑپ نہ سکوں۔ میری محنت سال بھر میں نظر آنے لگی۔ میں نے کافی ترقی کر لی' اپنا فلیٹ' اپنی گاڑی بھی لے لی پر دل میں جلتی محبت کی آگ بجھ نہ سکی۔ اُسے جب موقع ملتا' وہ دل جلانے لگتی۔

ابا کا اکثر فون آتا' میں بھی ایک دو بار مل آیا۔ اب ابا کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ میں پاکستان آ جاؤں پر یہ میرے بس میں کہاں تھا۔ میں کام کا بہانہ کرتا رہا۔ ایک روز ابا انتقال کر گئے۔ میں جیسے تیسے پاکستان لوٹ آیا۔

سال بھر میں ابا نے عروج باجی کی شادی دانش بھائی سے کر دی تھی۔ مجھے بلایا گیا' پر میں کام کی زیادتی کے باعث نہ آ سکا۔ ابا کو دفنا دیا گیا۔ رشتے دار افسوس کر کے چلے گئے۔ عروج باجی' ماں بننے والی تھی۔ محلے کے کچھ لوگ اب بھی بیٹھے تھے۔ اماں کو چند عورتوں نے گھیرا ہوا تھا۔ میں چھت پر آ گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ثانیہ کی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ بے تابی نے نگاہوں سے نکلنے کا راستہ دیکھ لیا۔ میرا جسم بے جان سا ہونے لگا۔ ثانیہ کی آوازیں' پرانی ہر یاد میرے کانوں میں گونجنے لگی۔

''داستان' تم اب تک ثانیہ سے محبت کرتے ہو؟'' یہ مہک تھی' جانے کب سے یہاں تھی۔

''نہیں......نہیں......تو مجھے تو ابا کی یاد آ گئی۔'' میں نے آنسو صاف کیے۔

میرے جواب پہ وہ دھیرے سے مسکرا دی اور بولی۔ ''تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ ابا کی یاد ہم سب کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی' پر تمہاری آنکھوں میں آنسو ثانیہ کی جدائی کے ہیں۔'' میں حیران سا اسے دیکھنے لگا۔ ''داستان' اس بات کے لیے یہ وقت تو صحیح نہیں' پر تم جانتے ہو' میں نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟'' مہک کے سوال پر میں نے اسے دیکھا۔ ''داستان' میں تم سے محبت کرتی ہوں' ہمیشہ سے' بچپن سے' پر تم ثانیہ کی محبت میں ایسے ڈوبے رہے کہ میں تمہیں دکھائی نہ دی نہ میری محبت کا احساس ہوا پر میں نے تمہاری آنکھوں میں ثانیہ کے لیے محبت پڑھ لی اور خاموش رہی۔'' مہک نے اپنی بات ختم کر دی۔ میں حیران سا اسے تکتا رہا۔ میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا' کہاں تھی وہ' کب ہوئی مجھ سے محبت' ہر پل میں ثانیہ کے آگے پیچھے رہا۔ مہک کہاں تھی؟ میں کئی سالوں پہلے جا کھڑا ہوا' بچپن' جوانی' کس پل میں' کس وقت میں' کب' مجھے وہ یاد نہیں تھی۔ یہ کیسی محبت تھی اس کی' میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اسی وقت عروج باجی نے نیچے سے مجھے پکارا اور میں حیران پریشان سا نیچے کمرے میں عروج باجی کے پاس آ بیٹھا جہاں اماں آنسو صاف کرتے بولی۔

''داستان بیٹے! ثانیہ کی شادی کو تین سال گزر گئے ہیں۔'' اماں کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

''اماں......! مجھے بتانے دیں۔'' عروج باجی نے کہا۔ ''داستان' ثانیہ کی شادی کے چند ماہ تک اس کا ہم سے رابطہ رہا' اس کے بعد دو سال سے اُس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ہم نے بہت کوشش کی پر ناکام رہے۔ ابا نے ہم سب کو تمہیں بتانے سے منع کیا تھا' اب جو نیا پتا ملا ہے' وہ بھارت کے کسی شہر کا ہے۔ ارشاد کے ہی ایک رشتے دار نے فون پر رابطہ کر کے ساری صورتِ حال بتائی ہے۔ ارشاد' ثانیہ کو مارتا ہے' اس پر ظلم کرتا ہے اور سال بھر پہلے اُسے طلاق بھی دے چکا ہے پھر بھی وہ اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ تم اس پتے پر جا کر ثانیہ کو لے آؤ۔'' عروج باجی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ثانیہ پر اتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑی اور ابا نے مجھے خبر تک نہ ہونے دی؟ کم سے کم میں اُسے گھر تو لے آتا اماں......!" میں اماں کے قدموں میں آ بیٹھا۔ "ابا نے مجھے اپنا بیٹا نہ سمجھا؟" میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

"نہیں میرے بچے......! نہیں، وہ نہیں چاہتے تھے تو پریشان ہو۔" اماں نے محبت سے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"اماں......! اتنی بڑی بات ہوگئی اور آپ کہتی ہیں......" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اب بحث سے کیا ہوگا پھر میں جانے کی تیاری کرنے لگا اور اُس ہی رات کی فلائٹ سے بھارت روانہ ہوگیا۔ میں ایک پل بھی مزید ضائع نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے ثانیہ کی فکر تھی، اس کے لیے میرے دل سے دُعائیں نکل رہی تھیں۔ ثانیہ کے ساتھ ایسا ہوگا، اس کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ میں تو اس کی ذرا سی تکلیف پہ گھبرا جاتا تھا۔ میرے دل پہ بجلی سی گری تھی۔

"اے خدا! ثانیہ کی حفاظت کرنا۔"

دو دن بھارت میں گھومتا رہا پھر جا کے اُس کا گھر ملا۔ وہ ایک بوسیدہ سی پرانی عمارت تھی جس کی دیوار پہ روشن دان بنے تھے۔ میں نے کئی بار دستک دی پھر ایک گندا سا بچہ سر کھجاتا باہر آ گیا۔

"کیا ہے، کون ہو؟" وہ بدتمیزی سے بولا۔

"بیٹا......! کسی بڑے کو بلاؤ، کہنا، پاکستان سے ثانیہ کے رشتے دار آئے ہیں۔" میری آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔

"اماں......! اماں......!" کرتا وہ بچہ گھر میں دوڑ گیا۔ میرا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے؟" تب ہی ارشاد باہر آ گیا۔ گندے کپڑوں میں ملبوس، اجاڑ حال، یوں لگتا تھا، وہ سالوں سے نہایا نہ ہو۔

"میں ثانیہ کو لینے آیا ہوں، کہاں ہے وہ؟" میری بات پہ اس کی بھنویں چڑھ گئیں۔

"بھاگ گئی بے حیا...... یہاں نہیں ہے، کوٹھے پہ تلاش کرلے اس بے شرم، بے غیرت کو......" وہ جانور کی طرح لگ رہا تھا۔

"یا خدا! میری ثانیہ ان جانوروں کے ساتھ کئی سال سے رہ رہی ہے؟" میرا وجود کانپ گیا۔

"دیکھیں، میں جانتا ہوں، وہ یہیں ہے، میں لینے آیا ہوں اُسے۔" میں نے دروازے میں پاؤں رکھ دیا۔

"کمینے...... جانے دے اس منحوس کو، سارا گھر رو رو کے ناپاک کر رکھا ہے، ہماری زندگی حرام کردی ہے، نکال باہر کر بے حیا کو......" یہ ارشاد کی ماں تھی جس کی بات پہ ارشاد نے مجھے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ کچے فرش کا یہ مکان پرانی عمارت بارش کا زور اٹھانے میں ناکام رہتی ہوگی۔

"ثانیہ......! کہاں ہو تم؟ میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" میں نے پکارا۔ وہ میری آواز پہ ایک کمرے سے نکل آئی اور مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"داستان، مجھے اماں کے پاس لے چلو، ان لوگوں نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا، بہت برا، مجھے صبح، شام جلاتے ہیں، یہ دیکھو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میری محبت کا ایسا حال بنا دیا تھا ان لوگوں نے؟ میں نے نفرت سے ارشاد کو گھورا۔

"اب اس بے حیا کو لے اور نکل جا، یہ میرا علاقہ ہے، تجھے اور اس منحوس کو یہیں زندہ دفنا دوں گا......" ارشاد میری نگاہوں کو دیکھ کر بولا۔

"چلو داستان، یہاں سے چلو۔" وہ مجھ سے لپٹ کے روئے جا رہی تھی۔ میں نے ثانیہ سے بے انتہا محبت کی تھی۔ اُسے پانے کی دُعائیں بھی مانگی تھیں پر ایسا تو میرے تصور میں بھی نہ تھا۔

اماں، عروج باجی، مہک گھنٹوں ثانیہ سے گلے مل کر روتی رہیں۔ اسے آئے تین ہفتے بیت گئے تھے پر وہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ اکثر روتی رہتی تھی۔ ہم سب اس کی دلجوئی میں لگے ہوئے تھے۔ اماں کے کہنے پر میں اکثر سب کو کھانے پر لے جاتا، پرانی یادیں یاد کرتا اور سب مل کر ہنستے۔ اماں اکثر ثانیہ کو سمجھاتے ہوئے کہتیں۔

"ارشاد کا حساب خدا پاک خود کرے گا۔"

وقت کب کسی کے لیے رکا ہے، ایک ماہ گزر گیا، عروج کے یہاں پیاری سی بیٹی پیدا ہوئی، سب ہی خوش تھے اور میں جانے کی تیاری کرنے لگا۔

"بیٹا، تیرے ساتھ ہونے سے دن رات کی خبر نہ ہوئی تو چلا جائے گا تو سارا گھر کاٹنے کو دوڑے گا۔" اماں اداس ہوگئیں۔

"اماں! میرا جانا ضروری ہے، پر میں وعدہ کرتا ہوں، اب کی بار آؤں گا تو پھر آپ کو چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔" اماں مسکرا دیں۔

"سچ کہتا ہے نا تو وعدہ کر جلدی آئے گا۔" اماں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

"ہاں، پکا وعدہ۔" میں نے اماں کے ہاتھ پہ بوسہ لے لیا۔

"تم جا رہے ہو؟" ثانیہ بھی میرے جانے کا سن کر آ گئی۔

"ہاں، کیوں؟" میں سامان پیک کر رہا تھا۔

"یوں ہی پوچھ رہی ہوں، اماں نے بتایا، مجھے تمہارے جانے کے بعد تمہاری یاد آئے گی، یہ گھر تمہارے بنا اچھا نہیں لگتا ہے۔" ثانیہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ آج وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی، گیلے بال، وہی میرے لیے بے چینی سی اس کے چہرے پہ دکھائی دی۔

"آج کافی اچھی لگ رہی ہو تم، ماشاء اللہ!" میں نے اس کے سر پہ چپت لگا دی۔

"داستان، اب تم مجھے ایسے مار نہیں سکتے، میں اب چھوٹی سی ثانیہ نہیں رہی۔" میں اسے تکتا رہ گیا۔ میری محبت نے پھر سے انگڑائی لی، محبت کے سمندر میں میرا دل ایک بار پھر سے غوطے لگانے لگا۔

"تم نے مجھ سے میری اولاد کے بارے میں نہیں پوچھا؟" وہ ایک دم ہی یوں گویا ہوئی جیسے اسے کچھ کہنا تھا۔

"میرا خیال تھا، تم نے اماں کو بتا دیا ہوگا۔" میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

"ارشاد باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا، اسی لیے وہ مجھ پہ ظلم کرتا، مجھے مارتا، مجھے جلاتا تھا۔" ثانیہ کی آنکھوں میں لالی آ گئی۔

"تم نے عروج باجی کی بیٹی کا نام سوچا؟" میں نے موضوع بدل دیا۔

"ارے ہاں، میں تو بھول گئی، وہ تو پوری کتاب لے آئی تھی ناموں کی۔" ثانیہ نے سر پہ دوپٹہ لیا اور کمرے سے نکل گئی۔ میری محبت کسی گلاب کی طرح تازہ ہوگئی۔ میں واپس دبئی آ گیا۔

اکثر ثانیہ سے فون پر باتیں ہوتیں، ہم پرانی باتوں کا ذکر کرتے اور کافی دیر تک ہنستے رہتے۔ وہ اکثر مجھے واپس آنے کا کہتی۔ "گھر میں تمہارے بنا دل نہیں لگتا۔" اس کی ایسی باتوں سے میری محبت پروان چڑھنے لگی۔

ایک روز اس نے فون پر بتایا۔ "داستان، کل دانش بھائی کے چھوٹے بھائی کے لیے مہک آپی کا رشتہ آیا ہے۔ اماں تو تیار ہیں، پر جانے کیوں مہک آپی انکار کر رہی ہیں۔ اماں نے وقت مانگا ہے جواب کے لیے۔" ثانیہ کی بات نے مجھے جیسے نیند سے جگا دیا ہو، کام کا بہانہ بنا کر میں نے فوراً فون بند

کر دیا۔

'مہک مجھ سے محبت کرتی ہے' وہ میرے لیے تو بیٹھی ہے' مجھے کیسے یاد نہ رہا' میں کتنا خود غرض انسان ہوں' ثانیہ کے آتے ہی ایک بار پھر سے میں اسے نظر انداز کر گیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ ایک طرف میری محبت ثانیہ ہے تو دوسری طرف میرے نام کی مالا جپنے والی سالوں سے میرے انتظار میں بیٹھی مہک ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کیا کروں؟ کس کا ساتھ دوں؟ کس کو چھوڑ دوں؟ مہک کی محبت کا مول میں ادا نہیں کر سکتا تو دوسری طرف میری بچپن کی محبت' میری چاہت ثانیہ ہے۔' پھر خاصا سوچنے کے بعد میں نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کر لیا۔

''اماں...... !میں پاکستان آرہا ہوں ہمیشہ کے لیے' اب میں گھر بسانا چاہتا ہوں۔'' اماں میری بات پر خوش ہو گئیں۔ عروج باجی کو بھی میری شادی کرنے والی بات کی اطلاع مل گئی تھی۔ ان کے بھی کئی فون آگئے' وہ بھی بے حد خوش تھیں۔

مجھے پاکستان آئے دو دن ہو گئے تھے۔

''بیٹا' ہمیں تو بتا' تجھے کس طرح کی دلہن چاہیے اپنے لیے؟'' اُس رات کھانے پہ اماں نے محبت سے پوچھا۔

''اماں...... !میں نے لڑکی دیکھ رکھی ہے' پر پہلے میں خود اُس سے بات کر لوں پھر آپ لوگوں کو بتاؤں گا۔'' میری بات پر ثانیہ شرماتے ہوئے مسکرانے لگی۔ میری نظریں اکثر اب اُس ہی کا چہرہ پڑھتی رہتیں پر میں جو فیصلہ کر چکا تھا' اُس کے لیے ثانیہ کو سمجھانا ضروری تھا۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ کیسے ثانیہ کو سمجھاؤں کہ میں اُس سے شادی نہیں کر سکتا؟ میں مہک کی محبت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

''کیا میں آپ سے کچھ بات کر سکتی ہوں؟'' کھانے کے بعد مہک میرے کمرے میں آگئی۔

''ہاں' ہاں' ضرور' کیوں نہیں۔'' میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''آپ سے میری بس اتنی سی درخواست ہے کہ آپ ثانیہ کو اس حقیقت سے کبھی آگاہ نہیں کریں گے کہ میں نے آپ سے محبت کی ہے۔ خدارا' اُسے خبر ہونے مت دیجیے گا۔ ہم سب جانتے ہیں' آپ اُسے ہی اپنا بنائیں گے۔'' مہک کی آنکھوں میں آنسو تھے' وہ ہاتھ جوڑے مجھ سے التجا کر رہی تھی۔

''نہیں مہک' اس طرح تمہیں ہاتھ جوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں' میں تمہاری محبت' تمہارا انتظار نظر انداز نہیں کر سکتا' میرے جذبات کو ثانیہ نے نہیں بلکہ تم نے سمجھا' میں یہاں ثانیہ کو نہیں' تمہیں اپنا بنانے آیا ہوں۔'' میری بات پر مہک روتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

........

''بیٹے' میں نے تجھ سے کہا تھا نا تو اس گھر کی رونق ہے۔ دیکھ' تیرے آنے سے اس گھر میں کیسی خوشیاں آئی ہیں۔'' اماں جانے کب میرے کمرے میں آگئی تھیں۔

''کیوں اماں...... !ایسا کیا ہوا؟'' میں نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

''بیٹے' مہک نے دانش کے بھائی اکبر کے لیے ہاں کر دی ہے' اب اس گھر میں دو شادیاں ہوں گی' ایک تیری ثانیہ سے اور دوسری مہک کی اکبر سے ماشاء اللہ' خدا پاک تم سب کو خوش رکھے۔''

اماں تو دُعائیں دیتی چلی گئیں اور میں حیران پریشان سا کھڑا مہک کی محبت کو تولنے لگا جس نے بہن کی خاطر اپنی محبت کو قربان کر دیا تھا اور محبت کی بازی کو جیت کر مجھے بتا دیا تھا کہ حقیقت میں اسے عشق کہتے ہیں۔



آصفہ اقبال بلوچ

# ادراکِ محبت

شگفتہ شفیق کا خیال

بیتے دنوں کی رام کہانی
میری محبت بڑی پرانی

**ایک شادی شدہ عورت کا قصہ' محبت کو سمجھنے میں اس سے چوک ہو گئی تھی**



میں بے حد خوش تھی' دو دن بعد میری لندن کی فلائٹ تھی۔ مدتوں سے میرے دل کی اولین خواہش تھی کہ میں بھی اُس شہر میں جا بسوں جہاں میرا محبوب' میری محبت سعید افضل رہتا تھا۔ آپ کو شاید یہ پڑھ کر حیرانی ہو کہ میں نہ صرف شادی شدہ ہوں بلکہ بیس سالہ نوجوان شیری کی ماں بھی ہوں۔ میرے شوہر وقار احمد کا انتقال کافی عرصے پہلے اُس وقت ہوا تھا جب میرا بیٹا بہت چھوٹا تھا' تب سے اب تک میں تنہا اپنے بیٹے کی پرورش کر رہی تھی۔ شیری نہایت ہی فرماں بردار اور لائق بچہ تھا اسی لیے جب اُس نے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے نہ صرف اُسے اجازت دے دی بلکہ اپنی تنہائی اور مدتوں سے دل میں دبی چنگاری کی وجہ سے خود بھی ساتھ چلنے کا ارادہ کرلیا۔ میرے اس فیصلے سے شیری بہت خوش تھا مگر اُس سے زیادہ میں خوش تھی۔ مجھے آج بھی وہ دن بہت اچھی طرح سے یاد تھا جب روتے ہوئے میں اور میرا محبوب ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ ہماری جدائی کا سبب اور کچھ نہیں' پیسہ ہی تھا۔ سعید اُس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ مجھے اپنا سکتا۔ اُس پر چھ بہنوں کا بوجھ تھا اور جبکہ میرے والدین کو میری شادی کی خاصی جلدی تھی' دوسرے وہ کسی طور بھی میرا ہاتھ کسی غریب شخص کے ہاتھ میں دینے پر راضی نہ تھے حالانکہ سعید میرا کزن تھا' بچپن سے ہم ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے' خاندان کے کسی بھی فنکشن یا تقریب میں ہم ساتھ ساتھ ہوتے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے والدین میرے دلی جذبات کا خیال کریں گے مگر ایسا نہیں ہوا' میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ نازوں میں پلی اپنی بیٹی کو کسی صورت سعید کے ساتھ بیاہنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ٹھکرائے جانے پر سعید بے حد دکھی تھا۔ وقار کا رشتہ میرے سر پر لٹکتی تلوار کی طرح ناچ رہا تھا اور میں بے بس تھی۔

''سعید' میں تمہارے ساتھ کورٹ میرج کے لیے تیار ہوں مگر تمہارے بنا رہنا مجھے منظور نہیں۔ بولو کیا کہتے ہو؟ یہی وقت ہے فیصلے کا۔'' میں نے محبت کی بے قراری سے کہا تھا۔ مجھے اپنی محبت کی تکمیل کا بس یہی طریقہ نظر آرہا تھا مگر سعید نے ایسا کرنے سے انکار کردیا۔

''نہیں' یہ درست طریقہ نہیں' ایسا کرنے سے میرا گھر تو بس جائے گا مگر میری بہنوں کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگ جائے گا پھر خاندان بھر سے رنجش مول لینا میرے والدین افورڈ نہیں کرسکیں گے۔ اگر عزت سے تم میری ہو جاتیں تو اور بات تھی۔

یہی ہماری آخری ملاقات تھی اور ہم روتے ہوئے اس عہد کے ساتھ جدا ہوئے کہ اپنی اس محبت کو ہمیشہ اپنے دلوں میں زندہ رکھیں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اس نے مجھ سے یہی کہا کہ جہاں والدین کہتے ہیں' شادی کرلینا اور میں نے اُس کا یہ کہا مان لیا تھا۔

وقار کو کبھی بھی میں وہ پیار نہ دے پائی جس کا وہ مستحق تھا۔ ایک دولت مند شخص ہونے کے باوجود اس نے میری ناز برداری میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی بلکہ اب سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ میرے سرد رویّے کو بھی وہ ہنس کر برداشت کر جایا کرتا تھا۔ میرے والدین کا انتخاب ہر لحاظ سے لاجواب تھا مگر مجھے ہمیشہ اپنے ماں باپ سے شکوہ رہا۔ وقار کو کبھی میں نے وہ حقیقی محبت اور نہ وہ توجہ دی جو اس کا حق تھا مگر پھر بھی وہ ہر دم میری محبت کا دم بھرتا تھا جس دن میں ذرا مسکرا دیتی' وہ بچوں کی طرح خوش ہو جایا کرتا مگر میں بھی کیا کرتی' مجھے وقار سے محبت نہیں تھی بس اُس سے صرف ایک رشتہ نبھا رہی تھی' سمجھوتے کا رشتہ' وہ کبھی کبھی میرے سرد رویّے سے پریشان بھی ہو جایا کرتا مگر وہ بے حد صابر انسان تھا۔ شاید میرا دل جیت لینا اُس کی ضد تھی مگر خدا نے اُسے زیادہ مہلت نہیں دی اور شادی کے دو سال بعد وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

وقار کی موت کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو اب اپنے بچے کے ساتھ زندگی کے اس کٹھن سفر میں تنہا رہ گئی ہوں۔ وہ جیسا بھی تھا' اُس نے ہمیشہ میرا خیال رکھا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور میں شیری کی پرورش میں جُت گئی۔ اس دوران میرے والدین نے میری دوسری شادی کرنا چاہی مگر میں نے صاف انکار کردیا۔ دوسری طرف مجھے اکثر سعید کے بارے میں بھی اطلاع ملتی رہتی کہ سعید اِن دنوں لندن میں ہے' اُس کی بہنوں کی شادیاں بھی ہو چکی تھیں اور سعید نے بھی مستقل رہائش کی خاطر وہاں کسی گوری سے شادی کرلی تھی۔ یہ خبر میرے لیے کوئی خاص نہیں تھی کیونکہ میں جانتی تھی' ہزاروں لوگ مستقل رہائش کی خاطر یہی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ اُس کے دل میں میری تصویر آج بھی سجی ہوئی ہے۔ میں اُس سے ملنا چاہتی تھی' اُسے دیکھنا چاہتی تھی' جاننا چاہتی تھی' اُس نے یہاں تک پہنچنے میں کتنی جدوجہد کی۔ میں یہ بھی چاہتی تھی کہ وہ اقرار کرے کہ وہ آج تک مجھے نہیں بھول پایا جیسا کہ میں اُسے نہیں بھلا پائی اسی لیے میں لندن جانے کے لیے پرجوش تھی۔ دو روز بعد میری فلائٹ تھی اور میں ماضی کے اوراق کو بند کرتے ہوئے نیند کی وادی میں کھو گئی۔

لندن بہت خوبصورت شہر ہے۔ کچھ روز تو ہمیں اپارٹمنٹ دیکھنے اور سیٹ ہونے میں لگے اور پھر شیری نے کالج جانا شروع کردیا۔ گھر سیٹ ہوا تو روٹین میں آنے کے بعد سب سے پہلے مجھے سعید کا خیال آیا' اس کا فون نمبر میں اس کی بہن سے لے آئی تھی۔ ایک روز میں نے اُسے فون کردیا' میری آواز سن کر وہ بہت حیران ہوا اور خوش بھی۔ لہجے میں وہی جوش' آواز میں وہی دلفریبی' میں اُس سے بات کرتے ہوئے جیسے پھر سے سالوں پیچھے چلی گئی۔ اسے وقار کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا تھا اور شیری کے لیے وہ بہت خوش تھا۔ کچھ دیر کی باتوں کے بعد اُس نے مجھے اور شیری کو اپنے گھر انوائیٹ کرلیا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور رات بھر میں سو نہ سکی تھی۔ شب بھر ماضی کی یادوں میں کھوئی رہی۔ آخری ملاقات' سعید کی سرخ آنکھیں اور ہمیشہ محبت نبھانے کا عہد رہ رہ کر سب کچھ آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ صبح اُٹھی تو بہت اہتمام سے اپنی تیاری میں لگ گئی۔ ہمیں لنچ وہیں کرنا تھا۔ میں جانتی تھی' اسے کالا رنگ بہت پسند تھا' میں نے کالے رنگ کی ساری باندھی اور وقت پر ہم ماں بیٹے اس کے گھر پہنچ گئے۔

اس کا عالیشان گھر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس نے یہ سب حاصل کرنے کے لیے کتنی جدوجہد کی ہوگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ میرے سامنے تھا' پہلے سے کہیں زیادہ جاذبِ نظر' اس کی کنپٹی کے سفید بال اسے مزید گریس فل بنا رہے تھے۔ شیری بھی اپنے انکل سے مل کر بہت خوش ہوا۔ وہ شیری سے اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگا اور دونوں باتوں میں مصروف ہوگئے۔ اتنے میں ایک گوری میم خالص مشرقی لباس یعنی شلوار' قمیص میں ملبوس' سر پر دوپٹہ جمائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ ابھی میں کچھ سمجھنے نا سمجھنے کی کیفیت میں ہی تھی کہ اس نے محبت سے گلے لگاتے ہوئے بہت اچھی اُردو میں میرا احوال پوچھا تو میں حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''کیوں بھئی' حیران ہوگئیں ناں' یہی ہے مریم! اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام میں نے مریم رکھا تھا اور دیکھو' خدا نے مجھے کتنی اچھی بیوی سے نوازا کہ میرے رنگ میں رنگتے ہوئے اس نے نہ صرف مذہب بلکہ میری زبان' میرا کلچر سب اپنا لیا۔'' سعید نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا۔ بلاشبہ مریم بے پناہ

خوبصورت تھی اور اتنی ہی ملنسار بھی۔ میرے دل میں عجب ٹوٹ پھوٹ سی ہونے لگی۔ سعید نے اپنے بچوں سے بھی ملوایا۔ اس آزاد ماحول میں ایسے تمیزدار اور باحیا بچے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

''یہ سب مریم کا کمال ہے جس نے بچوں کو اپنے کلچر سے باندھے رکھا ہے ورنہ میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ میں ان پر توجہ دے پاتا۔'' سعید محبت پاش نظروں سے مریم کو دیکھتے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا جبکہ مریم کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ تھی۔ یہ منظر میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ کھانے کے بعد بچے باتوں میں مشغول ہو گئے اور مریم کسی کام سے اٹھی تو سعید جیسے اچانک سنجیدہ ہو گیا۔

'شاید اب وہ اپنے دل کی بات کرے۔' میرے دل میں ایک آس سی جاگی۔

''جانتی ہو' کبھی کبھی محبت وہ نہیں ہوتی جو ہم سمجھ لیتے ہیں بلکہ وہ ہوتی ہے جس کا ہمیں کبھی گمان نہیں ہوتا۔ تم میری محبت تھیں اور کافی عرصہ میں یہی مانتا رہا مگر وہ ہمارا بچپنا تھا کیونکہ تم کسی اور کی ہو چکی تھیں پھر مجھے مریم ملی۔ شروع میں میری نیت یہی تھی کہ میں اس شادی کو پیپر میرج تک محدود رکھوں گا مگر مریم کی سادگی' اُس کا مذہب اسلام کی طرف مائل ہونا' یہ سب مجھے اس قدر بھایا کہ میں نے اُسے ایک بیوی کا درجہ دے دیا۔ آج وہ مذہب اسلام کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہے اور اب تم میرے بچے بھی دیکھ لو۔ مریم نے میرا بہت ساتھ دیا۔ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے ایسی بیوی اور بچوں سے نوازا۔'' اچانک وہ بولا۔ ''تم نے یہ کالا رنگ کیوں پہن رکھا ہے؟ مجھے تو اب ہلکے رنگ اچھے لگتے ہیں۔ تم نے دیکھا ناں مریم کو' کتنی سوبر لگتی ہے ہلکے کلر میں' ہاں تو میں کہہ رہا تھا' وہ ہماری محبت جذباتی تھی۔ سچی محبت تو وہ ہوتی ہے جس میں آدمی محبوب کے بنا جی نہ سکے اور دیکھ لو ہم دونوں بچھڑ کر بھی زندہ رہے۔ وہ تو میری بے وقوفی تھی اور کچھ نہیں۔'' میرے پاس اُس کی باتوں کا جواب دینے کے لیے کوئی الفاظ نہیں تھے بلکہ میں دُعا کر رہی تھی۔ مریم واپس آ جائے تا کہ میں ایسی باتیں سننے سے مزید بچ سکوں۔ ہم شام کو گھر لوٹے تو میرا افسردہ چہرہ دیکھ کر شیری پریشان ہو گیا۔

''مما! کیا ہوا؟ میں سمجھا' اپنے کزن سے مل کر آپ خوش ہوں گی مگر یہ کیا؟'' وہ بے چارا پوچھنے لگا اور میں اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے گویا ہوئی۔

''شیری! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم پاکستان جائیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے' میرا یہاں رہنے کا من نہیں کر رہا ہے۔''

''مما! کیا بات ہے؟'' اُس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''بس بیٹا...... ! تمہارے ابو کی بہت یاد آ رہی ہے' دل کر رہا ہے' اُن کی قبر پر جاؤں' وہ ہوائیں' وہ فضائیں' اپنا ملک' سب بہت یاد آ رہا ہے۔ بہرحال یہ فیصلہ میرا ہے۔ اگر تم یہاں رہنا چاہو تو بے شک رہو مگر مجھ سے یہ وعدہ لے کر کہ پڑھائی ختم ہوتے ہی واپس آ جاؤ گے میرے پاس۔''

وہ تڑپ کر بولا۔ ''نہیں مما...... ! جیسا آپ کہیں گی' ویسا ہی ہو گا۔ ہمارے ملک میں بھی تو لوگ پڑھتے ہی ہیں' آپ تیاری کریں' ہم واپس جائیں گے۔'' مجھے اب صبح کا انتظار تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ابھی کراچی پہنچ جاؤں۔ میں اب اپنے والدین سے معافی مانگنا چاہتی تھی جن سے میں اب تک ناراض سی رہی اور سب سے بڑھ کر' وقار سے کہ جس کی محبت میں سمجھ نہیں پائی۔ سعید نے بالکل ٹھیک کہا تھا' محبت وہ نہیں ہوتی جو ہم سمجھ لیتے ہیں۔ میں کراچی پہنچ کر سب سے پہلے قبرستان جاتی تا کہ اپنے وقار کی قبر پر اس محبت کا اظہار کر سکوں جس کے لیے وہ زندگی میں ترس گیا تھا۔ شاید میرے اس عمل سے اُس کی رُوح سرشار ہو جائے۔





تاثیر حیدری

# لمحے کی خطا

گلنار آفرین کا خیال

ہم کو وقت کی گردش نے
ڈالا کیسی الجھن میں

**ایک کمزور لمحے کی خطا کا بھگتان عمر بھر بھگتنے والی عورت کا عبرت اثر ماجرا**



''ارے' ارے بھئی' کیا کرتے ہیں؟'' ماہ رخ نے بوکھلا کر کہا۔

''یہی تو پیار ہے۔'' فرقان خان کی آواز میں شوخی نمایاں تھی۔

''کیا ہے بھئی' آپ بھی ناں' بیٹی نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گی؟'' ماہ رخ کی بے بسی پر فرقان خان کا قہقہہ بلند ہوا۔

''آپ تو ایسے شرما رہی ہیں جیسے کوئی نوخیز دوشیزہ ہوں۔ بھئی' بیس سال ہوگئے آپ کے اور ہمارے ساتھ کو۔'' وہ ہنسی دبا کر چہکے تھے۔

''خیر تو ہے' آج بڑا پیار آ رہا ہے آپ کو؟'' ماہ رخ نے باقاعدہ شرماتے ہوئے کہا۔

''آج ایک بے حد خاص دن ہے' بہت خاص۔''

''کیوں' کیا ہوا تھا آج کے دن؟ کیا ملک آزاد ہوا تھا؟''

''آزادی تو نہیں' ہاں' کسی کی ابدی غلامی کا دن ضرور ہے آج۔'' فرقان خان پھر چہکے۔

''ہائے' کون ہے وہ بدنصیب؟ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔''

''ہمارے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے لیکن ہم بدنصیب کہاں ہیں' ہم جیسا خوش نصیب تو شاید ہی کوئی اور ہو۔'' وہ فخریہ انداز سے بولے۔

''ارے......! تو میں ایک بار پھر اپنی شادی کی سالگرہ بھول گئی اور ہمیشہ کی طرح آپ کو یاد رہا۔ بڑے کمال کے آدمی ہیں آپ بھی۔'' اس نے دل سے سراہا۔

''جناب' ہم یہ یادگار دن بھلا کب بھول سکتے ہیں؟''

''اچھا' اب تو آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیں' مجھے سچ مچ لگتا ہے کہ میں نابینا ہوگئی ہوں۔'' اور فرقان خان نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں کی قید سے آزاد کردیا اور ساتھ ہی سالگرہ کا گفٹ اپنی نصف بہتر کی طرف بڑھا دیا۔ ماہ رخ نے بڑی بے تابی سے گفٹ لیا اور اسے کھولا تو اس کے اندر جیولری کا سیٹ جگمگا رہا تھا۔ ماہ رخ کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ بکھر گئے۔ اس نے خالص مشرقی انداز سے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر شکریہ ادا کیا تو فرقان خان کی روح تک سرشار ہوگئی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا مگر بیٹی رانی کے آنے پر ان دونوں کو اس پیار بھری کیفیت سے باہر آنا پڑا' پھر فرقان تو آرام کی غرض سے سونے چلے گئے اور ساتھ ہی رات کا کھانا باہر کھانے کا عندیہ بھی دے گئے جبکہ ماہ رخ اپنی رانی میں مصروف ہوگئی۔

ماہ رخ کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جو نصیب کے دھنی ہوتے ہیں۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہونا بھی اعزاز کی بات ہوتی ہے اور وہ تو اپنے چار بھائیوں میں مثلِ مہتاب چمکا کرتی تھی۔ دو بھائی اُس سے بڑے تھے اور دو چھوٹے۔ وہ چاروں بھائیوں کی محبت سمیٹ رہی تھی۔ بھائیوں کا بس نہ چلتا تھا کہ کس طرح اپنی بہن کے ناز اٹھائیں۔ بہن کے منہ سے بات نکلتی نہ تھی اور پوری ہوجایا کرتی۔ ماں باپ الگ اس کے لاڈ اٹھاتے۔ جب پیدا ہوئی تو لگتا تھا کہ پریوں کے دیس سے بھیجی گئی ہے' اتنی پیاری' اتنی حسین جو دیکھتا' بے اختیار اٹھا کر پیار کرنے لگتا۔ دن گزرتے گئے اور اس کی محبوبیت بڑھتی چلی گئی۔ پڑھائی میں اُس کا دل کم ہی لگتا تھا پھر بھی جیسے تیسے اُس نے میٹرک پاس کرلی۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اُس کا حسن دوآتشہ ہوگیا۔ جو دیکھتا' ٹھٹھک کر رک جاتا' آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ ماہ رخ کو بھی اپنے حسن کی اس تلوار کا اندازہ خوب تھا۔ کہتے ہیں' خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے' سو اس کی نازک مزاجی اور حسن صنفِ مخالف پر بجلی بن کر گرتے اور اٹھنے نہ دیتے۔ گھر والوں کو بھی اُس کے حسن نے بہت محتاط بنا دیا تھا۔ میٹرک کے بعد تعلیمی سلسلہ روک دیا گیا تھا۔ اس کے بھائیوں نے باڈی گارڈز کا روپ دھار لیا تھا۔ کہیں اکیلے بھیجنے کا تو سوال ہی کیا' وہ تو گھر میں بھی اس کے اردگرد ڈھیرا ڈالے رہتے تھے۔ اُسے یاد تھا' اُس نے اپنی اکلوتی سہیلی سے کہا تھا۔

''خدا نے مجھے چار انمول نعمتوں سے نوازا ہے۔ جن کو ایک بھی ملے' فخر کرتے تھکے۔''

''وہ کون سی؟'' نجمہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''اکلوتی ہونا' لاڈلی ہونا' حسین ہونا اور لڑکی ہونا۔'' اس نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ ''ارے' یہ بھی خوب رہی۔ تم لڑکی ہو تو کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟ بھئی' اس طرح تو ہر لڑکی کو اپنے لڑکی ہونے پر فخر کرنا چاہیے۔''

''مانا کہ تم لڑکی ہو لیکن میں لڑکی ہوں اور طرح کی۔'' اس کی آواز میں غرور کی آمیزش تھی۔ جوانی اس کے نازک بدن کی چٹکیاں لیتی تو اس کی نظریں اپنے خیالی محبوب کو ڈھونڈنے کے لیے اپنے اردگرد اٹھ جاتیں۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ کوئی مرد اس کو پسند ہی نہ کرتا تھا۔ اس کے خاندان کے نہ جانے کتنے گھبرو جوان اسے دیکھ کر آہیں بھرا کرتے' اسے پانے کی چاہ دل میں بسائے رکھتے تھے مگر ماہ رخ کو ان میں سے کسی سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی نظر میں مرد کو نڈر ہونا چاہیے' دبو نہیں اور وہ سارے کے سارے اس کے بھائیوں کے آگے دبے دبے رہتے تھے اور کبھی کوئی پیش قدمی کرنے کا خیال بھی نہ لا پاتے تھے اس لیے اس کی نظر میں وہ مرد نہیں' گرد تھے جس کا مقدر پاؤں کی ٹھوکر ہوتا ہے' پیار بھرا دل نہیں۔ جوانی کی امنگوں میں اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی تو آئے اور اسے فتح کرلے' کوئی جملہ اچھالے' کوئی شرارت کرے لیکن ایسا کوئی مرد اسے دور دور تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ بظاہر وہ جس قدر بارعب اور مغرور لگتی تھی' اندر سے اتنی ہی کمزور ایک حد تک دکھی لڑکی تھی۔ اپنے جوانی کے اس دکھ کو وہ کسی کے آگے بیان بھی نہ کرسکتی کہ یہ بات اس کی شان کے خلاف تھی۔ وہ تو نجمہ تک کو یہ بات نہیں بتا سکتی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میری چار خوبیاں بے مثال ہیں لیکن جوانی کی دہلیز پار کرنے پر اس پر یہ کھلا کہ اکلوتی اور چہیتی ہونا اس کی خوبیاں نہیں' خامیاں ہیں جنہوں نے اسے اور اس کی جوانی کو بہار کی خوشیوں سے دور کر رکھا تھا اور پھر جابر ایک انقلاب بن کر اس کی زندگی میں آ گیا۔

•......•......•......•

''رانو بیٹا......! یہ لو گرما گرم چائے۔'' ماہ رخ نے اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔

''اوہ' تھینک یو امی......! یو آر گریٹ!''

''اچھا' اچھا' اب زیادہ مسکہ نہ لگاؤ۔ تم تو بس اپنے پاپا کی بیٹی ہو۔''

''ارے نہیں امی......! آپ تو میری جان ہیں' قسم سے۔'' اُس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''اچھا بیٹا......! چائے پی لو اور پھر آرام سے سو جاؤ۔ وقت دیکھا ہے؟'' وہ اپنائیت سے بولی۔

''امی......! صبح میرا پیپر ہے۔''

''جانتی ہوں مگر بیٹا......! آرام بھی تو ضروری ہے' بس اب اور نہیں پڑھو۔''

''امی......! مجھے فرسٹ پوزیشن لینی ہے۔ آپ کو پتہ تو ہے میرے ٹارگٹ کا۔''

''جانے بھی دو' تم نے کون سا کوئی جج بننا ہے' بس اب چھوڑو یہ پڑھائی وڑائی اور گھر گرہستی سیکھو۔ آخر لڑکیوں نے گھر ہی سنبھالنا ہوتا ہے۔''

''ارے واہ' میں نے تو بہت پڑھنا ہے' آگے بڑھنا ہے' اپنے خاندان کا نام روشن کرنا ہے۔''

''نہیں بیٹا......! بس اتنی تعلیم کافی ہے۔ مرد زدہ اس معاشرے میں عورت ہمیشہ ستم زدہ ہی رہی ہے۔ تم نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی ہے' یہ تو سانپ کی طرح ہے جس کی جلد نرم ہے اور اندر زہر بھرا ہوا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں نمی اور لہجے میں تلخی در آئی تھی۔ رانی نے بڑے غور سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کی باتیں کرتی اپنی ماں اسے بڑی پراسرار لگتی تھی اور یہ بات آج تک اس کی سمجھ میں نہ آ سکی تھی کہ ایسا کیوں تھا؟ اس کی ماں کا اس حوالے سے محتاط رویہ اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔ اسے یاد نہیں کہ کبھی اس کی ماں نے اسے گھر سے باہر تنہا بھیجا ہو۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک بار اس کی عزیز ترین سہیلی نورین نے جب اپنی سالگرہ کے لیے گھر لے جانے کی درخواست کی تو اس کی امی نے اتنی سختی سے انکار کیا تھا کہ اس کی سہیلی بے چاری شرمندہ ہو کر رو پڑی تھی اور رانو سوائے آنکھیں چرانے کے اور کر ہی کیا سکتی تھی! تب سے آج تک یہ بات اس کے لیے پہیلی بنی ہوئی تھی کہ ماں کا اس کے حوالے سے رویہ شدت پسندانہ کیوں ہے؟ کیا اس کی ماں کو اپنی بیٹی پر اعتبار نہیں ہے؟ ایسے کئی سوال اس کے ذہن میں کلبلاتے رہتے مگر وہ ان سوالوں کو کبھی اپنی زبان تک نہ لائی تھی' شاید اسے پتہ تھا کہ اس کی ماں ان سوالوں کا تسلی بخش جواب نہ دے پائے گی اور جھڑک دے گی۔

''ارے یہ میری بیٹی بقراط کب سے بننے لگی؟'' بابا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''دیکھیں نا بابا' امی کہتی ہیں' میٹرک کے بعد میں تعلیم چھوڑ دوں۔'' اس نے منہ بسورتے ہوئے ماں کی شکایت کی۔

''ارے واہ' یہ کیا بات ہوئی۔''

''میں لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے قطعاً حق میں نہیں۔'' ماہ رخ کے لہجے میں ٹھہراؤ سا تھا۔

''ہاں تو یہ بیٹی کب ہے میری' یہ تو میرا بیٹا ہے۔'' وہ چہکے۔ ''بیٹا! بات اصل میں یہ ہے کہ تمہاری ماں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی' وہ نہیں چاہتی کہ تم پڑھائی میں اُن سے آگے نکل جاؤ۔'' اُن کے لہجے میں شرارت تھی۔

''باپ نے ایم ایس سی کیا تو بیٹی کو بھی کم از کم ایم ایس سی تو کرنی ہی چاہیے نا' کیوں بیٹا؟''

''بالکل ٹھیک کہا بابا' آپ نے۔ انشاء اللہ' ایسا ضرور ہوگا۔'' رانی کا لہجہ خوشی سے سرشار تھا اور فرقان خان نے مسرت سے سر ہلایا۔ انہیں رانی سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ شادی کے پانچ سال بعد اس کی آمد ہوئی تھی اور رانی ہی گھر کی واحد خوشی تھی۔ انہیں تو اس کی خوشی میں خوش ہونا ہی تھا۔

•......•......•......•

جابر خان' اس کے ابو کے کزن کا بیٹا تھا۔ اس کے ابو کی طرح جابر خان کے والد وقار خان بھی ایک بڑے جاگیردار تھے۔ جابر ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ گاؤں میں ان کی ایک محل نما حویلی تھی۔ ماں باپ کا لاڈلا ہونے کی وجہ سے جابر خان نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ واجبی سی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جابر کے مشاغل وہی تھے جو ایک وڈیرے کے ہو سکتے ہیں' شراب و شباب کا رسیا تھا' لڑائی بھڑائی میں بھی اس کے خوب ہاتھ پاؤں چلتے تھے' گاؤں کے لوگ اس کی ہیبت سے خوف زدہ رہتے تھے' اس کی اپنی ہی الگ دنیا تھی۔ گاؤں سے جی اچاٹ ہوا تو اس نے اپنے باپ سے شہر میں رہنے کی ضد کی جو حسب سابق پوری کر دی گئی اور یوں وہ شہر میں اپنی نئی تعمیر شدہ کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ گاؤں میں ہونے کی وجہ سے اُن لوگوں کا کبھی کبھار ہی آنا جانا ہوتا



تھا۔ اب شہر میں آنے سے یہ دوری دور ہو گئی۔ جابر کی نظر جب پہلی بار ماہ رخ پر پڑی تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ افسوس کرنے لگا کہ پہلے اس کا سامنا اس دوشیزہ سے کیوں نہیں ہوا؟ وہ ایک ہی نظر میں اس کے دل میں اتر گئی تھی پھر وہ بہانے بہانے سے اس کے گھر کے چکر لگانے لگا۔ کبھی کوئی جملہ اچھال دیتا' کبھی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کر لیتا' کبھی کوئی دلچسپ سی نوک جھونک ان کے درمیان ہونے لگتی اور یوں وہ ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ ماہ رخ کو لگا' یہی اس کے خوابوں کا وہ شہزادہ ہے جس کی وہ منتظر تھی۔ اس کی بہادری نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ ایسا جی دار تھا کہ اس کے چار عدد باڈی گارڈز کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا بلکہ ماہ رخ یہ دیکھ کر حیران ہوتی تھی کہ اس کے باڈی گارڈز نما بھائی جابر کے آگے کچھ دبے دبے سے نظر آتے تھے۔ اس کے اندر کی تمام اداسی دم توڑ گئی۔ اب وہ ہر آہٹ پر جابر کی منتظر رہتی۔ وہ بھی کوئی دن ضائع نہ کرتا اور کسی نہ کسی وقت آن ٹپکتا۔ جابر کا زیادہ تر وقت ماہ رخ کے گھر میں ہی گزرتا چونکہ قریبی عزیز تھا لہٰذا کسی کو بھی اس کے آنے پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔ ویسے بھی بھائیوں کی موجودگی میں اس کے والدین ماہ رخ کی طرف سے کافی مطمئن تھے۔

ایک دن اچانک ماہ رخ کے دادا جان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔ بدحواسی کے عالم میں ماہ رخ کو ان سب نے اکیلا چھوڑا اور یہ جا' وہ جا۔ دادا جان' ماہ رخ کے تایا کے گھر میں رہا کرتے تھے جو گاؤں میں تھا۔ ماہ رخ اکیلی تھی اور اسے رہ رہ کر جابر کا خیال ستا رہا تھا اور پھر اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ جابر کی آمد نے اس کے چہرے پر خوشی کے کئی رنگ بکھیر دیئے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں جابر نے ماہ رخ سے فرمائش کر ڈالی کہ وہ اسے اپنا کمرا دکھائے۔ ماہ رخ نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ پیار بھری باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ شرارتوں میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ آج جابر کی بے باکی عروج پر تھی' وہ دونوں ایک ہی صوفے پر پاس پاس بیٹھے دوری کو قربت میں بدلتے چلے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ جابر اس پر چھاتا چلا گیا۔ اس نے شروع میں کچھ مزاحمت تو کی مگر پھر کمزور لمحات کی مضبوط گرفت میں جکڑتی چلی گئی۔ اسے لگا کہ وہ ایک ایسی ڈھلوان پر کھڑی ہے جس پر پاؤں اٹھتے نہیں' اکھڑتے ہیں اور وہ بھی ہوس کی وادی میں گرتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ جذبات کی تپش سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ بے ساختہ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں' وہ اب جابر کے رحم و کرم پر تھی۔ دل کی بستی نے لوٹنے والے کے لیے اپنے سارے دروازے کھول دیئے تھے کہ اچانک وہ سب ہو گیا جس کی ماہ رخ کو توقع نہ تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر دیکھا' جابر اس سے جدا ہو کر کچھ قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ ایسا کیوں ہوا؟

''نہیں ماہ رخ' میں پھل کو توڑ کر نہیں' خرید کر کھاؤں گا کیونکہ مجھے تم سے پیار ہے' مجھے تمہارے جسم کی نہیں' تمہارے دل کی ضرورت ہے۔'' اس کے الفاظ بہار کی پہلی بارش کی دلفریب پھوار بن کر اس کے جذباتی وجود کو سرد کرتے چلے گئے اور اس نے آنکھ اٹھا کر جابر کو دیکھا جواب جابر نہیں' اس کا محبوب بن چکا تھا جس کی خاطر وہ ہر طوفان سے ٹکرا سکتی تھی۔

•......•......•......•

''ماہ رخ بی بی' بڑی گھنی ہو تم' مٹھائی ہضم کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' یہ نجمہ تھی جو نجانے ایک دن اس کے گھر آن دھمکی تھی۔

''کیسی مٹھائی بھئی' کیا میری لاٹری نکل آئی

ہے؟'' اس کی آواز میں حیرت پوشیدہ تھی۔

''اب اتنا بھی نہ بنو' تم نے جو بات مجھ سے چھپائی' وہ کہیں نہ کہیں سے مجھے پتہ چل ہی گئی۔''

''کیسی بات' کیا چھپایا ہے؟ کچھ پتہ بھی تو چلے؟''

''بس' بس رہنے دو' مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ تمہاری ایک ہی تو دوست ہوں' تم نے پھر بھی غیر کا سلوک کیا ہے میرے ساتھ' دل تو کرتا تھا' تمہاری شکل کبھی نہ دیکھوں مگر......''

''نجمہ کی بچی......! ٹھیک سے بات بتاتی ہو یا دکھاؤں تمہیں ہاتھ کی صفائی؟'' اس نے باقاعدہ آستین الٹ لیے۔

''واہ' کیا اچھا بر ملا ہے تمہیں' فرقان خان...... ہاں بھئی' تمہارے تو نصیب ہی نرالے ہیں' لگتا ہے' تمہاری اپنی مرضی سے لکھے گئے ہیں۔''

''تم گھاس تو نہیں کھا گئی' یہ کیا بکے جا رہی ہو؟''

''واہ جی' واہ' قسم سے' تمہاری اداکاری کے کیا کہنے' تمہیں تو کسی فلم یا ڈرامے کی ہیروئن ہونا چاہیے' بہت ہٹ ہو جاؤ گی تم۔'' نجمہ نے اسے چھیڑا۔

''نجمہ کی بچی......'' وہ چیخی۔

''وہ تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی' تم خوامخواہ اسے پکار کر اپنا گلہ خراب کر رہی ہو۔'' نجمہ چہکی۔

''نجمہ' پلیز' مجھے تنگ مت کرو' لگتا ہے' تم مجھے آج پاگل کر کے چھوڑو گی۔ خدا کی قسم' ایسی کوئی بات کم از کم میرے علم میں تو نہیں۔'' اس کے لہجے میں بےزاری در آئی تھی۔

''ارے' کیا واقعی؟ تو پھر انکل نے مجھے...... اچھا خیر چھوڑو' یہ بتاؤ کہ کیا گھر میں سب خیریت ہے ناں؟ کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہوئی؟'' نجمہ نے نرمی سے پوچھا اور ماہ رخ سوچ میں ڈوب گئی۔ واقعی اسے چند دنوں سے گھر کی فضا پراسرار نظر آتی تھی۔ فرقان کی امی اور ابو بھی دو ایک بار گھر کا چکر لگا چکے تھے تو کیا...... تو کیا نجمہ کی بات سچی تھی کہ...... مگر وہ اس سے آگے سوچ نہ سکی۔

''نجمہ' سچ سچ بتاؤ' کیا بات ہے؟'' اس نے بدحواسی سے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''بھئی' کل شام کو انکل نے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ فرقان کے گھر والے بار بار ماہ رخ کے رشتے کے لیے چکر لگا رہے ہیں۔ اتنے دن ہو گئے ہیں' تم اپنی ماہ رخ سے ملنے ہی نہیں آئیں؟'' اس نے بات واضح کر دی اور ماہ رخ چکرا کر رہ گئی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ ابو جان نے نجمہ کو یہ اطلاع کیوں دی؟ شاید وہ اس سے براہ راست بات کرنے اور اس کی رائے جاننے سے گریزاں تھے تو کیا وہ جانتے تھے کہ وہ جابر کو...... مگر کیسے؟ اس نے تو بہت احتیاط سے کام لیا تھا' کبھی جابر کے گھر نہ گئی تھی' سب کے سامنے اس سے لیے دیئے رہتی مگر پھر بھی ابو نے کیسے جان لیا کہ میں......؟ اس خبر نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ وہ جابر کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی نظر میں وہی واحد مرد تھا اور اس قابل تھا کہ اس پر دل کے دروازے وا کیے جا سکتے تھے تو اب کیا ہوگا؟ اگر اس کے ابو نے اس سے پوچھے بنا ہاں کر دی تو کیا وہ جراتِ انکار کر سکتی تھی؟ کیا اس کے بس میں تھا کہ بڑوں کے فیصلوں کے آگے تن کر کھڑی ہو سکتی؟ شاید نہیں۔ وہ جس معاشرے میں رہتی تھی' وہاں عورتوں کو یہ حق دیا ہی کب جاتا تھا کہ وہ اپنے بڑوں کے فیصلوں سے انحراف کر سکیں۔ ان سے پوچھا ہی کب جاتا تھا؟ انہیں تو بس اطلاع دے دی جاتی تھی اور وہ بڑوں کے ان فیصلوں کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر سرِ تسلیم خم کر لیا کرتی تھیں۔ نہیں' اسے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا اس سے قبل کہ دیر ہو جائے' اس سے پہلے کہ فیصلہ ہو جائے اور سر جھکائے بنا کوئی چارہ نہ رہے۔



•......•......•......•

''ابو جان......! مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے؟'' اس دن وہ موقع پا کر ابو کے اسٹڈی روم میں جا گھسی۔ وہ حسب دستور کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔

''ہاں بیٹا' کہو' کیا کہنا ہے؟'' نظریں بدستور کتاب پر تھیں۔ وہ ہمت کر کے اپنے ابو کے پاس آ تو گئی مگر اب لگتا تھا کہ اس کی زبان تالو سے چمٹ سی گئی ہو۔ ایسی صورتِ حال پہلے تو کبھی درپیش نہ تھی' وہ تو اپنے ابو کے ساتھ بہت بے تکلف تھی جو منہ میں آتا' بول دیا کرتی تھی۔ یہ آج اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا تھا کہ نہ زبان ساتھ دے رہی تھی اور نہ ذہن؟

''بولو نا بیٹا! چپ کیوں ہو گئی ہو؟'' ابو نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ابو......! وہ...... وہ ابو......! ام...... میں نے سنا ہے کہ...... میں نے سنا ہے کہ وہ......''

''بیٹا......! جو کچھ کہنا ہے' جلدی کہو' شاباش! اس میں اتنا ڈرنے والی بات کیا ہے آخر؟'' ابو جان کی آواز میں دنیا جہان کا پیار امڈ آیا تھا۔

''ابو! میں نے سنا ہے کہ فرقان کے گھر والے......''

''ارے تو یہ بات ہے' ہاں بیٹا......! یہ سچ ہے اور سچی بات یہ ہے کہ میں خود بھی اس رشتے کے حق میں ہوں۔ فرقان کوئی غیر نہیں' تمہارا ماموں زاد ہے' پڑھا لکھا' سلجھا ہوا' عمدہ اخلاق و کردار کا حامل۔ مجھے تو خاندان بھر میں کوئی اس کا جوڑ نظر نہیں آتا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بیٹی کی قدر کرے گا' پیار سے رکھے گا انشاء اللہ!'' اس کے ابو اعظم خان کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ لگتا تھا کہ وہ خود فرقان پر دل و جان سے فدا ہو چکے ہیں۔

''مگر ابو......! مجھے اس سے شادی نہیں کرنی...... مجھے جابر خان......''

''نہیں بیٹا! ایسا مت کرو' مجھے افسوس ہوگا اگر تم نے اس رشتے کو ٹھکرا دیا تو۔'' ابو نے بات کاٹی تھی۔

''مگر ابو......! جابر میں کیا برائی ہے؟ وہ بھی تو رشتہ دار ہے' ہماری ہی برادری کا ہے۔'' اس کی آواز میں بےبسی کا رنگ غالب تھا۔

''بیٹا......! کچھ باتیں بتائی نہیں جا سکتیں' وقت آنے پر خود ہی انسان کو سمجھ آ جاتی ہیں۔ دیکھ لینا' ایک دن تمہیں ہمارے فیصلے کا قائل ہونا پڑے گا۔ تم مان جاؤ گی کہ ہم نے تمہارا ہاتھ فرقان کے ہاتھ میں سونپ کر اچھا کیا تھا۔''

''مگر ابو......! کیا آپ مجھ سے یہ حق چھین رہے ہیں کہ اپنی شادی کا فیصلہ میں خود کروں؟'' اس نے بےبسی سے باپ کو دیکھا۔

''بیٹا......! یہ تمہارا حق ہے کہ اپنی پسند' ناپسند کا فیصلہ تم خود کرو' تم خوب غور کرو مگر پرسوں مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ مجھے امید ہے کہ تم میرا مان نہیں توڑو گی۔'' اعظم خان کے لہجے میں ایک عجیب طرح کا اعتماد تھا جیسے وہ جانتے تھے کہ اُن کی بیٹی ان کی مرضی کا ہی فیصلہ کرے گی۔

•......•......•......•

جابر نے سنا تو پھٹے بنا نہ رہ سکا' سارا غصہ اس نے ماہ رخ پر نکالا۔ یہ تو شکر ہے کہ بات چیت فون پر ہی ہو رہی تھی' اگر سامنے ہوتی تو نجانے کیا کر دیتا۔

''جابر' تم تو ایسے بگڑ رہے ہو جیسے فرقان کے گھر والے میری دعوت پر میرا رشتہ لینے آئے تھے؟''

''سوری جان' یہ بات ہی ایسی تھی کہ میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔'' اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''تم مرد ہو کر خود پہ قابو نہیں پا رہے پھر میں تو ایک لڑکی ہوں' سوچو' میری کیفیت کیا ہو گی؟'' وہ سسک پڑی۔ ''جابر...... کچھ کرو' اگر ابو نے ہاں کر دی تو...... تو میں کچھ بھی نہ کر پاؤں گی۔ میں نے ابو

سے تمہارا نام لے دیا تھا مگر وہ تمہیں ناپسند کرتے ہیں۔ پلیز، تم اپنے والدین کو بھیجو۔‘‘ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

’’تم فکر نہ کرو، کرتے ہیں کچھ۔ اگر گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلا تو پھر......‘‘

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘

’’کورٹ میرج کر لیں گے ہم......‘‘

’’نہیں، ہرگز نہیں۔‘‘ وہ تڑپ اٹھی تھی۔ ’’میں مر جاؤں گی مگر یہ قدم نہیں اٹھا پاؤں گی، کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔‘‘

’’اچھا، دیکھتے ہیں۔ تم ایک کام کرو، آج کسی وقت مجھے ملو۔‘‘ جابر کے لہجے میں کوئی خاص بات تھی جس نے اُسے چونکا دیا۔ وہ آج تک کبھی اکیلی باہر نہیں نکلی تھی، اپنے کسی رشتہ دار کے گھر اکیلی نہیں گئی تھی، ہوٹل میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر جابر نے ایک نہ سنی، اس نے پرزور انداز میں اپنا مطالبہ دہرایا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

’میں ہرگز نہیں جاؤں گی......‘ اس نے دل ہی دل میں اپنے عزم کو دہرایا تھا۔

*......*......*......*

اس نے خود کو لاکھ روکنا چاہا مگر اس کے قدم گھر کی دہلیز پہلی بار پار کر ہی گئے۔ گھر میں بہانہ بنا کر وہ ہوٹل نشاط جا پہنچی۔ اسے یقین تھا کہ اس برقعے میں کوئی اپنا بھی اسے پہچان نہیں پاتا۔ اس کے قدم بے اختیار اپنے محبوب کی طرف اٹھ گئے تھے۔ جیسے اسے اپنے قدموں، ارادوں اور خود اپنے آپ پر کوئی اختیار نہ رہا ہو، سو وہ بے اختیار قدموں کے ساتھ اپنے محبوب کے قدموں میں پہنچ گئی مگر جب ہوٹل سے نکلی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ جب گئی تو صحیح و سالم تھی، جب لوٹی تو اپنے گوہرِ عصمت کو گنوا چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا یا تو جابر کی بوٹیاں کر دے یا خود اپنے آپ کو ختم کر ڈالے۔ آخر اس نے باہر نکلنے اور ہوٹل میں جانے کا فیصلہ ہی کیوں کیا تھا؟ کیا وہ اتنی کم عقل تھی کہ تنہائی میں کسی مرد سے ملنے کے نقصان سے واقف نہ ہوتی؟ ایک بار پہلے بھی وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی مگر جابر نے اپنا اعتماد جمانے کے لیے اسے چھوڑ دیا تھا، وہ بہت کائیاں تھا شاید، ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی، اس کی جس ادا کو وہ پیار سمجھی تھی، وہ جابر کی احتیاط پسندی تھی۔ آج اس پر کھلا تھا کہ وہ اتنا بڑا قدم اس کے گھر میں نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ گھر پہنچی تو یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا تھا کہ امی گھر پر موجود نہ تھیں۔ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی اور بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کو رونا آ رہا تھا، اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ وہ آج کے واقعے پر سوچنا بھی نہ چاہتی تھی۔ وہ محبوب سے ملاقات کا اثر تھا، جذبوں کی روانی تھی یا اس مشروب کی کارستانی کہ جسے پی کر وہ بہکنے لگی تھی اور کئی گھنٹوں تک ہوش سے بیگانہ رہی تھی اور اب وہ دوشیزگی سے بیگانہ ہو گئی۔ کاش، اس نے اپنے قدم روک لیے ہوتے، اے کاش مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے اور پھر اس نے ایک فیصلہ کر لیا، ایک اٹل فیصلہ۔

*......*......*......*

انہوں نے آنکھ اٹھا کر اپنی عزیز از جان بیٹی کی طرف دیکھا، انہیں بے طرح پیار آیا تھا اس پر۔ آخر اس نے ان کا مان رکھ لیا اور ان کی روح تک سرشار ہو گئی تھی۔

’’بیٹا! مجھے تم پر فخر ہے۔ دیکھنا، تم سدا سکھی رہو گی۔‘‘ شدتِ مسرت سے اُن کی آواز لرز رہی تھی۔ اس نے اتنا خوش اپنے بابا کو کبھی نہ دیکھا تھا۔

’’لیکن بابا! میری ایک شرط ہے۔‘‘ اس نے بڑے مان سے کہا۔

’’کہو، کہو بیٹا! ایک کیا، مجھے تمہاری ایک ہزار



شرطیں منظور ہیں۔‘‘

’’بابا! میری شادی چھ ماہ بعد ہونی چاہیے۔ میں چاہوں گی کہ چھ ماہ سے پہلے میری شادی ہرگز نہ ہو۔‘‘

’’ٹھیک ہے بیٹا......! ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے، تم بے فکر رہو۔ جیسا تم چاہو گی، ویسا ہی ہو گا۔‘‘ اس کے ابا جان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ماہ رخ بے ساختہ اپنے بیڈ پر ڈھے سی گئی۔ اس نے شادی میں تاخیر کا فیصلہ جان بوجھ کر کیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کہیں اس کے وجود میں ناپاک وجود تو پنپ نہیں رہا؟ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو وہ اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی۔ وہ دل ہی دل میں دُعا کر رہی تھی کہ اللہ ایسی نوبت ہی نہ آنے دے۔ وہ اپنے اس فعل پر بے حد شرمسار تھی۔ آخر اس کے رَب نے اس کی دُعا سن لی۔ اس کے سارے خدشات ریت کی دیوار ثابت ہوئے تھے۔ اب وہ خود شادی کے لیے تیار تھی۔ ایک بلا اس کے سر سے ٹل گئی تھی۔ اس پر وہ اپنے رَب کا جتنا بھی شکر ادا کرتی، کم تھا۔

*......*......*......*

اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جب وہ فرقان خان کی دلہن کے روپ میں اس کے گھر میں آن وارد ہوئی۔ فرقان خان کی قربت میں اسے وہ پیار نصیب ہوا کہ اس کی روح سرشار ہو گئی۔ سارے زخم مندمل ہو گئے۔ شادی کے بعد لگا کہ اسے دنیا میں ہی جنت مل گئی ہے۔ شادی کے چھ ماہ بڑے سکون سے گزرے کہ اچانک ایک فون کال نے اس کی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ یہ تو شکر ہوا کہ کال اس نے خود اٹینڈ کی تھی۔ اس کا شوہر بھی اس وقت گھر پر موجود نہ تھا۔ یہ جابر تھا جس نے کئی ماہ بعد اسے مخاطب کرنے کی جرات کی تھی۔

’’ذلیل، کمینے، وحشی، تمہاری جرات کیسے ہوئی میرے گھر کال کرنے کی؟‘‘ وہ پھٹ ہی تو پڑی تھی۔

’’کیا کروں جان، تمہیں بھلانے کی بڑی کوشش کی مگر......‘‘ وہ خباثت بھرے لہجے میں بولا۔

’’بکواس مت کرو اور خبردار، آئندہ فون کیا تو۔‘‘ اس کا غصہ عروج پر تھا۔

’’جان، بہت دن ہو گئے تمہیں دیکھے ہوئے، پلیز، کسی دن آؤ نا نشاط میں تاکہ میری نشاط کا کوئی پہلو نکلے۔‘‘ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

’’میں تھوکنا بھی گوارہ نہیں کرتی تم پر۔ اب تو میں مر کر بھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔‘‘ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اس کی بوٹیاں کر دے۔

’’جان، مجھے سختی پر مجبور نہ کرو، سیدھی انگلی سے کام نہ نکلے تو میں انگلی ٹیڑھی کرنا خوب جانتا ہوں۔‘‘ وہ مکاری سے بولا۔

’’شٹ اپ، یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا، ڈرتی نہیں ہوں میں تم سے۔‘‘

’’او کے! کل تمہیں میرا گفٹ ملے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پھر تم خود مجھ سے رابطہ کرو گی۔‘‘ لائن بے جان ہو گئی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ جانتی تھی کہ وہ جرائم پیشہ اور بدمعاش قسم کا آدمی ہے۔ اسے رہ رہ کر اس کی دھمکی پریشان کر رہی تھی۔ نجانے وہ کس گفٹ کی بات کر رہا تھا؟ اور پھر جب اسے گفٹ ملا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ جابر اس حد تک گر سکتا تھا، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ شرمناک مناظر اس کی روح کو تڑپا رہے تھے۔ اس کے بیڈ پر پڑی تصویریں ان لمحوں کو بیان کر رہے تھے جب وہ ہوٹل نشاط میں بے سدھ پڑی تھی۔ اگر یہ تصویریں اس کے گھر والے یا سسرال والے دیکھ لیتے تو کیا ہوتا؟ اس تصور نے ہی اسے ہلا کر رکھ دیا تھا اور پھر جیسے اسے ہوش آ گیا، وہ فون پر جھپٹی۔

’’ہاں جان، کیسے فون کیا؟ خیریت تو ہے؟‘‘

""بتاؤ' کیا مانگتے ہو' دس لاکھ' بیس لاکھ' پچاس لاکھ؟""

""صرف تمہارا پیار' چند نشاط بھرے لمحات اور بس۔"" جابر کی مکروہ آواز نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔

""نہیں پلیز' مجھے مجبور مت کرو' میں ایسا نہیں کر سکتی۔"" وہ رو دی تھی۔

""ٹھیک ہے پھر چند ایسے ہی پیکٹ میں تمہارے گھر والوں اور شوہر کو بھیج دیتا ہوں۔ او کے' بائے۔""

""نہیں...... رکو...... پلیز رکو...... مجھے سوچنے دو پلیز۔""

""سوچ لو' جب کسی نتیجے پر پہنچ جاؤ تو مجھے بتا دینا۔ مجھے امید ہے' تم عقل مندی کا مظاہرہ کرو گی۔""

*......*......*

اور پھر اس کے قدم ایک بار پھر گھر کی دہلیز عبور کر گئے۔ اگر وہ پہلی بار قدم گھر سے باہر نہ نکالتی تو آج اسے مجبوراً ایسا نہ کرنا پڑتا مگر اب کیا ہو سکتا تھا' گھر کو تباہی سے بچانے کے لیے اس کے پاس سوائے اس کے چارہ ہی کیا تھا کہ وہ کھلونے کی طرح جابر کا دل لبھاتی رہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ فرقان کو بتا دے' وہ اس پر جان دیتا تھا مگر اس کے اندر سے ایک آواز ابھری کہ مرد کی غیرت یہ بات کبھی برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کی بیوی...... اگر وہ بتا دیتی تو وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنا تو ایک طرف رہا' وہ اس پر تھوکنا بھی گوارہ نہ کرتا اور پھر اسے یہی مناسب لگا کہ وہ سر تسلیم خم کر دے۔ جابر جب چاہتا' اسے بلوا لیا کرتا لیکن کم از کم یہ احتیاط ضرور کرتا تھا کہ جب کبھی فرقان خان شہر میں موجود نہ ہوتا' وہ تب اسے دن کے وقت کال کرتا تھا۔ نجانے وہ کیسے اس کے بارے میں خبر رکھتا تھا؟ دن گزرتے گئے اور یہ شیطانی کھیل جاری رہا۔ آہستہ آہستہ اس کا ضمیر شیطان کی تھپکیوں کے زیر اثر سوتا چلا گیا اور یوں ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ ماہ رخ خوش تھی کہ اس کے گناہ کی کسی کو ہوا تک نہ لگی تھی۔

*......*......*

اس روز جابر کی بات سن کر اسے لگا کہ اس کے وجود کے اندر ایک بم پھٹا جس نے اس کے پورے وجود کو لاتعداد ٹکڑوں میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہو۔ نجانے وہ کس طرح لڑکھڑاتے وجود کو سنبھالتی گھر پہنچی تھی۔ اس کے پاؤں ہی نہیں ہلے تھے' یوں لگتا تھا جیسے اس کے نیچے سے زمین ہل گئی ہو۔ آج حسبِ معمول جابر نے اس کے خاوند کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے پھر کال کیا تھا۔ جب وہ جا رہی تھی تو اسے معمول کی کارروائی سمجھی تھی لیکن جب لوٹی تو اسے لگا جیسے اس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی ہو۔ اس کا کہا ہوا ایک جملہ اس کے دماغ کو بھک کی طرح اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اے کاش جو اس نے سنا' وہ اس نے نہ سنا ہوتا۔ کاش وہ وہاں کبھی نہ گئی ہوتی یا کم از کم آج نہ گئی ہوتی۔ آج سے پہلے وہ سمجھتی تھی کہ اس کا گھر مضبوط بنیادوں پر قائم ہے مگر آج اسے لگ رہا تھا کہ وہ تو بارود کے ڈھیر پر بیٹھی تھی جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ اس کے پاس تین راستے تھے اور ہر راستہ کٹھن' پہلا یہ کہ وہ فرقان خان کو سب کچھ بتا دیتی اور یوں اپنے گھر کو برباد کر ڈالتی' اپنی ہنستی بستی دنیا اجاڑ دیتی۔ دوسرا راستہ خودکشی کا تھا جس کے بعد ابدی ہلاکت اس کا مقدر ہوتی اور تیسرا راستہ...... یہ تیسرا راستہ' یہ تو سب سے مشکل تھا کہ وہ جابر کی بات مان لیتی مگر وہ ایسا تو مر کر بھی نہ کر سکتی تھی۔ آخر وہ ایک ماں تھی۔ اگر یہ قدم اٹھاتی تو کبھی بھی اپنی بیٹی سے نظریں نہ ملا پاتی۔ وہ ایک ماں کا بھرم توڑ دیتی



اور اپنے مقام سے نہیں نیچے' بہت نیچے گر جاتی مگر نہیں' وہ ماں تھی ہی کب؟ ایسی ماں جس کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے' جس عورت کے پاؤں اس کی جوانی کا بوجھ نہ اٹھا سکیں اور لڑکھڑا جائیں' ان ماؤں کے قدموں تلے جنت نہیں' آتش فشاں ہوتے ہیں جس کا لاوا سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ اس کے قدموں تلے موجود آتش فشاں بھی اب کسی وقت پھٹ سکتا تھا اور وہ اپنے گھر کو' اپنی بیٹی کو اور خود اپنے آپ کو بھی نہ بچا پاتی۔ کتنی بے بس ہو گئی تھی وہ۔ آج اس کے سارے مان ٹوٹ گئے تھے۔ آج وہ ان لمحوں کو کوس رہی تھی جب اس کے قدموں نے پہلی بار اپنے گھر کی دہلیز کو پار کیا تھا اور آج یوں لگتا تھا کہ وہ کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے ہمیشہ یہ دعا کی تھی کہ اس کے دکھوں کا سایہ اس کی بیٹی کے نصیب پر کبھی نہ پڑے مگر وہ اپنی سوچوں کے گرداب میں پھنسی ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی' اس کو یوں لگا جیسے اس کے بہت قریب کوئی دھماکہ ہوا ہو۔ وہ جان گئی تھی کہ دوسری طرف جابر ہو گا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون اٹھایا۔

""ہاں جان' کیا سوچا تم نے؟ تو کب لا رہی ہو رانی کو میرے پاس؟"" اس کی مکروہ آواز اس کے وجود کو جلاتی چلی گئی اور فون اس کے ہاتھ سے چھوٹتا چلا گیا۔ اس کے بدترین خدشات بالآخر درست ثابت ہوئے تھے۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کا جسم لٹو بن گیا ہو' وہ لڑکھڑاتی ہوئی منہ کے بل قالین پر گری۔

""سنا ہے' تمہاری بیٹی جوان ہو گئی ہے اور وہ تمہارا دوسرا روپ ہے؟ کبھی لے آؤ ناں' ہم بھی تو دیکھیں۔""

""ہاں جان' کیا سوچا تو کب لا رہی ہو رانی کو میرے پاس؟"" جابر کے یہ جملے اس کی سماعت پر ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ اس کے آنسو

## یہ دسمبر......

یہ دسمبر مجھ کو ڈستا ہے!
بتاؤ کیا کروں! کس طرف جاؤں!
بتاؤں' کس کو میں!
اِک دھڑکا سا لگا دیتا ہے مجھ کو
یہ دسمبر مجھ کو ڈستا ہے!
باتوں میں اُلجھے سوالوں میں
یہ لے جائے مجھے
جن نظروں سے لوگ دیکھیں
وہ نظریں مجھ کو چبھتی ہیں
سنو!
یہ حیات اور سارا جیون مجھے
صحرا صحرا لگتا ہے
یہ دسمبر مجھ کو ڈستا ہے
یادوں کی ہے اِک اُلجھن
اور بچھڑ جانے کا غم
اندھے ہیں یہ لوگ سارے
اور! اندھی ہر اِک راہ گزر
یہ دسمبر مجھ کو ڈستا ہے!

خالدہ شفق۔ ملتان

رواں ہو گئے۔ وہ سسک رہی تھی، تڑپ رہی تھی، کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر اس کی سسکیاں بلند ہوئیں جو آہستہ آہستہ دبی دبی چیخوں میں بدلتی چلی گئی۔ اس کا ذہن جابر کی مکروہ آوازوں سے اور اس کا کمرہ اس کی کربناک چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس وقت گھر میں فرقان خان اور اس کی بیٹی رانی بھی نہیں تھی۔ وہ جانے کتنی دیر تک اپنی بدبختی پر آنسو بہاتی رہی پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے جابر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو جان...... بولو۔''

''کیا تم گھر آسکتے ہو؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''گھر...... خیریت......؟''

''ہاں، میں رانی کو تمہارے پاس لانے سے پہلے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے پھر کب آؤں؟''

''ابھی...... اسی وقت۔'' اس نے فون رکھ دیا۔

کچھ دیر بعد جابر اس کے سامنے موجود تھا۔ ''بولو جان، کیا کہنا ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میں فوراً رانی کو تمہارے پاس نہیں لاسکتی۔ پہلے اس کا ذہن بنانا پڑے گا۔''

''ٹھیک، مجھے کوئی جلدی نہیں۔''

''دوسرے یہ کہ اس دوران تم مجھے بھی نہیں بلاؤ گے، سمجھا کرو، احتیاط بہت ضروری ہے۔''

''ہوں......'' جابر نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ اسی وقت ملازم کولڈ ڈرنک لیے ڈرائنگ روم میں آیا۔

''تم یہ پیو، میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہتی ہوئی ماہ رخ ڈرائنگ روم سے نکل گئی اور جابر مکارانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھتا رہا۔ ابھی جابر نے کولڈ ڈرنک ختم ہی کی تھی کہ ماہ رخ گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''جابر...... تم فوراً نکل جاؤ...... میرا شوہر آنے والا ہے...... میں دو دن بعد تم سے مل کر رانی کے بارے میں بتاؤں گی۔''

''او کے جان......'' جابر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ ماہ رخ نے زہریلی مسکراہٹ سے اسے اپنی گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی کہیں اور پہنچ جائے گا کیونکہ اس نے مشروب میں ایسا مہلک زہر ملایا تھا جو اگلے بیس منٹ میں اپنا کام کر جائے گا۔ یہ سب اس وقت ہوگا جب وہ ڈرائیونگ کر رہا ہوگا اور اس کی موت کا سبب ایکسیڈنٹ قرار پائے گا۔ اگلی صبح وہ جاگی تو اس نے بے چینی سے صبح کا اخبار دیکھا اور ایک صفحے پر جابر کی گاڑی کے حادثے کی خبر پڑھ کر اسے قلبی سکون اور قرار مل گیا۔ اس نے جیسا سوچا تھا، ویسا ہی ہوا تھا۔ اسے ایک شیطان سے نجات مل گئی تھی گو کہ اس نے قتل جیسا قبیح جرم کیا تھا مگر اپنی دنیا کو اجڑنے سے بچانے کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

یہ تقریباً تیس برس پرانی کہانی ہے۔ ماہ رخ آج بھی حیات ہے اور اس نے اپنی زندگی سے جڑا یہ سچ اپنی زبانی مجھے بتایا ہے۔ اس کا اصل نام کچھ اور ہے۔ آج اس کی بیٹی رانی اپنے گھر میں خوش ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنی جنت میں مطمئن ہے، تاہم وہ دن رات رو رو کر اپنے ان گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگتی ہے جو تیس برس قبل دانستہ یا نادانستہ طور پر اس سے سرزد ہوئے تھے۔ بے شک وہ گناہ گار ہے مگر اسے اپنے رب کی رحمت پر کامل یقین ہے کہ وہ رب ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔



نازیہ بتول رضا

# لاوارث ماں

صفیہ سلطانہ مغل کا خیال

جل گئے ہیں خواب سارے بجھ گئی ہیں خواہشیں
کس تواتر سے ہوئیں مجھ پہ غموں کی بارشیں

**اولڈ ہاؤس میں زیست کے دن پورے کرنے والی ایک دکھیاری ماں کی پُرالم کہانی**

ماں خالقِ کائنات کی جانب سے اپنی مخلوق کے لیے خوبصورت و نایاب تحفہ ہے۔ اس نعمت کی اصل قدر و منزلت وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس سے محروم ہو چکے ہیں۔ بدنصیب ہیں وہ کہ جن کو قدرت نے اپنے اس تحفے سے نوازا ہے لیکن وہ اس کی قدر نہیں کرتے، اپنی اصل جنت کو نہیں پہچانتے۔ جب وہ



اس نعمت سے محروم کر دیئے جائیں گے تو ہاتھ ملتے رہ جائیں گے پھر وہ گڑگڑائیں گے لاکھ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی' نافرمانیوں کی معافی طلب کریں گے لیکن ''ماں'' جیسی نعمت کو دوبارہ حاصل نہیں کر پائیں گے۔

میں ایک ایسی ہی بے بس ولاچار ماں کی کہانی لے کر حاضر ہوئی ہوں کہ جس کی اولاد کو اس ماں کی قدر ہی نہیں ہے' یہ درد بھری کہانی آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی۔ اسی ماں کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔

*......*......*

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اسی لیے اپنے ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھی۔ میرا کوئی بہن بھائی نہ تھا اس لیے میرے ماں باپ نے مجھے ہی اپنی خوشیوں اور محبتوں کا محور بنا لیا۔ میری ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کی۔ انہی خوشیوں کے جھولے میں جھولتے میں جوان ہوگئی۔ ہر والدین کی طرح میرے ماں باپ کو بھی میری شادی کی فکر دامن گیر ہوئی تو ایک مناسب رشتے کو قبول کر لیا گیا۔ میرے شوہر بھی میری طرح اکلوتے تھے اور عادت' اخلاق کے اچھے انسان تھے۔ میں نے شادی سے پہلے بھی عیش وعشرت کی زندگی گزاری تھی اور شادی کے بعد میرے شوہر نے مجھے بہت پیار دیا۔ ساس' سسر بھی قدرت نے اچھے دیئے تھے۔ زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ کہیں دکھ کا شائبہ تک نہ تھا پھر قدرت نے اولاد سے نوازا اور تین سالوں میں' میں دو بیٹوں کی ماں بن گئی۔ اب تو میری قدر میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اتنی خوشیوں پر مجھے چاہیے تھا کہ میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتی کہ اس نے ساری زندگی مجھے ہمیشہ خوشیوں سے نوازا اور اولاد کے معاملے میں بھی مجھے خالی نہیں رکھا تھا۔ لوگ تو اولاد کے لیے ترستے ہیں اور اولاد نرینہ کے پیچھے تو طلاقیں ہو جاتی ہیں۔ اب مجھے بیٹی کی خواہش ہونے لگی۔ میرے شوہر اکثر کہتے۔

''نیک بخت! شکر کیا کر' رب نے تجھے بیٹے دیئے ہیں۔ لوگ ترستے ہیں اور تو ہے کہ بیٹی بیٹی کرتی رہتی ہے؟ صبر کر وہ تجھے بیٹی سے بھی نوازے گا۔''

میں جواب میں جھٹ کہتی۔ ''ارے واہ' کیوں نہ کروں بیٹی کی خواہش' یہ بیٹے تو تمہارا بازو بنیں گے پھر میری خدمت کون کرے گا؟ میری بیٹی ہی کرے گی نا؟'' اس پر ہم دونوں ہنس دیتے۔

المختصر' چار بیٹوں کے بعد اللہ نے مجھے بیٹی سے نوازا تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا پھر اس کے بعد میرے تین بیٹے اور پیدا ہوئے' یوں میرے آٹھ بچے ہوگئے۔ میرے شوہر اکثر کہتے۔ ''زرینہ' اب میں سکون سے مروں گا کیونکہ میرے بعد تیرے بیٹے تیرا خیال رکھیں گے' تجھے مہارانی بنا کر رکھیں گے' تیری سات بہوئیں تجھے ہل کر پانی بھی نہ پینے دیں گی اور تو خوب عیش کرے گی۔''

اُن کی اس بات پر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور میں غصے سے کہتی۔ ''ایسی باتیں مت کیا کریں۔ خدا آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔ آپ تو میرے سر کا تاج ہیں' آپ جیسا مجھے کون پیار دے گا' کون عیش کرائے گا' میں سہاگن مرنا چاہتی ہوں۔''

میرے جواب پر شوہر مسکرا دیتے۔

اس عرصے میں یکے بعد دیگرے میرے والدین اور ساس سسر اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جو میرے لیے قیامت سے کم نہیں تھا۔ اُس روز میرے شوہر فیکٹری سے واپسی پر ایک بس کی زد میں آ کر موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ گھر پر اُن کی لاش آئی تو میں سکتے میں آ گئی۔ مجھے تو ہمیشہ خوشیوں کی عادت تھی' اب اچانک اتنا بڑا صدمہ ملا تو پتہ چلا کہ دکھ کیا ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کب میرے شوہر کو لوگ آخری آرام گاہ کی طرف لے گئے اور میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ جس گھر میں ہم



اُن دنوں رہائش پذیر تھے' یہ میرے شوہر نے بڑی محبت ومحنت سے بنایا تھا اور میرے نام کر دیا تھا۔ یہ گھر ڈبل اسٹوری تھا اور ہم سب کے لیے کافی تھا۔

آہستہ آہستہ غم کے بادل چھٹے تو میں زندگی کی طرف لوٹی۔ جمع پونجی کافی عرصہ چلی لیکن کب تک؟ آخر مجھے احساس ہوا کہ مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ سب سے بڑا بیٹا اُن دنوں میٹرک میں تھا' اس سے اندازہ لگا لیں کہ میرے باقی بچے کتنے چھوٹے ہوں گے۔

بہرحال میں نے ہمت نہیں ہاری اور ایک اسکول میں ماسی کی نوکری کر لی لیکن یہ تنخواہ ناکافی تھی' چنانچہ میں نے سلائی بھی شروع کر دی لیکن یہ سب پیسے ملا کر بھی میرے ہاتھ میں بہت کم رقم آتی۔ مجھے پریشان دیکھ کر میرے بڑے بیٹے نے کہا کہ اماں......! میں پڑھائی چھوڑ کر کوئی نوکری کر لیتا ہوں تاکہ گھر کا خرچ چل سکے لیکن میں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ میرے شوہر کی شدید خواہش تھی کہ میرے بچے خوب پڑھ لکھ کر افسر بنیں اس لیے میں نے اور محنت شروع کر دی۔ ایک دو گھروں میں بھی کام کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد اپنے گھر کا اور بچوں کا کام نپٹاتی پھر آدھی رات تک سلائی کرتی۔ دوسری صبح پھر سے جت جاتی۔ میری یہ بھی کوشش ہوتی تھی کہ میرے بچے اچھا کھائیں اس لیے بڑی محنت کر کے میں ہفتے میں ایک بار انہیں گوشت بھی کھلاتی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بچے کسی چیز کو ترسیں لہٰذا آمدنی کے خیال سے میں نے اوپری منزل بھی کرائے پر دے دی۔ اب اپنی دن رات کی محنت سے میں اپنے آٹھ بچوں کی پرورش کرنے لگی۔ کبھی جب میں بہت تھک جاتی اور ہمت ہارنے لگتی تو خدا سے شکوہ کرتی لیکن پھر فوراً شکر ادا کرتی کہ اس نے مجھے سات بیٹے عطا کیے ہیں۔ یہ بڑے ہو کر میری ساری تھکن دور کر دیں گے لیکن میری

انتقاماً مجھ کو وہ درسِ وفا دے جائے گا
زخم لے کر اک دلِ درد آشنا دے جائے گا
کس قدر نادم ہوا ہوں میں برا کہہ کر اسے
کیا خبر تھی جاتے جاتے وہ دعا دے جائے گا
محسن بھوپالی

تقدیر مجھ پر دور کھڑی ہنس رہی تھی۔

ماں بھی کتنی بھولی ہوتی ہے' کتنی محبت سے اپنے بچوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ ان کی معمولی سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتی ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا احترام کرتی ہے' ہمیشہ خیال رکھتی ہے کہ اس کے بچوں کو تکلیف نہ ہونے پائے اور پھر یہی امیدیں اپنی اولاد سے بھی وابستہ کر لیتی ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے بھی اپنے بیٹوں سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ میں تھکن سے بہت چور ہوتی تو مستقبل کے حسین سپنوں میں کھو جاتی کہ انشاء اللہ' جلد وہ وقت آئے گا جب میرے بیٹے بڑے ہو کر مجھے گھر بٹھا دیں گے۔ میں دن رات آرام کروں گی' میری سات بہوئیں ہوں گی' وہ مجھے ہل کر پانی بھی نہیں پینے دیں گی۔ میں اپنی سوچ پر خود ہی خوش ہوتی رہتی اور ہر روز ایک نئے عزم سے محنت کے لیے تیار ہو جاتی۔

خدا خدا کر کے' میرے بڑے بیٹے کی پڑھائی مکمل ہوئی تو تھوڑے عرصے بعد ہی اس کو ایک اچھی نوکری مل گئی۔ مجھے اُس دن کتنی خوشی ہوئی' بیان سے باہر ہے۔ میں تو انتظار میں تھی' بیٹے سے اس کی پسند پوچھی۔ اس نے مجھ پہ چھوڑ دیا۔ میں تو نہال ہوگئی اور جھٹ اس کی شادی کر ڈالی لیکن میری بڑی بہو بہت نخریلی ثابت ہوئی' وہ بہت جھگڑالو بھی تھی' جھگڑے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ کام کو بوجھ

بھی۔ بالآخر میں نے خود ہی گھر کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اس پر بھی اس کو چین نہ آیا تو اس نے بیٹے کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ میں روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ گئی تھی لیکن خاموش تھی۔ شادی کے ایک سال کے بعد وہ لوگ الگ گھر میں شفٹ ہو گئے۔ اُس دن میں تڑپ تڑپ کر روئی مگر میں نے اپنے آنسو خود ہی پونچھ ڈالے اور باقی بچوں میں مگن ہو گئی۔ اب دوسرے بیٹے پر میری نظریں تھیں۔ اس کو بھی نوکری مل گئی۔ میں نے اس کی بھی شادی کر دی۔ دوسری بہو کو کوئی کام نہ آتا تھا۔ میں نے کہا' چلو میں ماں بن کر اسے سکھاؤں گی لیکن وہ کوئی کام سیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سالن جلا دیتی' روٹیاں موٹی پکاتی' برتن دھوتی تو توڑ دیتی' میں پریشان ہو گئی۔ میں پھر سے خود کام کرنے لگی۔ میں کوئی کام ٹھیک سے بتاتی تو وہ چیخ کر ایسا روتی کہ محلّہ جمع کر لیتی۔ تھوڑے عرصے بعد یہ بیٹا بہو بھی مجھ سے لڑ جھگڑ کر الگ ہو گئے۔ میں پھر سے اکیلی ہو گئی۔ اب میرے پانچ بیٹے میری امیدوں کا مرکز تھے۔ تیسرے بیٹے نے ضد پکڑی کہ اسے اپنا کاروبار کرنا ہے' سو میں نے دل پہ پتھر رکھ کے اپنے ماں باپ کا گھر فروخت کر دیا اور بیٹے کو جنرل اسٹور کھلوا کر دیا۔ باقی پیسوں سے بیٹی کی شادی کر دی۔ جب اسٹور چل نکلا تو تیسرے بیٹے کی بھی شادی کر دی۔ اُس بہو نے آتے ہی اپنا پورشن الگ کر لیا اور اوپری منزل خالی کروا کے وہاں شفٹ ہو گئی۔ میں ایک بار پھر سے تنہا رہ گئی۔ کبھی کبھی سوچتی کہ کیا میرے ساتھ میرا کوئی بیٹا نہیں رہے گا؟ کیا کبھی مجھے آرام و سکون میسر نہیں آئے گا؟ کیا میں ساری زندگی تکلیفیں اٹھاتی اور مشقت کرتی رہوں گی؟ پھر دل کو تسلی دیتی کہ ابھی چار بیٹے باقی ہیں' یہ مجھے تنہا نہیں ہونے دیں گے لیکن ان چار بیٹوں نے بھی اپنے پیروں پہ کھڑے ہوتے ہی مجھے اور اس گھر کو چھوڑ دیا اور میں حقیقتاً تنہا رہ گئی۔ جس دن سب سے چھوٹے بیٹے نے پورشن الگ کیا' میں دیواروں سے لپٹ لپٹ کر روئی تھی۔ اُس دن مجھے اپنے شوہر کی بہت یاد آئی اور میں روتے روتے نہ جانے کب بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جب ہوش آیا تو ہر سو اندھیرا تھا اور میں تھی اور میری تنہائیاں......

میں رات بھر روتی رہی۔ میرے سات بیٹے تھے اور میں اس حال میں تھی۔ میرا کوئی بیٹا مجھے پوچھنے نہیں آتا تھا جن بچوں کو میں نے نازوں سے پالا تھا جن کو کبھی میں نے ہڈی والا گوشت اس خیال سے نہیں کھلایا تھا کہ کہیں میرے بچوں کے حلق میں ہڈی نہ چبھ جائے' وہ بچے مجھے تنہا چھوڑ کر اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے تھے۔ چھوٹی بہو احسان جتانے والے انداز میں میرے آگے کھانا پٹخ جاتی اور کبھی یہ زحمت بھی گوارہ نہ کرتی اور میں بھوکی ہی سو جاتی۔ میں نے بچپن میں اپنے ماں باپ کو کہتے سنا تھا کہ سات بیٹوں کی ماں بھوکی رہے گی لیکن ایک بیٹے کی ماں کھا کر سوئے گی۔ اس وقت مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی لیکن اب سب سمجھ آنے لگا تھا۔ میرے بیٹے سات تھے' وہ سب ایک دوسرے کے آسرے میں رہتے کہ اس بھائی نے ماں کو کھلا دیا ہو گا اور میں اکثر بھوکی سوتی پھر ایک قیامت اور آئی جو میرا سب کچھ بہا کر لے گئی۔

ایک دن سب بیٹے میرے پاس آئے اور گھر بیچنے کا مطالبہ کرنے لگے۔ دراصل وہ سب اپنا اپنا حصہ وصول کرنا چاہتے تھے۔ کچھ کچھ تو مجھے اندازہ تھا لیکن اتنی جلدی میری زندگی میں ہی وہ لوگ اس گھر کو بیچنے کی بات کریں گے' یہ میں نہیں جانتی تھی۔ میں نے کمزور سا احتجاج کیا لیکن میں اکیلی اُن سب کا کہاں تک مقابلہ کرتی' سو رضامندی دے دی۔ وہ لوگ تو تیار بیٹھے تھے' جھٹ پٹ مکان بک گیا



اور سب نے اپنے اپنے حصے رکھ لیے۔ اب میں صحیح معنوں میں بے سائبان ہو گئی۔ میرا مسئلہ منہ پھاڑے کھڑا تھا کہ مجھے کون سا بیٹا رکھے گا؟ سب کے باہمی مشورے سے طے پایا کہ میں ایک ایک ہفتہ ہر بیٹے کے گھر رہوں گی۔ میں نے خاموشی سے سر جھکا دیا گویا اب میں ایک بوجھ تھی جسے کوئی مستقل اپنے ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھا۔ میں ایک کھلونا بن گئی تھی اولاد کے ہاتھوں۔ ایک ہفتہ گزرتے ہی دوسرے بیٹے کو فون کر دیا جاتا کہ وہ مجھے آ کر لے جائے۔ ان پریشانیوں میں' میں بیمار پڑ گئی۔ مجھے کسی طور سکون نہ تھا' رو رو کر اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی' اپنی موت کی دعائیں مانگتی لیکن تقدیر ابھی میری جھولی میں اور دکھ ڈالنا چاہتی تھی۔

اُن دنوں میں بڑے بیٹے کے گھر میں رہ رہی تھی اور سخت بیمار تھی۔ بڑی بہو ویسے ہی مجھ سے اکتائی ہوئی تھی۔ جیسے ہی ایک ہفتہ پورا ہوا' اس نے میرے دوسرے بیٹے کو فون کر دیا کہ اماں کو آ کر لے جاؤ۔ آج پورا ہفتہ ہو گیا ہے تو پتہ چلا کہ میرا دوسرا بیٹا بیوی اور بچوں کے ساتھ لاہور میں چھٹیاں گزارنے گئے ہیں۔ میری بڑی بہو یہ سن کر طیش میں آ گئی پھر اس نے باری باری سب کو فون کھڑکائے کہ اماں کو آ کر لے جاؤ لیکن ہر کوئی کہتا کہ ابھی ہماری باری نہیں ہے' اپنے ٹائم پر ہی لے کر جائیں گے۔ یہ ساری کارروائی میرے ہی سامنے ہو رہی تھی' سوچیں' میرے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ آج میں اپنی اولاد پر بوجھ بن گئی تھی۔ کسی کو میرا خیال نہیں تھا۔ میرے آنسو جو ہمیشہ میرے دل پر ہی گرتے تھے' آج بہہ رہے تھے اور میں انہیں روک نہیں پا رہی تھی۔ میری بہو بڑبڑاتی ہوئی پیر پٹختی جا چکی تھی اور میں اپنی ناقدری پر ماتم کر رہی تھی۔ کیا میری اولاد کی نظر میں میری کوئی اہمیت' حیثیت یا وقعت نہیں ہے؟ میرے

## دکھ

اے مرے غزہ
تیرے شہیدوں کے نام
میرا ہر سلام
تمام دنیا
اس ظلم پہ ہے خاموش
یہ کیسا قانون!
یہ کیسا ہے انصاف؟

عزیز الرحمٰن۔ شریکرہ' پشاور

ذہن میں ایسے سوال اٹھ رہے تھے اور میں بے آواز رو رہی تھی۔ میری بہو نے غصے میں مجھے دوپہر کا کھانا بھی نہیں دیا۔ میں چپ چاپ پڑی رہی اور سو گئی۔

آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ مجھے بہت کمزوری اور نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک تو بیماری اور پھر بھوک' دونوں نے مل کر میری حالت دگرگوں کر دی تھی اور میں بمشکل اٹھ کر خود ہی کھانا نکالنے کچن میں چل دی۔ ابھی میں نے سالن کا بھگونا اٹھایا ہی تھا کہ میری بہو آ پہنچی۔ گھبراہٹ میں میرے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ "وہ......کھا......نا......" اور میری بہو نے مجھے صلواتیں سنانی شروع کر دیں۔ میں اس کی صورت تک رہی تھی۔ مجھے پتہ نہیں چلا اور کب میرے ہاتھ لرزے اور سالن کا پتیلا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اب تو میری بہو کا پارہ ہائی ہو گیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' خرافات بکتے ہوئے اس زور سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور مروڑا کہ بے اختیار میری چیخ نکل گئی' شاید میری کلائی ٹوٹ گئی تھی' تکلیف سے جان نکل رہی تھی لیکن وہ مجھے کمرے میں دھکیل کر چلی گئی

### زندگی

زندگی صرف سانس لینے کا نام نہیں
سُو میں!
وہ زندگی جیتی ہوں
اوروں کے لیے
باعثِ زندگی جو بنے!!

شبانہ۔ کراچی

پھر اس نے فون کر کے میرے بیٹے کو بلوا لیا۔ میرا بیٹا غصے میں بھرا ہوا میرے پاس آیا۔

''چلو اماں......! بہت ہو گئی۔'' میں سمجھی کہ شاید مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہے۔ میں فوراً گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی ایدھی ہوم کے دروازے پر رکی تو میں حیران رہ گئی' میرا بیٹا کچھ کہے سنے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا' تب میں صدمے سے گرتے گرتے بچی یعنی میرا بیٹا مجھ سے عاجز آ کر اب مجھے ''اولڈ ہاؤس'' میں چھوڑنے آیا تھا۔ مجھے حیران پریشان چھوڑ کر میرا لاڈلا بیٹا مجھے وہاں بھرتی کر گیا تھا ہمیشہ کے لیے۔

اور میں سکتے کے عالم میں کھڑی تھی جیسے ذرا بھی ہلی تو ملبے کا ڈھیر بن جاؤں گی۔ میں آج بالکل ٹوٹ چکی تھی لیکن اتنے دکھ اٹھانے' اولاد کے دھتکارنے اور اتنی ذلت اٹھانے کے بعد بھی میں زندہ سلامت کھڑی تھی۔ آنسو میری آنکھ سے نہیں بہہ رہے تھے لیکن میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا پھر کسی کا شفیق ہاتھ میرے کاندھوں پر آ کر ٹھہر گیا اور آواز آئی۔

''حوصلہ رکھو بہن......! دنیا اسی کا نام ہے۔''

بس یہ سننا تھا کہ میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔ میرے سارے بند ٹوٹ گئے اور اس مہربان کندھے پر سر رکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ سب جمع ہو گئے اور میری دلجوئی میں لگ گئے پھر کسی نے مجھے پانی پلایا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑی محبت سے مجھے کھانا کھلایا گیا۔ میں وہاں رہنے لگی۔ میرا علاج ہوا۔ میں ہر روز اپنے بچوں کی راہ تکتی کہ شاید میرے آٹھ بچوں میں سے کسی کو تو میری یاد آئے گی' کوئی تو مجھے لے جانے نہ سہی' ملنے تو آئے گا لیکن ان ساری امیدوں پر اُس دن پانی پھر گیا جب مجھے پتہ چلا کہ میرے بیٹے یہ لکھ کر گئے ہیں کہ ہماری ماں مر بھی جائے تو ہمیں اطلاع نہ دی جائے۔ یہ خبر سن کر میری ساری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ میں جو امیدوں کے سہارے جی رہی تھی' بالکل ہی ٹوٹ گئی۔ اپنی ناقدری پر کب تک اشک بہاتی؟ بالآخر صبر کر کے اُسی ''اولڈ ہاؤس'' کو اپنا گھر مان لیا۔

میں آج بھی یہاں رہتی ہوں۔ اب میں نے اپنے بچوں کے بغیر جینا سیکھ لیا ہے۔ اب میں کسی کا رستہ نہیں تکتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میری اولاد میں سے کسی کو بھی میری ضرورت نہیں رہی بلکہ مجھ سے ملنے کے بھی روادار نہیں ہیں' سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ جب ان کی اولاد جوان ہوگی تو انہیں میری قدر معلوم ہوگی لیکن اُس وقت تک میں خالقِ حقیقی کے پاس جا چکی ہوں گی۔ میں اب بھی اپنے بچوں کو بددعا نہیں دیتی کیونکہ میں ایک ماں ہوں اور ماں تو صرف دُعائیں ہی دیتی ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ میرے سب بچوں کو خوش رکھے' اولاد کی خوشیاں دکھائے اور انہیں ہدایت دے۔ (آمین!)

نوجوان نسل کے لیے میرا پیغام ہے کہ خدارا! اپنے ماں باپ کی قدر کرو' کہیں ایسا نہ ہو کہ میری اولاد کی طرح تم اپنی جنت کو اپنے ہاتھوں سے کھو دو۔ آج آپ سب کو گواہ کر کے میں اپنی اولاد کو معاف کرتی ہوں کیونکہ میں ایک ماں ہوں!





جیجل میتلو

# صحرا کے ستارے

عارف شفیق کا خیال

کیا دکھ دل میں اندھی رات جو ٹھہری تھی
چہرے پر تو صبح ایک سنہری تھی

**صحرائے تھر کی چلچلاتی زندگی کو اجاگر کرتی اشک اشک کہانی**

گرمی کی دوپہر میں سورج جیسے آگ برسا رہا تھا' زمین انگارہ بنی ہوئی تھی' یہ تھل کا بنجر علاقہ تھا۔ ڈیرہ غازی خان سے آگے پتھریلی زمین پر یہ گاؤں صدیوں سے آباد ہے نہ بجلی' نہ پانی' بس بارش برستی تو یہ علاقہ سبزہ زار کی صورت نخلستان کا نظارہ پیش کرتا۔ چھوٹے چھوٹے جوہڑ' ندیاں' نالے یہاں کے مکینوں کے لیے جینے کا آسرا تھے۔ ان کا گزارہ مال مویشیوں پر تھا جو کہ خودرو گھاس پھوس کھا کر چرواہے کی نگرانی میں سارا دن مست گھومتے۔ جب بادل جھوم کر برستے' گھٹائیں بھر بھر آتیں تو گاؤں



میں جشن کا سماں ہوتا تھا۔ بوڑھے، بچے، عورتیں، مرد سب ہی خوشی سے نہال ہو جاتے حتیٰ کہ ڈھور ڈنگر کی خوشی بھی دیدنی ہوتی۔ برکھا رت میں ہری ہری گھاس کھا کر یہ ڈنگر موٹے تازے ہو جاتے۔ چاندنی راتوں میں گاؤں کا تو حسن ہی الگ ہوتا، ہر چیز پھول، درخت، چھوٹے چھوٹے پتھریلے ٹیلے، ساری زمین چاندنی میں نہائی ہوئی لگتی، ہر چیز سے جیسے نورانی روشنی پھوٹ رہی ہوتی۔ ایسے میں اگر کوئی گاؤں کا منچلا بانسری یا کوئی ساز چھیڑ دیتا تو ایسا جادوئی سماں بندھ جاتا جیسے ساری کائنات محوِ رقص ہو۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ جیسے ہر چیز بانسری کی لے پر جھوم رہی ہو۔

لیکن جب گاؤں میں خشک سالی ہوتی تو جیسے موت کے فرشتے کو چھٹی مل گئی ہو کہ وہ ہر جاندار کی جان قبض کرتا جائے۔ ہر طرف کربلا بپا ہو جاتی، بالکل ایسا ہی سماں اُن دنوں تھا، لوگ بھوک پیاس سے بچنے کے لیے ہجرت کر رہے تھے۔ گاؤں سنسان اور خالی ہوتا جا رہا تھا۔ گاؤں کے باسی اپنے گھر چھوڑتے ہوئے ایک دوسرے سے گلے مل کر رو رہے تھے، ایک دوسرے کو پھر واپس آنے اور ملنے کی دُعائیں دے رہے تھے۔ ہر ایک کی الگ منزل تھی جسے جہاں زندگی کی سہولتیں ملتیں، وہ وہیں رک جاتا اور جینے کی جدوجہد کرنے لگتا۔ یہ اُن کی زندگی کا حصہ تھا۔ ہر سال خشک سالی میں چلے جاتے اور پھر جب ساون آتا، لوٹ آتے۔ کچھ شہروں میں ہی رہ جاتے۔ ان کے رونے کا سبب یہی تھا کہ نہ معلوم کون ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جائے اور کون لوٹ آئے۔ کبھی کبھی یہ جدائی سالوں پر محیط ہوتی۔ اگر کبھی کوئی موت واقع ہو جاتی تو مہینوں بلکہ کبھی کبھی تو سالوں بعد پتہ چلتا۔ چنانچہ یہ لوگ گاؤں سے ہجرت کے وقت دکھی ہو رہے تھے۔ باپ دادا کی یہ زمین، اپنے کچے مکان انہیں بہت عزیز تھے۔

جی جان کی عمر 70 سال کی ہوگی۔ اس کی تیسری نسل چل رہی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو خ... چھوٹے بچوں کو بھوکا پیاسا نہیں دیکھ سکتی تھی اس لیے اپنے گھر والوں کو ہجرت کا کہہ رہی تھی لیکن وہ بضد تھے کہ وہ بھی ساتھ چلے مگر جی جان اب ہجرت کر... نہیں چاہتی تھی۔ ایک تو بڑھاپا، دوسرے وہ زند... کے بقیہ دن اپنے گھر میں ہی گزارنا چاہتی تھی۔

اس نے خدا کا واسطہ دیتے ہوئے اپنے گھر والوں سے کہا۔ ”مجھ سے اب ہجرت کی تکلیفیں نہیں سہی جائیں گی۔ جاؤ، اللہ تمہارا محافظ۔“ اور اس کے بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اُسے روتے ہوئے الوداع کہہ رہے تھے۔ ہجرت کرنے والے اپنے ساتھ ضرورت کی چند اشیاء ہی ساتھ لے جاتے اور ہر چیز گھر میں چھوڑ جانے پر مجبور ہوتے۔ جی جان نے قافلے کو دور تک جاتے ہوئے دیکھا۔ جب غبار گرد رہ گیا تو وہ آنسو پونچھتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔ پاس بیٹھی بکریاں جی جان کو دیکھ کر میں میں کرتی ہوئی اٹھنے لگیں۔ جی جان نے انہیں دیکھا اور تھوڑا تھوڑا پانی اور اناج کے کچھ دانے ان کے آگے ڈالنے لگی۔ دس بکریوں میں سے چار ہی بچی تھیں۔ وہ اداسی سے وہیں بیٹھ کر انہیں دانہ کھاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ جی جان نے بھی اپنی زندگی میں دو مرتبہ ہجرت کی تھی۔ تھر میں ویسے تو ہر سال کچھ مہینے خشک سالی ہوتی ہے مگر کبھی کبھی پانچ دس سال لگاتار خشک سالی رہتی ہے جس سے گاؤں کے گاؤں اجڑ جاتے ہیں۔ جانور جو کہ یہاں کے مکینوں کے لیے خوشحالی کا سبب ہوتے ہیں، بھوک پیاس سے مرنے لگتے ہیں۔ وہ دن بہت سخت اور مشکل والے ہوتے ہیں۔ جوہڑ تالاب خشک ہو جاتے ہیں، گھاس پھوس، پھول و درخت سوکھنے لگتے ہیں، سرسبز و پُررونق گاؤں سنسان بیابان میں

تبدیل ہو جاتا ہے۔ لوگ گاؤں چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بس چند گھر یا چند لوگ ہر حال میں ہمت باندھے رہتے ہیں اور کہیں نہیں جاتے، ان کا جینا مرنا اسی دھرتی پر ہوتا ہے، انہی لوگوں میں سے جانو اور زینی بھی تھے جن کا ایک چار سالہ بیٹا پنھل تھا۔ زینی اُن دنوں حاملہ تھی، زچگی میں تھوڑے دن تھے اور وہ جی جان سے رابطے میں رہتی تھی۔ گاؤں میں اکثر بڑی بوڑھیاں دائی وغیرہ کا کام کرتی ہیں۔ مشترکہ خاندانی نظام ہوتا ہے۔ ذات برادری والے ساتھ مل کر رہتے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، نسلوں سے ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں، لڑائی جھگڑے اختلاف ہونے کے باوجود اُن کے درمیان دوریاں نہیں ہوتیں، ایک دوسرے کی سب خبر رکھتے ہیں۔

جانو اور زینی بھی جی جان کا خیال رکھتے تھے۔ کچھ دن بعد جی جان کی دو بکریاں اور مر گئیں اور ایک جانو نے ذبح کر دی۔ اب وہی گوشت بھون کر کھا رہے تھے۔ رات کے وقت صحن میں آگ جلا کر سب اس کی روشنی میں بیٹھے تھے اور گرمی کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہو رہے، بارش برسنے کی دُعائیں مانگ رہے تھے۔ خشکی کی وجہ سے پرندے تک کہیں کسی اور علاقے میں جا چکے تھے۔ گھروں سے باہر کھلی جگہ پر دو تین چھتری نما خیمے لگا لیے گئے تھے اور اُن ہی میں بیٹھے تھے کہ اگر معمولی سی ہلکی ہوا بھی ہو تو انہیں لگے۔

ایک چھوٹے سے خیمے میں زینی اپنے بیٹے پنھل کے ساتھ چارپائی پر سو رہی تھی کہ پنھل نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اماں......! اماں......! پانی۔“ اور زینی چونک کر اٹھ بیٹھی، مٹکے سے تھوڑا سا پانی انڈیل کر پنھل کو دیا۔ دو مٹکے گھڑونچی پر رکھے تھے، دونوں میں ابھی پانی تھا۔ یہ دیکھ کر زینی نے اطمینان کا سانس لیا۔ دن اسی طرح گزرتے

## آنسو

آنسو!
لاکھ روکوں
مگر!
نہیں رُکتے
ہو بہو آپ پر گئے آنسو

ثانیہ بھٹی۔ سیالکوٹ

رہے۔ چند دن بعد زینی نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا۔ جانو کو بیٹے کی خوشی تو تھی لیکن ان حالات پر وہ اداس تھا اور اسی اداسی سے بچے کی چھٹی منائی۔ سب گاؤں والوں نے تھوڑا تھوڑا پانی جانو کے گھر کے مٹکوں میں ڈالا۔ زینی اور بچہ نہائے۔ ناچ گانا ہوا اور رات گئے سب بارش کی دُعائیں کرتے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے مگر دُعائیں تھیں کہ جیسے بے اثر ہو گئی تھیں۔ گرمی اور حبس کا ایسا عالم تھا کہ بے اختیار دل نہانے کو مچلتا مگر پانی تو پینے کے لیے ہی بہت تھوڑا تھا۔ ایک روز زینی کے بچے کو بخار ہو گیا۔ جی جان نے زینی سے بچے کو نہلانے کے لیے کہا۔ زینی نے بچے کو نہلایا تو جیسے بچہ کھل اٹھا۔ زینی بہت خوش ہوئی۔ وہ اس پر اپنی ممتا نچھاور کر رہی تھی۔ دو تین دن اور اسی طرح سرک گئے۔ جیسے جیسے پانی ختم ہو رہا تھا، جانو کی تیوری پر تفکر کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ہر وقت جھنجھلایا سا رہتا۔ زینی، پنھل ڈرے ڈرے رہتے۔ پنھل ہر دم ماں زینی کے دامن سے چمٹا رہتا۔ عجیب کھنچا کھنچا سا ماحول تھا۔

”جانو......! اے...... جانو......!“ زینی نے ڈرتے ہوئے اُسے پکارا۔

”کیا ہے!!“ وہ غصے سے بولا۔

''وہ......وہ...... پانی ختم ہوگیا ہے۔''

''کیا!!!'' وہ اٹھ بیٹھا اور غصے سے اسے گھورا۔ وہ سہمی کھڑی تھی۔ ''اچھا...... اچھا...... چل' مشکیزہ دے۔'' وہ ضبط کرتا ہوا اٹھا۔

''اس وقت کہاں سے پانی ملے گا؟'' زینی نے شام ہوتے دیکھ کر کہا۔

''کہیں نہ کہیں سے لے ہی آؤں گا۔ پانی ختم کرتے وقت تو فکر نہیں ہوتی۔'' یہ کہہ کر وہ جھنجھلاتا ہوا چل دیا۔

''اللہ خیر کرے!'' زینی نے فکرمندی سے آہ بھری۔

ایک دن جانو نے زینی کو بچہ نہلاتے ہوئے دیکھ لیا تو غصے میں اسے دو تین تھپڑ رسید کر دیئے۔

''بچے کا بدن لُو کی وجہ سے تپ رہا تھا' میں نے مجبوری میں اِسے نہلا دیا۔'' وہ روتے ہوئے جیسے اپنی صفائی پیش کرنے لگی۔ پنھل سہما کھڑا تھا۔ جانو سوچنے لگا کہ زینی بھی کیا کرے' ممتا سے مجبور ہے بے چاری اور پھر وہ صرف زینی کا بچہ تو نہیں ہے' میرا بھی تو ہے نا۔ زینی سے تو اُسے بہت محبت ہے۔ اس نے اسی محبت میں تو اُسے اپنی دلہن بنایا تھا اور پھر یہ تو خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ اس میں زینی کا کیا قصور ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اُس نے اٹھ کر پنھل کو خود سے لپٹایا جو ماں کے قریب کھڑا تھا اور زینی کو مناتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔

دو تین دن سے بہت سخت لُو چل رہی تھی' جسم جل رہے تھے۔ گاؤں والوں کے تمام جانور مر چکے تھے۔ سارے صحرا میں آگ سی برس رہی تھی۔ ہریالی تو نام کو نہ تھی۔ مٹی دھول راکھ کی صورت اڑ رہی تھی۔ چھوٹے بڑے سب گھر میں دبکے پسینے میں شرابور تھے۔ زینی کے چھوٹے بچے کو کل سے بخار تھا۔ بچہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ یہاں تو پانی کے لالے پڑے ہوئے تھے' دوا کہاں سے آتی۔ بچہ روتے روتے چپ ہو گیا۔ زینی سمجھی' سو گیا ہے۔ کچھ دیر بعد اُسے عجیب سا احساس ہوا' اس نے بچے کو سینے سے الگ کیا تو اُس کی چیخ نکل گئی۔

''جانو......!!'' جانو باہر بیٹھا تھا' دوڑ کر آیا۔

''کیا ہے؟ کیوں چیخ رہی ہے تو؟''

''جانو......! یہ...... یہ...... چھوٹا......'' جانو نے چھوٹے کو گود میں لیا' تب اُسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی سانسیں پوری کر چکا ہے۔ وہ بچہ لیے سسکتا ہوا زمین پر بیٹھتا چلا گیا اور صحرا میں زینی کے بین گونجنے لگے۔

رات کا پچھلا پہر تھا' جانو شام سے پانی کے پیچھے نہ معلوم کہاں مارا مارا پھر رہا تھا۔ غمزدہ زینی کھاٹ پر پنھل کے ساتھ سو رہی تھی کہ یکایک اُسے ٹھنڈی فرحت بخش سی ہوا کا احساس ہوا۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھی اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں وقفے وقفے سے بجلی چمکنے لگتی' گھٹائیں صحرا کی طرف آ رہی تھیں۔ خوشی سے زینی کا من دھڑکنے لگا۔ اچانک ایک بڑی سی بوند زینی کے گال پر پڑی' زینی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور دوڑ کر اندر سے ایک پتیلا لے آئی اور صحن میں اونچی جگہ رکھ دیا کہ بارش کا پانی اُس میں جمع ہو جائے۔ ٹپ ٹپ بوندیں برسنے لگیں اور پتیلا ساز کی طرح بجنے لگا مگر ساتھ ہی ہوا بھی تیز ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے بادل دور ہونے لگے۔ زینی فکرمندی سے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

''ماں......! پانی......'' پنھل کسمسا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ ہوا بند ہو چکی تھی اور دوبارہ حبس ہو رہا تھا۔

''ماں......! پانی......'' پنھل نے اُسے جھنجھوڑا۔

''آں......'' زینی چونک گئی اور اٹھ کر مٹکوں کی طرف دوڑی لیکن مٹکے خشک ہو چکے تھے۔ اُس کی آنکھیں دکھ سے جلنے لگیں۔

''اب پنھل بھی...... نہیں...... نہیں......'' اُسے پتیلا یاد آیا۔ وہ باہر بھاگی' پتیلا اٹھا کر دیکھا تو خالی لگا۔ اس نے اپنی انگلیاں پتیلے میں ڈالیں اور پتیلا ٹیڑھا کیا۔ انگلیوں کی پوریں ڈوب گئیں۔ گھور اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پتیلے میں پانی کے صرف دو گھونٹ ہی تھے۔ وہ خود بھی پیاس محسوس کر رہی تھی۔ جی چاہا' یہ پانی وہ خود پی لے لیکن ممتا کا جذبہ اپنی پیاس پر غالب آ گیا۔ اُسی وقت بھر بھر سینے میں دودھ اترنے لگا۔ اُس نے وہ دودھ برتن میں دوہنا شروع کیا۔ دودھ پتیلے کے پانی میں شامل ہونے لگا جس سے پانی کی مقدار کچھ بڑھ گئی تھی پھر اُس نے وہ برتن پنھل کے منہ سے لگا دیا۔ پینے کے بعد پنھل نے پوچھا۔

''اماں......! یہ کیا...... تھا؟''

''تجھے کیا لگا؟''

''مجھے تو دودھ لگ رہا تھا۔''

''ہاں' یہ بکری کا دودھ تھا۔'' زینی نے جواب دیا۔

''مگر اماں......! اپنی بکری تو کل مر گئی تھی؟ بابا اسے گھسیٹ کر گھر سے باہر لے جا رہا تھا۔''

''وہ...... میں جیجاں کی بکری سے دودھ دوھ کر لائی تھی۔'' اُس نے پنھل کو بہلایا اور پلو سے چنے کھول کر کھلانے لگی اور خود بھی دانہ دانہ منہ میں ڈال لیتی تھی۔

''خدایا! کہیں سے پانی کا انتظام کر دے۔'' اُسے جانو کا خیال آیا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دیہات میں لوگ ستاروں کو دیکھ کر وقت کا اندازہ لگاتے ہیں کہ اب رات کتنی ہے' آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جانو اب تک نہیں آیا تھا' وہ فکرمندی سے سوچنے لگی اور پھر پنھل سے باتیں کرتے کرتے نہ معلوم کب اس کی اور پنھل کی آنکھ لگ گئی۔

''زینی! او زینی! پنھل! پنھل!'' زینی کی آنکھ کھل گئی۔ جانو' پنھل کو کب سے آوازیں دے رہا تھا۔ صبح ہو چکی تھی' سورج کی کرنیں صحن میں پھیل چکی تھیں۔

''زینی! او زینی!'' دروازہ بجنے کے ساتھ جانو کی آواز آئی۔ وہ جلدی سے اٹھی' کنڈی کھولی تو جانو کے کاندھے پر پانی کی بڑی سی بوتل اور سر پر گٹھڑی تھی۔ چہرے سے خوشی چھلک رہی تھی۔ اُس نے اندر آ کر وہ گٹھڑی کھولی۔ کھانے پینے کی چیزیں دیکھ کر زینی اور پنھل بہت خوش ہوئے۔

''زینی! پنھل کو اب بخار ہے تو یہ میں بخار کی گولیاں بھی لایا ہوں' اس میں سے ایک اس کو کھلا دے۔''

''لیکن یہ سب تُو لایا کہاں سے؟'' وہ حیرت و خوشی کی ملی جلی کیفیت سے بولی۔

''یہ سب میں شہر سے لایا ہوں۔ جب مجھے کہیں سے بھی پانی نہیں ملا تو میں بڑی سڑک کی طرف چلا گیا۔ دیکھا تو بس تیار کھڑی تھی جانے کے لیے' کچھ روپے میری جیب میں تھے' میں بس میں سوار ہو گیا کہ صبح تک شہر سے ہی پانی لے آؤں گا اور دیکھ' اللہ کیسا مالک ہے' اس نے پانی کے ساتھ کھانا پینا سب دیا' دوا بھی۔'' جانو نے چہکتے ہوئے بتایا۔

''پر کیسے؟'' زینی کی حیرت برقرار تھی۔

''ارے' وہ شہر میں کچھ بھلے لوگوں نے ہم جیسے پریشان حال اور ضرورت مند لوگوں کے لیے امدادی کیمپ لگایا ہوا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا تو میں بھی قطار میں لگ گیا اور یہ سب لے کر آ گیا۔'' جانو نے تفصیل بتائی۔

''اللہ بھلا کرے ایسے نیک لوگوں کا۔'' جیجاں بھی جانو کی آواز سن کر آ چکی تھی اور کیمپ والوں کو دُعائیں دے رہی تھی۔ پنھل کھانے پینے کے بعد اب چپس کا پیکٹ ہاتھ میں لیے شرارتیں کر رہا تھا۔ سب اُس کا کِھلتا ہوا چہرہ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ پنھل کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے ستارے صحرا میں چمکتے ہیں۔

علی صبا

# سرِ آئینہ

حزیں صدیقی کا خیال

پہلے خود کو بنائیں آئینہ
پھر کسی کو دکھائیں آئینہ

**ایک پڑھی لکھی عورت کا قصہ‘ ایک ان پڑھ نے اسے آئینہ دکھایا تھا**

”ارفع! کیا زبردست آرٹیکل لکھا ہے تم نے۔ بہت خوب‘ مزہ آ گیا۔“

احسان صاحب ہاتھ میں اخبار لیے ارفع بیگم کی تعریف کر رہے تھے اور وہ پھولے نہیں سمارہی تھیں۔ پاس بیٹھے مانی اور شانی بھی خوش تھے۔

”سچ مما‘ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں‘ ہر بات کو اتنے خوبصورت الفاظ میں بیان کرتی ہیں کہ پڑھنے والا آپ کا گرویدہ ہو جاتا ہے‘ وہ نومی ہے نا جو میرے ساتھ پڑھتا ہے‘اس کی مما بھی تعریف کرتی ہیں آپ کی۔نومی نے خود مجھے بتایا تھا۔“ شانی نے مسرور لہجے میں کہا۔

ارفع بیگم جانتی تھیں کہ اُن کی لکھی تحریریں لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔

”بس بیٹا‘ اللہ کا کرم ہے۔“ ارفع بیگم مسکرا کے بولیں۔

”اچھا ارفع‘ میں تو تمہیں بتانا ہی بھول گیا‘ ابا میاں آ رہے ہیں‘ وہ کچھ دن ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔تم ذرا اُن کا کمرا سیٹ کر دینا۔“

شوہر کی بات سن کر ارفع بیگم کے چہرے پر آئی مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی جسے احسان صاحب نے بھی محسوس کیا لیکن بولے کچھ نہیں۔انہیں یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی کہ ارفع بیگم کو ابا میاں سے بیر کیوں ہے جبکہ وہ تو بہت شفیق انسان تھے؟

”اچھا‘ کب آ رہے ہیں ابا میاں؟“ ارفع بیگم نے کافی بے دلی سے پوچھا۔

”کل شام تک پہنچ جائیں گے‘ تم ساری تیاری کر لینا‘ انہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابا میاں ابھی تو آئے تھے؟“

”بس مرضی کے مالک ہیں‘ بیٹھے بٹھائے ہی پروگرام بن گیا۔اُن کا فون آیا تھا کہ بیٹا! میں تم سے اور بچوں سے ملنے آ رہا ہوں۔“





”پتہ نہیں‘ کتنے دن کے لیے آ رہے ہیں؟“

”اب یہ تو اُن کے آنے کے بعد ہی پتہ چلے گا نا۔“

”دراصل مکان بھی تو چھوٹا ہے نا‘ کوئی فالتو بندہ آ جائے تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔“

”ارے‘ وہ کوئی فالتو انسان نہیں ہیں‘ خیر سے میرے ابا میاں ہیں‘ تمہارے سسر اور پھر اس گھر کے بڑے ہیں۔“ احسان صاحب نے تلخی سے کہا۔

”اچھا‘ میں اوپر والا کمرہ اُن کے لیے سیٹ کروا دیتی ہوں۔“ ارفع بیگم سے کوئی بات نہ بن پڑی تو جلدی سے بولیں۔

”اوپر والا کمرہ کیوں؟ وہ یہاں مانی‘ شانی کے ساتھ بھی تو رہ سکتے ہیں؟“

”لیکن مانی‘ شانی کے امتحان ہو رہے ہیں اور پھر یہ لوگ تو رات گئے تک پڑھتے ہیں خواہ مخواہ ابا جی بھی پریشان ہوں گے‘ ان کا بھی حرج ہوگا۔“ ارفع بیگم نے بہانہ تراشہ۔

”کوئی حرج نہیں ہوگا کسی کا‘ ویسے بھی وہ صرف سونے کے لیے ہی تو کمرے میں جائیں گے ورنہ تو اِدھر ہی رہیں گے‘ ہمارے ساتھ باتیں کریں گے۔“

”لیکن اوپر والا کمرہ بھی تو ہے‘ وہاں ایک بیڈ ڈال دیتے ہیں‘ اُن کے لیے کافی ہوگا۔“

”اوپر ہیٹر بھی نہیں ہے پھر انہیں کھانسی بھی ہوتی ہے اور بیمار پڑ جائیں گے پھر بار بار سیڑھیاں اترنا چڑھنا اس عمر میں اُن کے لیے ٹھیک بھی نہیں رہے گا۔“

”آپ تو بس کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں‘ ذرا ذرا سی بات کو مسئلہ بنا لیتے ہیں۔“ ارفع بیگم چڑ گئیں۔

”بھئی‘ اس میں مسئلہ بنانے والی کون سی بات

ہے' ایسے ہی الجھنے لگتی ہو تم؟" احسان صاحب کو بھی غصہ آ گیا۔

"آپ کو تو میری ہر بات بری لگتی ہے۔"

"کچھ دنوں کے لیے تو آتے ہیں ابا میاں اور ہمارے یہاں اُن کو رکھنے کو ایک کمرہ بھی نہیں ہے؟"

"یہ میں نے کب کہا' میں تو بس اتنا کہہ رہی ہوں' اُن کے لیے اوپر والا کمرہ ٹھیک کروا دیتی ہوں' وہ وہاں رہ لیں گے۔"

"اور میں تمہیں جو کہہ رہا ہوں کہ وہ اوپر نہیں رہیں گے بلکہ ہمارے ساتھ یہیں نیچے رہیں گے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اوپر ٹھنڈ میں وہ اکیلے کمرے میں رہیں۔ اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو اور ویسے بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے ہم اچھے لگیں گے؟ تم بڑی دانشور بنتی ہو' اخباروں میں مضمون لکھتی ہو اور اندر سے یہ حال ہے' ایک بزرگ کی عمر کا خیال نہیں؟ خوش دلی سے انہیں ویلکم نہیں کر سکتیں؟" احسان صاحب غصے میں پھٹ پڑے۔

"مگر میں یہ کہہ رہی تھی کہ......" ارفع بیگم نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس! میں اب اس بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا' ابا میاں' مانی' شانی کے کمرے میں ہی رہیں گے۔" احسان صاحب یہ کہتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ارفع بیگم بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

"اب اس بوڑھے کی خدمتیں کرو' عجیب مصیبت ہے۔"

*......*......*

"ارے واہ ارفع' کیا جادو ہے تمہارے قلم میں۔ عورتوں کے حقوق کو کس کمال سے ابھارا ہے تم نے۔ ہر طرف چرچے ہو رہے ہیں۔" ان کی دوست نیلم نے کہا۔ ارفع بیگم کی کچھ دوستیں ان کے گھر آئی ہوئی تھیں جو ان کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔

"عورتیں' مردوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ آج ہر مقام پر عورتیں' مردوں کے ساتھ برابر سے کام کر رہی ہیں۔ ملک کی ترقی میں جتنا حصہ مردوں کا ہے اس سے کہیں زیادہ عورتوں کا ہے۔ عورت ایک ماں بھی ہے' بیٹی بھی اور بہن بھی۔ گھر میں رہ کر وہ ان ذمہ داریوں کو سرانجام دیتی ہے اور باہر اپنے ملک و قوم کی فلاح و بہبود میں مردوں کے شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہے۔" نیلم نے اونچی آواز میں ارفع بیگم کے آرٹیکل کا کچھ حصہ پڑھا تھا کہ اچانک مانی اپنے ہاتھوں میں دودھ کا گلاس لیے ارفع بیگم کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"مما' مجھے دودھ گرم کر کے دیں۔ مجھے نہیں پینا یہ ٹھنڈا دودھ۔ پپا کہہ رہے ہیں' دودھ آپ گرم کر کے دیں گی۔" مانی کا یوں اچانک آ جانا ارفع بیگم کو بدمزہ کر گیا۔ ابھی تو آدھے سے زیادہ آرٹیکل رہتا تھا جس پر تبصرہ باقی تھا۔ انہوں نے مانی کو خود سے دور کیا اور ملازمہ کو آوازیں دینے لگیں۔

"رشیدہ' او رشیدہ' کہاں مر گئی' جلدی ادھر آ۔"

"مما' چار بج گئے ہیں' رشیدہ اپنے گھر چلی گئی ہے۔" اس بات پر ارفع بیگم کا موڈ اور زیادہ خراب ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا' انہیں خود ہی اٹھنا پڑے گا۔

"ایک تو اس رشیدہ کی پتہ نہیں کون سی ٹرین چھوٹ رہی ہوتی ہے' چار بجے نہیں اور یہ جا' وہ جا۔ دیکھ نہیں سکتی کہ کوئی کام تو نہیں ہے؟" انہوں نے بڑبڑانا شروع کر دیا تھا۔

"تمہاری ملازمہ کو اتنی تمیز نہیں کہ تم سے اجازت لے کر ہی جائے ارفع؟ یہ آج کل کے نوکر بھی نا' تنخواہ تو پوری چاہیے' کام بھلے سے پورا ہو یا نہ ہو۔" نورین نے ارفع کا ساتھ دینا ضروری سمجھا تھا۔

"مما' آپ دودھ گرم کر دیں نا پھر مجھے کل کے پیپر کی تیاری بھی تو کرنی ہے۔"

"اچھا' تم شانی کے پاس جا کر بیٹھو' میں ابھی آتی ہوں۔" اور پھر ارفع بیگم کی محفل بھی برخاست ہو گئی جس کا انہیں بہت دکھ تھا۔

"کل آ جانے دو اس رشیدہ کی بچی کو' عقل ٹھکانے لگاتی ہوں۔" جتنی دیر میں دودھ گرم ہوا' اتنی دیر تک ان کی زبان بھی چلتی رہی لیکن جب وہ دودھ گرم کر کے مانی' شانی کے کمرے میں پہنچی تو ابا میاں بیٹھے انہیں پڑھا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر انہیں کچھ راحت ہوئی اور وہ خاموشی سے مانی کو دودھ کا گلاس پکڑاتی باہر آ گئیں۔

"چلو' یہ ابا میاں کسی کام کے تو ہیں۔" انہوں نے خود سے کہا اور اب انہیں اپنے اگلے مضمون کی فکر تھی جسے وہ جلد از جلد پورا کرنا چاہتی تھیں۔

*......*......*

"رشیدہ' تو کل سارا کام چھوڑ چھاڑ کہاں چلی گئی تھی؟ کتنی بار سمجھایا ہے تجھے' کچھ اوپر نیچے کے کام بھی دیکھ لیا کر لیکن تیری عقل میں تو میری بات ہی نہیں سماتی۔"

"نہیں بی بی جی' میں تو اپنا پورا کام ختم کر کے چار بجے ہی گئی تھی۔"

"میں یہی تو کہہ رہی ہوں' یہ چار بجے تجھے ہو کیا جاتا ہے' کون سی نوکریاں کرتی ہے تو جو وقت پہ پہنچنا ہوتا ہے؟"

"بس بی بی جی' ہوتا ہے ایک ضروری کام پھر بتاؤں گی۔"

"ہاں' ہاں' میرے پاس بھی تیری کہانیاں سننے کا ٹائم نہیں ہے۔ دیکھ' مانی' شانی آ گئے ہوں گے' انہیں کھانا کھلا دے۔"

"جی' بی بی جی! مگر......وہ' بابا جی کے لیے کھانے میں کیا پکاؤں؟"

"کیا مطلب کیا پکاؤں' جو سب کھاتے ہیں' وہی کھائیں گے۔"

"نہیں بی بی جی' کل صاحب نے سختی سے منع کیا تھا کہ بابا جی کو وہ...... وہ کیا کہتے ہیں......کوئی مسئلہ ہے جی' وہ......وہی جس میں تیل' گھی بند ہوتا ہے۔"

"کولیسٹرول کی بیماری ہے انہیں' دل کے مریض جو ہیں۔"

"یہ جہالت بھی نا' ایک لفظ تجھ سے ٹھیک سے بولا نہیں جاتا۔"

"کیا کریں بی بی جی' ہمیں تو پڑھنا لکھنا آتا ہی نہیں ہے نا' بس یہی صاف صفائی ہمارا کام ہے۔"

"ہاں' ہاں' ٹھیک ہے' جا' جا کر اپنا کام کر۔"

"لیکن بابا جی کے لیے کیا بناؤں؟"

"ارے' کوئی ضرورت نہیں ہے اُن کے لیے کچھ الگ سے بنانے کی' گھر میں جو پکا ہے' وہی دینا انہیں' بس تیل ذرا ہٹا کر دے دینا۔ گھر کا خرچہ پہلے ہی پورا نہیں ہوتا' اوپر سے یہ اور آ گئے ہیں گھر کا بجٹ ہلانے۔"

"پر وہ صاحب نے تو کہا تھا......" رشیدہ نے انہیں بے چارگی سے دیکھا۔

"میں نے جو کہا ہے تو ویسا ہی کر' تیرے صاحب کو میں دیکھ لوں گی۔" ارفع بیگم نے اسے گھورا۔

"اچھا بی بی جی' جیسا آپ کا حکم۔"

*......*......*

"رشیدہ' آج تو اتنی دیر سے کیوں آئی' کہاں مر گئی تھی؟"

"وہ جی' آتے ہوئے پڑوسن ملی تھی' اُس نے

بات کرتے دیر ہوگئی بی بی جی......!'' رشیدہ جوتی اتارتی ارفع بیگم کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ ''بی بی جی' بہت تعریفیں کررہی تھی وہ آپ کی' بتارہی تھی کہ آپ کا نام چھپا ہے پرچے میں۔ کیا لکھا ہے بی بی جی' آپ نے پرچے میں' بڑی تعریف کررہی تھی وہ آپ کی۔ میں تو جی' پڑھ نہیں سکتی نا ورنہ سب سے پہلے پڑھتی۔ آخر میری بی بی جی نے لکھا ہے۔''

''ہاں رشیدہ' پڑھائی لکھائی بہت ضروری ہوتی ہے ایک عورت کے لیے۔ یہ جو جہالت ہے نا' لعنت ہوتی ہے ایک طرح سے۔ اَن پڑھ انسان کسی کام کا نہیں ہوتا۔''

''ہم غریب دو وقت کی روٹی مشکل سے پیٹ میں ڈالتے ہیں بی بی جی' پیٹ کی آگ بجھالیں تو کچھ اور سوچیں نا اور پھر اس موئی پڑھائی کے لیے اتنا روپیہ کہاں سے لائیں؟ لیکن بی بی جی' مجھے آپ کے لیے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میری پڑوسن آپ کی تعریف کرتی ہے تو میں بتاتی ہوں' وہ میری مالکن ہیں۔'' رشیدہ کی تعریف پر ارفع بیگم کی گردن فخر سے ذرا تن سی گئی تھی۔

''اچھا بی بی جی' آپ نے لکھا کیا ہے؟''

''بس رشیدہ' تعلیم کی ہمارے یہاں بہت ضرورت ہے' اس سے ہم معاشرے میں اپنا مقام حاصل کرسکتے ہیں۔ مضمون میں لکھا ہے چونکہ عورتیں تعلیم یافتہ نہیں اس لیے گھروں کا ماحول اچھا نہیں' آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں' ادب آداب' تمیز نہیں ہوتی' ایسے گھروں میں ہر بچہ چاہے وہ مرد ہو یا عورت' تعلیم کی بہت ضرورت رہتی ہے۔''

''بالکل سچ لکھا ہے بی بی جی' آپ نے' ہم مورکھوں کو کیا پتہ ان چیزوں کا' ہم تو بس ڈھور ڈنگر ہیں جی......!''



''چل بس اب بہت ہوگئیں باتیں' کام کر جا' سارا گھر ایسا ہی پڑا ہے' کام میں دھیان دیا کر۔''

•......•......•......•

''اچھا بی بی جی' اب میں چلتی ہوں' چار بج رہے ہیں' مجھے گھر جانا ہے۔''

''پھر سے ہوگئی تو گھوڑے پر سوار' جا' جا کر میرے لیے چائے بنا' بہت درد ہورہا ہے سر میں۔'' ارفع بیگم نے قلم اور کاغذ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تو رشیدہ گھڑی کو دیکھتی مرے مرے قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

''ارفع' خیریت تو ہے' کیا ہوا تمہیں؟'' اسی وقت احسان صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''کچھ نہیں' بس ذرا اپنا آرٹیکل پورا کررہی تھی اور سر میں بھی درد ہے۔''

''کوئی دوائی لی تم نے؟''

''نہیں' رشیدہ چائے بنارہی ہے' ذرا تھکن ہے' اتر جائے گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے' یہ بچے اور ابا میاں نظر نہیں آرہے' کہاں ہیں؟''

''وہ......صاحب جی' پچھلے والے لان میں بچوں کے ساتھ بیٹھے ہیں بابا جی......!'' ارفع بیگم کی بجائے رشیدہ نے جواب دیا جو چائے کی پیالی لے کر کمرے میں آگئی تھی۔

''اچھا' تم چائے پیو' میں ذرا ابا میاں سے مل آؤں۔''

''ہاں ہاں' کیوں نہیں' ان سے ملے بغیر آپ کو کھانا جو ہضم نہیں ہوگا۔'' ارفع بیگم خودکلامی کرتے بولیں۔ جانتی تھیں' اب جو ابا میاں کی شان میں کچھ کہا تو شوہر صاحب کو برا لگ جائے گا اس لیے اتنا رشیدہ کو ڈانٹنے لگیں۔

''کیوں ری رشیدہ' کیا ضرورت تھی تجھے بتانے کی؟ ابھی تو وہ آئے تھے' اب اور تھک جائیں گے' تجھے بڑی خبر رہتی ہے کون کہاں بیٹھا ہے۔''

''وہ بی بی جی' میں بابا جی کے لیے بھی چائے لے کر گئی تھی نا تو اس لیے پتہ تھا۔ اچھا' اب میں چلتی ہوں پھر تو دیر ہوجائے گی۔''

''آخر تیری ایسی کون سی مجبوری ہے ری' جو تو اتنا بھاگ بھاگ کے گھڑی کی سوئی بن جاتی ہے؟ آخر کرے گی کیا تو گھر جا کر؟''

''وہ......بی بی جی' میرا گھر والا ہے نا' اُس کی بوڑھی ماں ہمارے ساتھ ہی رہتی ہے۔ کہنے کو تو دو بھائی اور ہیں لیکن اِس بوڑھی ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کو کوئی تیار نہیں۔ میں نے ہی اپنے میاں سے کہا کہ اماں کو اپنے ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ بے چاری دو وقت کی روٹی ہی تو کھائے گی لیکن ساتھ میں دُعائیں بھی تو کتنی دے گی۔ بی بی جی......وہ میرے میاں کی ماں ہے تو میری بھی تو ماں برابر ہوئی نا' اب اِس عمر میں ہم بھی اِس کا خیال نہیں رکھیں گے تو اللہ کو تو منہ دکھانا ہے نا جی۔

بی بی جی' بوڑھی جان ہے' اُسے جلدی بھوک لگ جاتی ہے' خود سے تو کچھ کر نہیں پاتی اس لیے مجھے ہی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ میں اُس کو روٹی کھلاتی ہوں' سر دباتی ہوں' رات کو پاؤں بھی دباتی ہوں' خدمت کرتی ہوں جی' اُس کی' یہ تو اُس کا حق ہے نا بی بی جی' اور بدلے میں وہ کتنی دُعائیں دیتی ہے۔'' رشیدہ اپنی دھن میں بولے چلی جارہی تھی مگر ارفع بیگم گنگ سی اُسے دیکھے جارہی تھیں۔ انہیں یوں لگ رہا تھا' یہ جاہل عورت بول ہی نہیں رہی بلکہ آئینہ دکھلا رہی ہے۔ وہ لفظوں کی ماہر تھیں لیکن آج ایک اَن پڑھ گنوار کے الفاظوں کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ■




پپتا کہتے کہتے آنکھیں تھک جاتی ہیں
آنسو بہتے بہتے آنکھیں تھک جاتی ہیں

وعدے جھوٹے ہوں تو منظر یہ بھی دیکھا ہے
رستہ تکتے تکتے آنکھیں تھک جاتی ہیں

ہونٹوں پر جب پہرے ہوں تو آنکھیں بولتی ہیں
باتیں کرتے کرتے آنکھیں تھک جاتی ہیں

عشق کا روگ لگے تو اکثر ایسا ہی ہوتا ہے
ہر دم روتے روتے آنکھیں تھک جاتی ہیں

بے خوابی کے ناگ نے مجھ کو ایسا ڈسا ندیمؔ
زہر کو سہتے سہتے آنکھیں تھک جاتی ہیں


شفیق احمد ندیم

خالدہ شفق

# گنہگار بس

گلنار آفرین کا خیال

تری دعاؤں کی تقدیس میرا سرمایہ
میری حیاتِ پریشاں میں ہے سکوں تجھ سے

**اگر آپ کی جنت یعنی ماں حیات ہے تو اس کہانی کو ضرور پڑھیں**



اُس روز حسبِ معمول بس میں رش نہیں تھا' صبح سات تیس پر نکلنے والی اُس کے بی (K.B.) بس میں عموماً کالج کے طلباء اور آفس وغیرہ جانے والے حضرات ہی سفر کرتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ہی شہر اور اُس کے گرد و نواح کے علاقوں میں یہ اربن ٹرانسپورٹ چلائی گئی تھی جو کے بی کے نام سے موسوم تھی۔ اس میں عورتوں کے لیے مخصوص حصہ دوسری گاڑیوں سے قدرے بہتر تھا۔ بس میں چونکہ رش کافی کم تھا' آٹھ کے قریب عورتیں اگلے حصے میں تھیں اور اس سے ڈبل تعداد میں مرد سواریاں تھیں۔ شور بالکل نہیں تھا اور ایک پر کیف سا سکون کے بی بس میں چھایا ہوا تھا۔ میں بس کے زنانہ حصے میں کھڑکی کے پاس بہت اطمینان سے بیٹھی سفر کو انجوائے کر رہی تھی۔ گاڑی قذافی چوک سے آگے نکل گئی تھی۔ ماحول کو دیکھ کر میں سوچ رہی تھی کہ اس میں مطالعہ کرنا اچھا رہے گا۔ کوئی ڈسٹربینس نہیں ہوگی۔ گاڑی کے اس پرسکون ماحول میں اپنی سوچوں میں گم تھی کہ گاڑی نو نمبر چونگی پر رکی تو جھٹکا لگا۔ میں شیشے کے پار دیکھنے لگی' ایک بوڑھی خاتون بس میں سوار ہوئیں اور گاڑی کے دروازے کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ اُس رات ملتان میں بارش ہوئی تھی اور سڑکوں کے ساتھ کیچڑ جمع تھی۔ اُن بوڑھی اماں کے کپڑے کیچڑ سے خراب تھے۔ وہ بہت ضعیف تھیں۔ وہ گاڑی کے دروازے پر بیٹھی تھیں کیونکہ چلتی گاڑی میں انہیں جھٹکا لگ کر گرنے کا خدشہ تھا۔ بس کا کنڈکٹر بار بار انہیں وہاں سے اٹھنے کو کہہ رہا تھا اور نحیف و نزار اماں بے بس سی گاڑی کے رکنے کا انتظار کر رہی تھیں مگر اماں کے کپڑے کیچڑ سے ایسے لتھڑے ہوئے تھے کہ کوئی بھی انہیں اپنے پاس سیٹ پر نہیں بٹھاتا۔ اس طرح ساتھ والی عورت کے کپڑے بھی خراب ہو جاتے اور سیٹ بھی گندی ہو جاتی' شاید اسی خوف سے بھی وہ وہیں بیٹھی رہیں۔

اماں کو دیکھ کر میرے دل میں عجیب بے چینی سی ہو رہی تھی۔ انہیں بے بسی کی تصویر بنے دیکھ کر مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ اُسی لمحے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ ضعیف اماں کسی کی ماں ہوں گی۔ اسی خیال کے تحت میں سوچ رہی تھی کہ انہیں اٹھا کر اپنے برابر کی نشست پر بٹھا لوں جو کہ خالی تھی مگر میں باوجود ایسا سوچنے کے' اس پر عمل نہیں کر سکی تھی کیونکہ میں کالج جا رہی تھی اور میرا یونیفارم صاف ستھرا تھا۔ اگر میں انسانی ہمدردی میں بوڑھی اماں کو ساتھ بٹھا لیتی تو میرا یونیفارم گندا ہو جاتا اور مجھے کالج میں شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ میں اسی خیال میں تھی' اُسی وقت ایک برقع پوش خاتون نے گاڑی رکوائی اور اماں کو سہارا دے کر اپنے بالکل ساتھ بٹھا لیا اور اماں کا سامان اپنے پاس رکھ لیا۔ اماں کو برابر میں بٹھانے کی وجہ سے اُن خاتون کا برقع بھی کیچڑ میں سن گیا تھا مگر اُس جوان خاتون کے ماتھے پر ہلکی سی لکیر بھی نہیں آئی تھی بلکہ وہ بار بار بڑی محبت سے اماں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اماں کا کرایہ بھی خود ادا کیا تھا۔ اماں کو کچہری اسٹاپ تک جانا تھا۔ یہ منظر میرے لیے بہت حیران کن تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس خاتون نے کس جذبے کے تحت یہ نیکی کی تھی؟ اُس کا برقع بے شک بہت مہنگا تھا اور صاف ستھرا بھی مگر اَب اُس پر کیچڑ کے دھبے لگ چکے تھے۔ برقع میں ہونے کے باوجود اُس کا نقاب کھلا ہوا تھا اور چہرے سے وہ اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔ وہ بالکل اماں سے یوں چپک کر بیٹھی تھی جیسے اُسے اپنے کپڑوں کی کوئی پرواہ نہ ہو۔ اماں بار بار اُسے دُعائیں دے رہی

تھیں۔

''بیٹا! اللہ تجھے بوہتا دے۔ اللہ تیری حیاتی کرے۔'' اور نہ جانے کتنی ہی دُعائیں انہوں نے اُسے ٹوٹی پھوٹی اُردو اور پنجابی میں دے ڈالی تھیں۔ اِن دُعاؤں پر اُس عورت کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اُسے بہت تسکین مل رہی ہو۔ میں حیرت سے کبھی اُس عورت کو دیکھتی اور کبھی کیچڑ میں لتھڑی میلی کچیلی اماں کو دیکھتی۔ اُس عورت نے بہت محبت سے اماں کا ہاتھ بھی تھاما ہوا تھا۔ میں اُس کے جذبے کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اماں کو ساتھ سیٹ پر بٹھانا تو انسانی ہمدردی کا جذبہ نظر آتا تھا مگر اُن خاتون کی اتنی اپنائیت' میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی' میری طرح بس میں موجود باقی خواتین بھی حیران تھیں' شاید انہیں بھی اُس عورت کا بوڑھی اماں کے ساتھ اس درجہ لگاؤ کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اُسی وقت اماں کو زور کی چھینک آئی جس کی چھینٹیں اُس عورت کی طرف گئیں' ساتھ ہی اماں کے چہرے پر بھی ناک بہنے لگی مگر حیرت انگیز طور پر اُس عورت نے اُس کا کوئی برا نہیں منایا بلکہ فوراً اپنے پرس سے ٹشو پیپر نکالا اور اپنا منہ صاف کرنے لگی۔ بعدازاں دوسرا ٹشو پیپر نکال کر اماں کا بھی منہ صاف کیا۔ یہ منظر تو زیادہ حیران کن تھا۔ وہ اماں کی خدمت یوں کر رہی تھی جیسے وہ اُس کی سگی ماں ہو۔ اُس کا یہ عمل تو ہمدردی کے جذبے سے بھی کئی گنا بڑھ کر تھا بلکہ کسی انسان سے محبت کی انتہا تھی۔ کچھ دیر بعد اماں کا کچہری اسٹاپ آیا تو اُسی عورت نے سہارا دے کر اماں کو بہت احتیاط سے بس سے اترنے میں مدد دی اور پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرے پر ایسا سکون تھا جسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد میرا کالج آیا تو میں اتر گئی۔ میرے ساتھ وہ عورت اُسی اسٹاپ پر اتری تھی اور اب مجھ سے چند قدم آگے چل رہی تھی۔ اُسی وقت میں نے انہیں پکارا۔

''آنٹی......! ذرا سنیے۔''

اُس عورت نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ''جی بیٹا......!''

''آنٹی......! آپ سے ایک بات پوچھنا تھی؟''

''بولو بیٹا......!'' عورت نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''آنٹی......! آپ نے اُن بوڑھی اماں کو اپنے ساتھ سیٹ پر بٹھایا حالانکہ اُن کے کپڑے بہت گندے تھے' کیچڑ لگی ہوئی تھی جس سے آپ کا برقع خراب ہو گیا پھر آپ نے ٹشو سے اماں کے منہ کی گند بھی صاف کی تو یہ سب آپ نے خوشی خوشی کیوں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال پر عورت کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اُس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کر کے مجھے بہت سکون ملا ہے' وہ سکون جس کے لیے میں پچھلے تین سال سے ترس رہی تھی کیونکہ میری ماں کو دنیا سے گئے تین برس ہو گئے ہیں۔ بے شک وہ اماں' میری ماں نہیں تھیں مگر میں نے اُن میں اپنی ماں کی خوشبو کو محسوس کیا تھا۔ میں نے اماں کی خدمت کر کے اُن پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنی تشنگی کے احساس کو کم کیا ہے۔ بیٹا! اگر وہ میری ماں نہیں تھیں تو کیا ہوا' کسی اور کی تو ماں تھیں اور مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔'' وہ عورت مڑ کر اپنے رستے پر چل دی اور میں اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ واقعی اُس نے سچ کہا تھا' مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔





حنیف سحر

# گردشِ رنگِ چمن

رسا چغتائی کا خیال

صرف مانع تھی حیا بند قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

**اس عورت کا حقیقی روپ سامنے لاتی کہانی جسے زمانہ طوائف کہتا ہے، نواں حصہ**

'کیسی شرائط یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'
دلنواز عرف خانم نے ٹیڑھی ترچھی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور خورشید کے بدلتے رویوں پر نظریں مرتکز کر کے اگلے منظروں کی منتظر ہوئی...

'اس میں اتنا پریشان ہونے والی کون سی بات ہے... پہلے سن تو لو ایسا کچھ نہیں کہنے والی جسے تم لوگ مان نہ سکو... بہت چھوٹے سے مطالبے ہیں...' میں نے ان کے چہرے کے تغیرات اور ان کے رویے کے بدلاؤ دیکھ کر اس طرح کی بات کی جو اس بگڑتی ہوئی بات میں کچھ شانتی اور ٹھہراؤ لے آئی..

'میرا خیال ہے سن لینے میں کوئی حرج نہیں ہے' خانم نے اپنے مخصوص انداز سے خورشید سے کہا جس کے نتیجے میں خورشید بالکل ہی رام ہو گیا...

'میں نہ تو گھر سے بھاگ کر آئی ہوں نہ ہی مجھے کسی نے بیوفائی کر کے بیچ چوراہے میں لا کے پھینکا ہے، مجبوریوں کی ماری ہوں اور حالات کی ستائی ہوئی ہوں، بس اپنے گھر والوں ماں اور بہن بھائیوں کے لیے اس جہنم میں کود رہی ہوں تو چاہتی ہوں کہ ان کا بھلا ہونا چاہیے۔'

' اور وہ بھلا کیسے ہوگا...؟' خورشید نے پوچھا۔

'بس یوں ہے کہ میں چاہتی ہوں خانم سے تمہیں میری جو بھی قیمت ملے' اس میں زیادہ حصہ میرا ہو، اور یہ کہ میں کبھی کبھی اپنے گھر والوں سے ملتے رہنا چاہتی ہوں' مجھے ملنے سے کبھی نہ روکا جائے! اور مجھ پہ زیادہ روک ٹوک نہ کی جائے' یہ سن کر خانم کے ہونٹوں پر ایک خبیث سی مسکراہٹ طلوع ہوئی مگر وہ خورشید کے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔

خانم کی تحویل میں آنے کے بعد یہ ان کی مرضی ہے کہ یہ تیرے ساتھ کیا کرتی ہیں، یہاں ان کی مرضی اور حکم چلتا ہے اور تو کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ اب تیری مرضی کی کوئی حیثیت نہیں ہے، خوشی سے مان یا نا خوشی سے مان' کرنا تو وہ ہی ہوگا جو خانم چاہے گی۔' خورشید نے اپنی دانست میں بہت ہوشیاری سے گیند خانم کی کورٹ میں پھینک دی مگر وہ خانم ہی کیا جو خورشید جیسوں سے کہیں ہار جائے، اسے تو اپنا کاروبار چلانا تھا اور لڑکی میں ہوں یا کوئی اور اسے تو مجھ سے زیادہ سے زیادہ مال کمانا تھا اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ جو بات میری خوشی میں تھی' وہ میری ناراضی میں نہیں تھی، میں خوشی خوشی تو خانم کے لیے لاکھوں کما کے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی بن سکتی ہوں اور غصے میں رہی اور میری مرضی کے خلاف مجھے استعمال کیا گیا تو میں کبھی بھی اس کے لیے وہ ثابت نہ ہوں گی جس کی اسے ضرورت ہے جو لڑکی ہٹی ہو' زبردستی اسے دھندے پر لگایا جائے سختی اور ڈر سے وہ مان بھی جائے... تو خانم کے فائدے کے لیے وہ نتائج نہیں لا سکتی جو خوشی خوشی دھندے پہ بیٹھنے والی لڑکی لا سکتی ہے اور یہ بات خانم بہت ہی اچھی طرح جانتی تھی...

اس نے میرے قریب آ کر مجھے غور سے اور قدرے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی... 'مجھے تیری سب باتیں منظور ہے، میں اپنی لڑکیوں پہ بلاوجہ کی سختی اور روک ٹوک کی قائل نہیں ہوں، جب تک کوئی بھی لڑکی میری وفادار بن کے ایمانداری سے میرے ساتھ رہے، کسی سودے اور کسی معاملے میں چھل کپٹ نہ کرے تو سمجھو وہ میری اپنی بیٹیوں کے برابر ہے، مجھے تو اپنے دھندے سے مطلب ہے جو میرا خیال کرتا ہے' میں اس کا خیال کرتی ہوں اس لیے مجھے تو تمہاری کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے سب منظور ہے البتہ یہ خورشید تمہیں یہاں لے کر آیا ہے میں نے سودا بھی اسی سے طے کیا تھا اور میں دھندے میں اپنے اصولوں اور بات کی بڑی کھری ہوں۔ جو رقم تمہاری اس کے اور میرے درمیان طے ہوئی ہے' وہ تو میں اسی کو دینے کی مجاز ہوں، تم یہ رقم کا زیادہ حصہ جو مانگ رہی ہو تو وہ تم خورشید سے طے کر لو جو تم دونوں میں طے ہوگا میں اسی کے بموجب رقم تم دونوں کو دینے میں دیر نہ کروں گی، کیوں خورشید ٹھیک کہا نا میں نے' وہ ایسا کہہ کر خورشید کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ خورشید کچھ بھی بولتا میں نے جلدی سے کہا' اور جو یہ مجھے زیادہ رقم دینے پر راضی نہ ہوا تو کیا تم اسے ہی زیادہ رقم دے دو گی؟'

'دھندے کا یہی اصول ہے۔'

'اور وہ جو تم نے ابھی مجھے بیٹی کہا تو اس کا پاس نہیں رکھو گی تم، بس اتنی سی دیر کے لیے بیٹی بولا تھا؟'

'تم سمجھ نہیں رہی ہو تمہارا میرا رشتا تو ابھی شروع بھی نہیں ہوا ابھی تو تم خورشید کا مال ہو'

'میں خورشید کا مال نہیں ہوں میں اپنی مرضی کی مالک ہوں جو میں نہ چاہتی تو خورشید مجھے یہاں تک لا نہ سکتا تھا، تم دونوں کان کھول کے سن لو میں پیسے کی خاطر اس دھندے پر بیٹھنے پر راضی ہوئی ہوں اور پیسے کے معاملے میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گی' جو خورشید نہ مانا تو میں یہاں سے خورشید کے ساتھ واپس نہیں جاؤں گی، میرے تیور دیکھ کر خانم کو لگا کہ معاملہ کچھ بگڑنے والا ہے تو اس نے خورشید سے کہا کہ وہ بتائے اس کی کیا رائے ہے، وہ ہی خورشید جس نے مجھے کھانا لے کر دیا تھا اور میرے ساتھ ایک ایسے وقت میں ہمدردی کی تھی کہ میں اس کا احسان مانتی کہ اس نے میرے بھوک سے بلکتے گھر والوں کو کھانا کھلوایا تھا مگر میں جانتی تھی کہ دنیا کے جس بازار میں تقدیر مجھے لے آئی ہے' یہاں پیسوں کے معاملے میں مروت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سب کچھ کھو کر بھی ہاتھ کچھ نہیں آنے والا اس لیے میں اپنی بات پہ ڈٹی رہی اور یہ نہ دیکھ سکی کہ خانم نے اس خورشید کے بچے سے اشاروں اشاروں میں کیا کہا تھا کہ وہ اس وقت ایک دم چپ رہا کچھ بولا نہیں اور خانم ہی میرے مد مقابل ہوئی۔

'کیا تمہیں معلوم ہے کہ کتنے میں بات ہوئی ہے؟' خانم کے اس سوال پر میں چونک ہی تو پڑی اور اسی وقت میری کھوپڑی میں یہ بات آئی کہ میں کتنی بھی ہوشیاری کر لوں' ان لوگوں سے جیت نہ سکوں گی کیوں کہ اب خانم ایسی چال چلنے والی تھی جس سے خورشید بھی ناراض نہ ہو اور میں بھی اپنی جگہ مطمئن رہوں اور یہ میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ میری کیا قیمت ہو سکتی ہے؟' کیوں کتنے میں بات ہوئی ہے؟ میں نے کمزور لہجے میں کہا جیسے مجھے شکست ہو چکی ہو، میں اب اگر نہ بھی مانوں تو کیا ہوگا کہاں جاؤں گی اجنبی شہر اور رستے سب کے سب میرے لیے ایسے کہ میں ایک گلی میں داخل ہو جاؤں تو دوسری گلی نہ ملے سمجھو بھول بھلیاں تھا یہ سب کچھ میرے لیے، میرے پاس اب کوئی راستا نہ بچا کہ میں خورشید سے بگڑتی ہوئی بات کو سنبھال لوں اس قسم کے ذہن میں مچنے والے شور میں' میں یہ بھی بھول گئی کہ مجھے دیکھے بنا میری بولی طے ہو بھی کیسے سکتی ہے، مگر جو پھڈا میں نے ڈال دیا تھا' اس کو دیکھتے ہوئے خانم مجھے ہی زیادہ حصہ دے کر یہ ثابت کرنے والی تھی کہ ان دونوں نے میری ہی بات مان لی ہے حالانکہ بعد میں وہ خورشید کو اصل رقم دے کر اسے خوش کر دے گی اور میں کبھی نہ جان سکوں گی کہ میں کتنے میں بکی... اور لکھاری بابو یہ بات میں نے کوئی تین برس بعد جانی کہ میری اصل قیمت چالیس ہزار لگی تھی مگر اس وقت

خانم نے مجھے تیس ہزار بتا کر رقم کا ساٹھ فیصد حصہ مجھے دے دیا' اس طرح خورشید بھی خوش ہوگیا اور میں بھی مطمئن ہو گئی مگر اس سے زیادہ اہم میرے لیے خورشید سے تعلقات کو بنائے رکھنا تھا' یہ بھی مجھے وقت کے وقت ہی سمجھ میں آیا کہ میں یہ پیسا اپنے گھر والوں کے پاس کیسے بھیجوں گی اور بعد میں بھی... خورشید پولیس والا تھا وہ چاہے تو میرے چھوٹے چھوٹے بھائیوں کو کسی بھی مصیبت میں ڈال کر تھانے میں بند کرسکتا ہے، ہم اپنے ابا کا زخم کیسے بھول سکتے تھے اور مجھے اس واقعے کے بعد تو ہمیشہ ایسا لگتا رہا ہے کہ اس ملک میں کسی کو بھی تھانے میں ڈال کر جان سے مار دینا سب سے آسان کام ہے اس کی نہ کہیں سنوائی ہے اور نہ ہی ان ظالموں سے کوئی حساب لینے والا ہے۔ سمجھو خدا کی زمین پر پولیس والے بھی خدا کے برابر اختیارات کے مالک ہوتے ہیں' سو میں نے اس طرح پینترا بدلا کہ خورشید تو کیا حیران ہوتا' خانم کی حیرانی دیدنی تھی' وہ مجھے دیکھتے ہوئے اچھی طرح سمجھ گئی کہ لڑکی حرفوں کی بنی ہوئی ہے' جتنی باہر ہے' اس سے زیادہ اندر ہے میرے خورشید سے یہ کہہ دینے سے کہ اچھا چلو چھوڑ و' جھگڑا مکاؤ خورشید جو مجھے دینا چاہے گا' میں رکھ لوں گی، میں بڑی مذاقیہ ہوں بس' اویں مذاق کررہی تھی، خورشید نے کھیسی نکالی اور بولا پتا نہیں تو اُس وقت مذاق کررہی تھی یا اِس وقت مذاق کررہی ہے، پر جو بھی ہے' اب مجھے تجھ سے کوئی مسئلہ نہیں ہے میں یوں کرتا ہوں کہ آدھا آدھا کرلیتے ہیں' میں نے کہا جس میں تو خوش میں بھی راضی ہوں پھر جو تیرے من میں بے ایمانی آ گئی تو' تو اس سے بھی زیادہ رکھ سکتا ہے پر کیوں کہ میں جانتی ہوں مجھے یہ پیسے گھر دینے جانے کی اجازت خانم نہ دے گی۔ ابھی تو میں دھندے پہ بھی نہیں بیٹھی تو اتنی جلدی مجھ پہ خانم اعتبار نہیں کرسکتی... میں نے کچھ اس طرح کہا تھا کہ شاید خانم مجھے جانے کی اجازت خلوص اور تکلف میں دے ہی دے مگر خانم نے دنیا دیکھی تھی' اس نے ابھی کچھ دیر پہلے مجھے اور میرے ارادوں کو شکست دی تھی تو اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ' وہ کرتی جو میں چاہتی تھی، اس نے بڑے رسان سے کہا کہ میں تمہیں جانے تو دیتی مگر اس وقت تو یہی بہتر ہے تم خورشید کے ہاتھوں پیسے بھجوا دو ورنہ اپنی ماں کو کیسے سمجھاؤ گی کہ یہ پیسے کہاں سے لائی ہو؟ یا پھر تمہاری ماں بھی اس سودے بازی میں شریک ہے تو پھر کوئی بات نہیں تم گاڑی میں بیٹھ کر چلی جانا اور پیسے دے آنا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں خانم کی ذہانت کی قائل ہوگئی' وہ ایسی بات بھی بھانپ گئی جو میں نے اسے بتائی بھی نہ تھی یعنی میں اپنی ماں اور بہن بھائیوں کا سامنا کیسے کروں گی جو کسی نے زیادہ سوال جواب کرلیے تو کیا ہوگا اور یوں میں نے خورشید کے ہاتھ ہی وہ پہلے پیسے بھیج دیے کہ میں اپنی ہی قیمت کے پیسوں سے اپنی دنیا کے لوگوں کی زندگی بنانے کی طرف چل پڑی تھی...

☆......☆

بولتے بولتے ماہ لقاء یا زلیخاں ایک دم سے چپ ہوگئی تو سائرس کو لگا کہ کمرے میں عجیب سا حبس جمع ہوگیا تھا، کچھ لمحے تو ایسا لگا جیسے سانس بھی لینا دشوار ہو رہا تھا... ماہ لقاء ایک دم ہی خاموشی کی زبان سے رونے لگی اس کے آنسو گرے تو یک لخت بلقیس نے اسے خود سے چمٹا لیا اور سائرس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس نہایت دردانگیز ماحول میں کیا کرے' یہ ایسا دکھ تھا جس میں غم سے تڑپنے والیوں کو تسلی بھی نہیں دی جاسکتی تھی دونوں کا دکھ ایک جیسا تھا بس اتنا فرق تھا کہ اس گندگی میں اترنے کے لیے ماہ لقاء نے تکلیف تو بلقیس کے برابر کی جھیلی مگر اسے کسی کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنے پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ چار لوگوں کا خون کر کے بھی بلقیس کا مقدر نہیں بدل سکا وہ پہنچی وہیں جہاں اس قسم کی بھول کرنے والیاں لڑکیاں عموماً پہنچا کرتی ہیں، وہ ایک لمحہ جب بلقیس کو یہ لگا تھا کہ ٹرین میں ملنے والا احسن اس کے سب دکھ درد کی دوا بن کے اچانک اس کی زندگی میں آ گیا ہے اور اسے اب کٹی پتنگ کی سی زندگی نہیں گزارنی ہوگی۔ اس بے پناہ اذیت ناک زندگی میں وہ سب سے زیادہ امیدوں سے اٹا ہوا وقت کا لمحہ تھا مگر افسوس کہ احسن بھی راہ میں ملنے والا ایک لٹیرا ہی تو تھا فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے دو گھڑی کے لیے ہی سہی بلقیس سے ہمدردی کی تھی اور ایک ہلکی سی کوشش کی تھی کہ اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو وہ اسے اپنے دوست اور گروہ کے باقی ممبران سے چھپ کر کہیں بھی جہاں بلقیس کہے گی چھوڑ آئے گا مگر بلقیس کا کوئی ہوتا تو وہ احسن کے ساتھ جاتی ہی کیوں؟ اسی لیے بلقیس کو احسن کو قتل کردینے کا زندگی میں سب سے زیادہ افسوس ہوا تھا مگر اس کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو پھر احسن اپنی مجبوریوں کے وجہ سے ہی سہی جانے اور کتنی لڑکیوں کو جہنم میں دھکیل دینے کا سبب بنتا... اب یہ بات تو بہر حال بلقیس جیسی لڑکی نہیں جانتی تھی کہ دنیا میں شیطان رہتی دنیا تک رہیں گے' ہر دور میں رہے ہیں' روپ بدل بدل کر کتنے شیطان بھی مار ڈالو یا ختم کردو... وہ پھر سے پیدا ہو جاتے ہیں' اُن کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح بالکل خود رو... اور اپنے آپ انھیں کوئی نہ بھی پیدا کرے' تب بھی وہ رہتے تو ہیں اور ہمیشہ رہیں گے البتہ بلقیس کے اپنے اطمینان کے لیے یہ بہت کافی تھا کہ اس نے اپنے جیسی کئی لڑکیوں کو ان شیطانوں کے چنگل میں پھنسنے سے بچالیا تھا مگر خود بلقیس کا مقدر وہی کا وہی رہا... سائرس وہاں سے ہٹ کر بالکونی میں آ گیا اور اداس پڑتی فضاؤں میں سوچنے لگا کہ کہانیاں انسان کو ہمیشہ بہت دکھی کر جاتی ہیں' بھلے ہی سائرس کا تعلق بلقیس اور ماہ لقا سے کوئی ایسا نہ تھا کہ وہ ان کا کچھ لگتا ہو پھر بھی اب وہ اس کے اس ناول کا کردار بن چکی تھیں اور یہ تو ایسا جیتا جاگتا کردار تھیں کہ ان کے دکھ پر اداس ہونا تو اس کی مجبوری تھی ورنہ لکھاریوں کو تو اپنے ان کرداروں کی الم اور بربادی یا موت پر بھی عین اس طرح رونا پڑتا ہے جیسے کہ وہ اسی دنیا کے جیتے جاگتے کردار ہوں حالانکہ وہ تو کسی بھی لکھنے والے کے اپنے ذہن کی تخلیق اور اپنی اختراع ہوتے ہیں مگر کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے...

دشت ہستی مقتل ہے تو لہو روتے ہیں دل
دل لہو روئیں تو ہوتی ہے کہانی پیدا

یہ تو پھر بھی اسی دنیا کی دو جیتی جاگتی عورتیں تھیں جو ڈیرے دار اور ٹھیے دار قسم کی خاندانی طوائفیں بھی نہیں تھیں' انھیں حالات اور کچھ اپنی غلطیوں نے ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں تھی... کہانی سناتے سناتے وقت کا پتا نہیں چلا سلسلہ کچھ ٹوٹ کے بھی جڑا' اس وقت وہ تینوں بلقیس کے گھر اس کے بیڈ روم میں تھے اسی لیے تھوڑی دیر بعد جب وہ دونوں جی بھر کے سوگ منا چکیں تو بلقیس نے اپنی خادمہ زرینہ سے چائے لانے کو کہا اور کچھ ہی دیر بعد یہ محفل اب اس قسم کے ماحول میں جمی ہوئی تھی کہ جیسے یہ کہنا مشکل تھا کہ کچھ دیر پہلے یہاں کوئی ایسی دردانگیز کہانی کہی گئی ہو جس میں ایک لڑکی ایک عام گھر سے اٹھ کر یوں بازار میں آ بیٹھی کہ دنیا میں کسی کو کچھ فرق ہی نہیں پڑا اور اس کی زندگی کے جیسے زمین و آسمان اوپر نیچے ہو گئے....

'یہ بتاؤ لکھاری تم ان کہانیوں کا کیا کرتے ہو؟

بیچتے ہوتو پھر تم بھی ہماری ان نائکاؤں کی طرح ہی ہوئے جو ہمارا سودا کرتی ہیں...ہمیں بیچ بیچ کے اپنا الو سیدھا کرتی ہیں اور اس طرح ان کی زندگی کٹ جاتی ہے تم ذرا دوسرے طریقے سے بیچو گے پر کام تو تم بھی وہ ہی کرنے والے ہو؟ چائے پیتے پیتے ماہ لقا نے سائرس کی شہ رگ پر جیسے حملہ ہی تو کر دیا تھا...

'بکتا تو اس دنیا میں سب کچھ ہے ماہ لقاء...وہ آٹا بھی اور وہ سب کچھ جس سے تم اپنا پیٹ بھرتی ہو، اور وہ کپڑا بھی جس سے تم اپنا تن ڈھانپتی ہو، اور وہ علم بھی جس سے دنیا میں اجالا ہوتا ہے...دنیا کا بازار تو ایسا عجیب ہے کہ یہاں اللہ کا کلام قرآن مجید بھی مفت میں نہیں ملتا اس کا بھی ہدیہ ہوتا ہے...اب یہ الگ الگ بات ہے کہ کیا بک رہا ہے، کیا خریدا جا رہا ہے، کیسے بک رہا ہے اور کیسے خریدا جا رہا ہے...ان سب باتوں میں اگر تمہیں کوئی فرق نہیں لگتا تو پھر مجھ میں اور تمہاری اس جسم بیچنے والی نائکہ میں کچھ فرق نہیں ہے تم مجھے ان کے برابر کر سکتی ہو میں برا نہیں مانوں گا' سائرس کی اس اتنی لمبی وضاحت کو بلقیس نے کہیں زیادہ دلچسپی سے سنا...اور اس کے چہرے کے تاثرات سے لگنے لگا کہ وہ سائرس کی ذہانت کی قائل ہو گئی ہے۔

'تم واقعی لکھاری ہو' ایسا لاجواب کرتے ہو کہ بندہ کچھ اور کہنے کے قابل نہیں رہتا مان گئی میں تم کو ...پھر بھی میری اس بات کا جواب دو کہ تمہیں ہماری کہانی لکھ کر شہرت ملے گی پیسا بھی ملے گا مگر ہمیں کیا ملے گا ہم نے کیوں اپنی کہانی تمہیں سنائی یہ میں تم سے پوچھتی ہوں؟'

'طوائف کی زندگی گزارتے گزارتے تم ہر معاملے میں اپنا فائدہ دیکھنے کی عادی ہو چکی ہو شاید...' سائرس بولا اور ساتھ ہی بلقیس نے اس کی توجہ ٹھنڈی پڑتی چائے کی طرف دلائی... 'چل اب تھوڑا دم لے... بیچارے کو چائے تو سکون سے پینے دے باقی سوال بعد میں کر لینا'

'نہیں' اسے پوچھنے دو بلقیس... میں چائے پیتے پیتے ہی جواب دے رہا ہوں...اصل میں ماہ لقاء بعض اوقات ہم کوئی بھی کام وہ سوچ کے نہیں کرتے جو اس کا انجام ہوتا ہے، اب اسی بات کو لے لو کہ وہ جو تمہیں جن لوگوں نے معاوضہ کا ایڈوانس بھجوایا تھا اور تم نے سمجھا کہ بعد میں کوئی سودا ہوگا' اس میں شامل کر لیا جائے گا مگر انھوں نے تمہاری سوچ کے بالکل برعکس جواب دیا، ان کا کہنا ہے کہ جو حادثہ ان کے ہاں ہوا' کوئی مر گیا غالباً تو اس سے تمہارا کیا تعلق نہ ہی تم اس حادثے کی ذمہ دار ہو...لہٰذا انھوں نے اپنا معاوضہ تمہیں بخش دیا اور ساتھ ہی یہ کہلوا دیا کہ اب یہ کبھی کسی آنے والے سودے میں نہ ہی شامل کیا جائے گا اور نہ ہی اس کا اب کوئی حساب کتاب ہوگا...جبکہ تم نے ایسا نہیں سوچا تھا تو ایسا ہی زندگی میں کئی دفعہ ہوتا ہے ہماری نیت کچھ اور ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ کچھ اور بھی نتیجہ نکل آتا ہے، مثلاً ایک شخص نے کوئی درخت لگایا اپنے آرام کے واسطے مگر وہ ہر وقت تو اس درخت کے نیچے نہیں بیٹھے گا لہٰذا اس درخت کے نیچے کوئی پریشان حال اور تھکا ہوا مسافر بھی دم لینے کو بیٹھ سکتا ہے جبکہ اس درخت لگانے والے شخص نے تو ایسا سوچا بھی نہ تھا، اسی طرح جب میں نے یہ کہانیاں لکھنے کا سوچا تو میرے دماغ میں صرف ایک بات تھی کہ عورت طوائف کیسے بنتی ہے یہ معلوم کروں اور اپنے پڑھنے والوں کو بتاؤں... مجھے یہ بات اس وقت معلوم تھی کہ بہت سی لڑکیاں طوائف ماؤں کی کوکھ سے جنم لیتی ہے تو انھیں شروع ہی سے جس ماحول سے واسطہ پڑتا ہے' وہ ماحول انھیں طوائف بنا دیتا ہے اور ان میں



سے بیشتر خوشی خوشی اس ماحول اور اپنے اس مقدر کو قبول کر لیتی ہیں کہ انھیں تو طوائف ہی بننا تھا وہ کبھی سوچتی تک نہیں ہیں کہ وہ طوائف کیوں بنی ہیں اور نہ ہی ابتدا میں کسی بھی قسم کی مزاحمت کرتی ہیں کیوں کہ ان کے دل و دماغ میں کوئی اور تصور ہوتا ہی نہیں ہے لیکن ممکن ہے کوئی نہ کوئی ایسی لڑکی بھی ہوتی ہو جو طوائف نہ بننا چاہتی ہو' اسے منظور نہ ہو اس پیشے میں آنا اور اسے زبردستی یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہو' اس سے کروایا جاتا ہو' میری نظر میں وہ اس طوائف سے بہت زیادہ مظلوم ہے جو خوشی خوشی طوائف بنی ہے اور اس قسم کی طوائف سمجھ لو کہ میری کہانی ہے میں اس سے ضرور پوچھنا چاہوں گا کہ وہ طوائف کیوں نہیں بننا چاہتی تھی اور یہ کہ وہ کیا سوچتی ہے اگر طوائف نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟ بلکہ کوئی لڑکی ایسی بھی شاید مجھے مل سکے جو اپنی کوشش اور مرضی سے یہاں سے نکلنے میں کامیاب رہی ہو اور وہ کوئی اور کسی اور طرح کی زندگی جیتی ہو' ممکن ہے وہ ایک شریف عورت کی زندگی جی رہی ہو' کسی شریف آدمی کی بیوی ہو اور کچھ اچھے خاندان کے بچے اس نے پیدا کیے ہوں، میں ایسی عورت سے ملنا چاہوں گا اس سے پوچھنا چاہوں گا کہ اس نے اتنا مختلف کیوں سوچا اور اب وہ کیا محسوس کرتی ہے ظاہر ہے کوئی بھی شریف آدمی اسے واپس اس گندگی میں آنے تو نہیں دے گا ایسی صورت میں اپنی ماں اور بہنوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا کیسا لگتا ہے' کبھی ان کی یاد آتی ہے تو اس پر کیا گذرتی ہے میں کسی بھی ایسی لڑکی سے ملنا چاہوں گا، مگر شاید میں ایسی لڑکی سے نہ مل سکوں مگر وہ میری تلاش اور میری کہانی کا حصہ تو بہر حال بن سکتی ہے.. اصل میں ایسی داستانیں جو اپنے فارم سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان میں کوئی اور ہی سیکھ دی گئی ہو' وہ لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہی نہیں بنتیں بلکہ ایسی کہانیوں سے انھیں اپنی زندگیوں میں بہت کچھ سیکھنے اور بعض اوقات صحیح فیصلہ کرنے میں مدد ملتی ہے' کہانیوں سے اگر کوئی بھی سبق اور کوئی بھی سیکھ نہ ملے تب بھی انھیں صرف پڑھنا بھی ایک اچھا وقت گزارنے کے برابر ہے ممکن ہے جس وقت میں آپ نے وہ کہانی پڑھی ہے' اگر وہ کہانی نہ ہوتی تو آپ کسی کی برائی اور غیبت کر کے یا سن کے وہ وقت گزارتے یا پھر کسی اور مصیبت میں پھنس سکتے تھے ایسا بہت کم ہوتا ہے آپ پڑھنے سے زیادہ بہتر کوئی کام کر سکتے۔ پڑھنے سے بہتر بس نماز ہے۔ وہ اگر آپ نے چھوڑ دی ہے تو غلط کیا ہے۔ نماز ہر حال میں پڑھنی چاہیے۔ کہانی پڑھتے وقت ممکن ہے کوئی لڑکی بلقیس کی جیسی غلطی کرنے والی ہو تو وہ ایسا قدم اٹھاتے ہوئے رک جائے گی بلقیس کا انجام اس کے پیروں کی زنجیر بن سکتا ہے وہ ایسے راستے پر چلنے سے خود کو روک سکتی ہے اور یوں بلقیس کی کہانی سے کسی اور کو وہ راہ سجھائی دے سکتی ہے جو خود بلقیس کو بھی سجھائی نہیں دی تھی' اس طرح ایک بھٹکتی ہوئی لڑکی ایک اور بلقیس بننے سے رک سکتی ہے ایک اور فیصل کا شکار ہونے سے خود کو بچا سکتی ہے اگر ایسی کہانیاں نہ ہوں تو پھر کوئی بھی خود کو بچا نہ سکے گا اور یوں دنیا میں ایسے واقعات ایسی کہانیاں ہمیشہ جنم لیتی رہیں گی' ان کی تعداد میں بھی کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اب جس طرح بلقیس برباد ہوئی ہے' اگر یہ اس وقت کوئی ایسی کہانی پڑھ لیتی تو سوچو کہ کس طرح خود کو اس غلط راستے پر چلنے سے بچا سکتی تھی...'

'ٹھیک کہتے ہو تم سائرس...ایک دم ٹھیک... مجھے اپنی تباہی سے زیادہ ملال اپنی ماں بہنوں کے بچھڑ جانے کا خیال ہے کہ میں کم سے کم زندگی میں ایک بار ان کی شکل دیکھ سکوں اور یہ جان سکوں کہ وہ کیسی ہیں تو میرے لیے یہ بڑے کرم اور نصیبوں کی

بات ہوگی بے قرار اور تڑپتی ہوئی آتما کو چین مل جاتا... کاش مقدر مجھے اتنا تو دے سکتا' یہ کہہ کر بلقیس ایک دم ہی رو پڑی ماحول پھر سے سوگوار ہوگیا... کچھ دیر تک گھور خاموشی رہی پھر جیسے بہت دیر سے اپنے اندر کلبلاتے اس سوال کو ماہ لقاء نے باہر اگل دیا...

'تم ٹھیک کہتے ہو... لکھاری' جو ہم سوچ کے کوئی کام کرتے ہیں' ضروری نہیں کہ وہ اسی طرح ہو بھی جائے' اس کے نتائج مختلف بھی ہوتے ہیں اور کئی سمتوں میں پھیلے ہوئے بھی ہوتے ہیں۔'

'ایک دم صحیح... اب سمجھی ہو تم... میری نیت تو بس یہ تھی جس وقت میں نے یہ کہانیاں سننا اور لکھنا شروع کیا کہ میں لوگوں کو یہ بتانے نکلا ہوں کہ کوئی بھی عورت طوائف کیسے بنتی ہے... اس سے زیادہ میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا... مگر اب سوچتا ہوں کہ جب ان کہانیوں کو ایسی کوئی لڑکی پڑھے گی جو کسی بھی دوسرے نام کے مگر کردار کے فیصل جیسے آدمی کے جھانسے میں پھنسنے والی ہوگی تو ممکن ہے اس کے ہاتھ عین اس وقت یہ کہانی لگ جائے اور وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے' تمہیں نہیں معلوم کہ اس کا اجر خود بلقیس کو بھی ملے گا۔ وہ بھی اللہ کی نظروں میں پہلے سے مختلف کہلا سکے گی...'

'یہی تو میں سوچ رہی ہوں اتنی دیر سے کہ میری کہانی سے کسی کو کیا ملے گا یہ بلقیس باجی کی کہانی تو واقعی ایسی ہے کہ اسے پڑھ کر کوئی بھی خود کو بھٹکنے سے روک سکتا ہے مگر میری کہانی میں ایسا کیا ہے؟' وہ عجیب سی بے چینی سے بول رہی تھی... سائرس نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور سوچا کہ اگر اس وقت اس عورت کو یہ اطمینان نہ ملا کہ اس کی کہانی سے بھی کسی کو سبق ملے گا اور وہ کیا سبق ہوگا... یہ جب تک جان نہیں لیتی' تب تک اس کی روح میں ایسی بے چینی ہلکورے کھاتی رہے گی جو اسے شاید کسی پل چین نہ لینے دے گی انسان کا یہ بھی بڑا دکھ ہے کہ اس کی زندگی کہیں بے مقصد تو نہیں گزر گئی...

'تیری کہانی میں بھی ایسا بہت کچھ سب سے اہم تو یہی ہے کہ اس رات جو تو اس لڑکے کے کہنے میں آ کر وہاں نہ پہنچتی جہاں تیری عزت کی دھجیاں اڑائی گئیں تو آج تیری زندگی مختلف ہو سکتی تھی عورت کی آبرو بڑی قیمتی شے ہے' اس کا ہر دم خیال نہ رکھو تو اسے کسی کی بھی بری نظر میلا کر سکتی ہے۔ اگر وہاں نہ جاتی تو تیرے بھائیوں کا کچھ بھی بگڑنا نہیں تھا وہ واپس آ جاتے مگر تیرا ڈر تیری عجلت تیری بربادی کا باعث بنا... یوں ایک اجنبی بندے کے ساتھ رات کے اندھیرے میں کسی ایسی جگہ چلے جانا جس سے تو واقف بھی نہیں تھی تیری بہت بڑی غلطی تھی، پھر بھی اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ تیرا باپ نہیں تھا اور اب تیری جیسی لڑکی فیصل جیسے درندوں کے رحم و کرم پر تھی اس رات نہیں تو کسی اور دن وہ تجھے نگل ہی جاتے' تب بھی یہ ایک بات کیوں بھولتی ہے اپنے اوپر جو گزرتی ہے' اس کے بیان کرنے سے بھی من ہلکا ہو جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کیوں بھولتی ہے کہ اسی کہانی کے بیان کرنے سے ہوا کہ تجھے بلقیس ملی اور تم دونوں ایک ہی علاقے کی ایک ہی آدمی کی ڈسی ہوئی عورتیں صرف اسی ایک وجہ سے آپس میں ایک دوسرے کے گلے لگ کے اپنا غم کہہ پائیں کہ یہ میں تھا کہانی کار جس نے تم دونوں کو آپس میں ملایا...'

ماہ لقاء ایک دم ہی بلقیس کا ہاتھ تھام کے بولی یہ تم نے بڑی سولہ آنے بات کہی کہ میں بلقیس باجی سے اسی کہانی اور تمہاری وجہ سے ملی اور ایک مدت بعد اپنا کوئی ملا تو دل بہت ہی خوش ہوا... میں تیرا یہ احسان کبھی نہ بھولوں گی... کبھی نہیں...'



'اچھا یہ بتاؤ کیا مجھے تم دونوں کسی ایسی عورت سے ملا سکتی ہو جو خاندانی طوائف ہو اور اس وقت بھی دھندہ کرتی ہو؟

ماہ لقاء نے بلقیس کی طرف دیکھا جیسے وہ اس بات کی منتظر ہو کہ بلقیس اس بات کا کیا جواب دیتی ہے... 'ایسی تو بہت ہیں پر تم سے کوئی بات کرنے پر راضی ہوگی کہ نہیں یہ کہنا مشکل ہے، جو تم اس روز فیصل کا نام نہ لیتے تو شاید میں بھی راضی نہ ہوتی... تم سے بات کرنے پر... پر شاید میری دوسری بات ہے اسے اگر کوئی اعتراض ہوا تو اسکی وجہ صرف یہ ہوگی کہ وہ بھی ماہ لقاء کی طرح یہ سوچے گی کہ اسے اس کام کے پیسے کتنے ملیں گے یہاں ہر چیز کو پیسے کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے...'

'تم ملا تو دو... باقی کا کام مجھ پہ چھوڑ دو میں اسے منا لوں گا... نہ مانی تو خیر ہے اس کے بغیر بھی میری کہانی پوری ہو ہی جائے گی'

'ایک شرط ہوگی میری... بولو پوری کرو گے؟

سائرس اس اچانک بدلے ہوئے لہجے پر ایک دم ہی چونک اٹھا...

'شرط کیسی شرط... میں تمہارے کسی کام آیا تو اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے بولو بنا شرط کے بھی کام کر دوں گا'

'تجھ سے یہی امید تھی تو تو بڑا دل والا ہے میں جانتی تھی کہ تیرا یہی جواب ہوگا مگر میری شرط کافی ٹیڑھی ہے ممکن ہے تیرے لیے مشکل ہو، اس لیے ایک بار اور سوچ لے؟' بلقیس نے بڑی ادا سے اس طرح کہا کہ ماہ لقاء کی آنکھوں میں حیرت اور دلچسپی اتر آئی' وہ سوچنے لگی کہ آخر یہ بلقیس کیا کرنے والی ہے...

'تم کام بولو میرے بس میں ہوا تو نہ نہیں کروں گا'

'ماہ لقاء تو اپنے بہن بھاؤں اور ماں سے جب چاہے تب مل سکتی ہے مگر میں... میں ترس گئی ہوں اپنی ماں اور بہن کی شکل دیکھنے کو... اور یہ جاننے کو کہ میرے باپ کی جب سعودی عرب سے واپسی ہوئی اور اس نے مجھے نہ پایا تو اس پر کیا گزری' میری ماں کی اب کیا حالت ہے، بہن کیا کرتی ہے۔ اس مردود فیصل نے میری ماں اور بہن کو کسی بھی طرح تنگ تو نہیں کیا...' وہ رکی پھر بولی 'جوان کے بارے میں تم کوئی خبر لا دو تو جو تم کہو گے کرنے کو راضی ہوں، میں نہ ان سے مل سکتی ہوں، نہ انھیں یہ بتا سکتی ہوں کہ میں کہاں ہوں زندہ ہوں کہ مر گئی... اتنے بہت سے ماہ و سال گزرے' کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ ان کا پتا کروں سچ پوچھو تو ایسا کوئی نہیں ملا جس پہ اتنا اعتبار کیا جا سکتا ہو کہ وہ راز کو راز رہنے دے اور مجھے خبر بھی لا دے... تم پہ اعتبار کرنے کو دل چاہتا ہے... بولو کرو گے میرا یہ کام؟'

'یہ تو بڑا اچھا کام ہے اسے کرنے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے، بس یوں ہے کہ شہر سے دور جانے کے لیے...'

'سارا خرچا میں دوں گی بولو کتنا پیسا لگے گا؟'

ابھی سائرس کی بات منہ ہی میں تھی کہ وہ ایک دم سے بول اٹھی... سائرس نے مسکرا کے اس کی طرف دیکھا اور بولا 'نہیں میں خرچے کی بات نہیں کر رہا تھا... میں وقت کی بات کر رہا تھا ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے وقت کی ضرورت ہوتی ہے اور میں دیکھتا ہوں کب جانے کو مل سکتا ہے'

'وقت کی پرواہ مت کرو' مجھے جلدی ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ تم کو زور زبردستی ایسے بھیجوں کہ تمہارے کام کا حرج ہو... جب تم کو ٹھیک لگے' چلے جانا' بس مجھے بتا دینا تو میں تمہیں اپنے گھر کے بارے میں بتا دوں گی' بلقیس کی آنکھوں سے ایک

ایسا اطمینان اور خوشی جھانکنے لگی کہ اس احساس کو لفظوں میں بیان کرنا آسان نہیں تھا...

'کتنی خوش ہو رہی ہو باجی' آپ واقعی اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ کیا ہوتا ہے یہ کوئی ہم سے پوچھے...تم تو کسی مجبوری کے کارن نہیں ملیں کہ تم دوسرے شہر میں تھیں اور وہ دوسرے شہر میں مجھے دیکھو کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اس دن سے آج تک اپنوں کی شکل نہیں دیکھ سکی جب سے خانم کے گھر کی دہلیز الانگی ہے...'

'پر ایسا کیوں تم تو ان سے مل سکتی تھیں پھر تم نے ایسا کیوں کیا کہ اپنے اوپر خود ہی پہرے بٹھا لیے..؟' سائرس نے کہا

'یہ بات بلقیس باجی جان سکتی ہے پر تم شاید نہ جان سکو..میری ایک بہن بھی ہے اور بھائی...ان کے بارے میں کسی کو کان و کان بھی خبر ہوئی کہ ان کی ایک بہن بھی ہے جو پیشہ کرتی ہے تو جانتے ہو ان کی زندگی کا کیا بنے گا... یہ دنیا انھیں چین سے جینے نہیں دے گی، کبھی جب اپنی بہن کے بارے میں سوچتی ہوں تو دل سوکھے ہوئے پتے کی طرح لرزنے لگتا ہے کہ جانے اس کو کوئی فیصل جیسا بندہ ٹکرایا گیا تو کیا ہو... پتا نہیں ماں اس کا ٹھیک سے خیال بھی رکھ پاتی ہوگی یا نہیں...بس ایسی ہی سوچیں دن رات ڈستی رہتی ہیں اور میں کچھ نہیں کر پاتی اندیشے اور وسوسوں کا ایک پورا میلہ سا لگتا ہے اور میں ان میں گھری ہوئی جانے کتنی بار مر مر کے جی اٹھتی ہوں... پر کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیسے ان سے جا کے ملوں...' یکلخت ماہ لقاء چھلک پڑی اور بھل بھل کر کے رونے لگی ...ماحول پھر دکھوں کے گھیرے میں آ گیا سائرس کے ذہن میں ایک وسوال کلبلانے لگا کہ اگر ماہ لقاء آج تک اپنے بہن بھائیوں سے نہیں ملی تو اس کے پیسے کون لے کر جاتا ہے جو اس کے گھر والوں کو دیتا ہے...یہ پوچھنے کو سائرس ایک دم سے بے چین ہو گیا...جیسے ہی ماہ لقاء نے اپنے آنسو صاف کیے سائرس نے فوراً یہی سوال داغ دیا...

'وہ خورشید لے جاتا ہے جو مجھے اس بازار میں لایا تھا'

'اور تم نے آج تک پتا بھی نہیں کیا کہ وہ تمہارے گھر والوں کو پیسا دیتا بھی ہے کہ نہیں...؟' یہ سوال جیسے سائرس کے حلق میں آ کر رک سا گیا' سائرس کو لگا کہ اگر یہ اندیشہ اس غریب کے ذہن میں گھس کے بیٹھ گیا کہ اس کے گھر والوں کو پیسا ملا کہ نہیں تو اس کی راتوں کی نیند حرام ہو جائے گی اور اسے ایک پل چین نہیں ملے گا یہ سوال اس کی ایسی موت بن سکتا ہے جو اسے کھڑے کھڑے ہی زمیں بوس کر دے گا لہٰذا اس نے اپنی زبان کو روک لیا...

'جو میں ایسا کہوں کہ تم میرے گھر والوں کی کچھ اس طرح خبر لا دو کہ انھیں یہ معلوم نہ ہو کہ یہ میں نے تمہیں بھیجا ہے تو کیا کرو گے میرا کام...؟' ماہ لقاء کی بات سن کر سائرس کو عجیب سی جھرجھری آ گئی اور اسے ایسا لگا کہ کہیں وہ طوائفوں کے دکھ درد دور کرنے والا کوئی ایسا ڈاکیہ تو نہیں بن جائے گا جو ان کے گھروں اور ان کے اپنوں کی خبریں انھیں لا لا کر دیتا رہے... اسے یہ کام اس طرح کی سوچ کے بعد کافی مشکل معلوم ہونے لگا ایک لمحے کو اسے یہ خیال بھی آیا کہ اگر نصرت کو پتا چلا کہ میں کون سے کاموں پر لگ گیا ہوں تو وہ میرا کیسا مذاق اڑائے گا...

'کیا سوچنے لگے لکھاری' یہی نا کہ ان طوائفوں کی کہانی تو بڑی مہنگی پڑی' انھوں نے مجھے اپنا خبری بنا لیا۔'

سائرس کو لگا کہ جیسے ماہ لقاء نے اس کے اندر اٹھتی ہوئی سوچوں کو پڑھ لیا ہے کبھی کبھی ایک معمولی انسان بھی اس طرح گیانی بن جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اب وہ ماہ لقاء کو کیا جواب دے کیونکہ سوچ تو وہی رہا تھا جو اس وقت وہ کہہ رہی تھی...

'یہ بتاؤ اتنے دن سے تمہاری نصرت سے دوستی ہے۔ تم نے اس سے کیوں نہیں کہا کہ وہ تمہارے گھر والوں کی خیر خبر لا دے تمہیں؟' سائرس نے براہ راست سوال کا جواب دینے کے بجائے اسے دوسرے انداز سے الجھانا چاہا...

'اس کا مطلب ہے' تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے؟'

'میری بات کا یہ تو جواب نہیں ہوا!'

'پہلے تم بتاؤ تمہیں انکار ہے نا؟' ماہ لقاء جیسے اس کے پیچھے ہی تو پڑ گئی..'نہیں مجھے انکار نہیں ہے میں تمہارا ابھی یہ کام کر دوں گا مگر تمہیں میرے سوال کا جواب بھی دینا ہوگا' سائرس کو اس کے علاوہ کوئی اور جواب نہیں سوجھا۔

'میں ہی کیا' نصرت پر تو کوئی بھی طوائف اتنا بھروسا بھی نہیں کر سکتی کہ دکان سے پان لانے کو اسے دس روپے بھی دینے کو تیار ہو اور تم کہتے ہو میں اس پر اتنا بڑا اعتماد کر لیتی، ارے وہ تو اکثر ہم لوگوں کی بات اِدھر اُدھر کر دیتا ہے، کتنی ہی بار تو اس نے ہماری لڑائیاں کرائی ہیں جب ہم اسے جان گئے کہ وہ ایسا ہی ہے تب ہماری آپس کی لڑائیاں ختم ہوئیں اب ہم سے کوئی بھی اس کی بات پر اعتبار ہی نہیں کرتی تو اس کے لیے لڑنا بھڑنا اور برا کیا ماننا...سب جانتے ہیں وہ پیٹ کا ہلکا ہے اور اس کی یہ بھی عادت ہے کہ بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے، تو تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اپنی زندگی کا سب سے اہم کام اس کے ذمے لگاتی...'

سائرس نے اس طرح سے بلقیس کی طرف دیکھا کہ وہ بھی کچھ نصرت کے بارے میں رائے زنی کرے تو بلقیس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ 'ہر بلڈنگ کے الگ الگ نمونے ہیں نصرت ان کی بلڈنگ کا ہے ہماری طرف تو وہ کم ہی آیا ہوگا مجھے تو یہ بھی یاد نہیں پڑتا کہ وہ کب کب آیا کرتا ہے البتہ دلشاد آپا سے اس کی نوک جھونک دیکھ کر میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اسے کافی پہلے سے جانتی ہیں'

'اچھا اب میں چلوں' بہت رات ہو گئی۔' سائرس نے کہا تو ماہ لقاء اور بلقیس نے اسے اپنے پاس روکنا چاہا مگر سائرس نے انکار کر دیا اسے بھلے ہی کوئی خاص کام نہ تھا مگر وہ یوں ان دکھیاری طوائفوں سے اپنے تعلقات کو بڑھاوا دینا نہیں چاہتا تھا...سو وہ نکلنے لگا تو بلقیس نے اسے دس منٹ اور رُکنے کو کہا اور دس منٹ بعد وہ واپس آئی تو صرف یہ کہا کہ بس ذرا واش روم تک گئی تھی...یہ بات سائرس کی سمجھ میں اس وقت آئی جب زرینہ نے اسے ایک چھوٹا سا لفافہ دیا جسے بلقیس کے گھر سے نکلتے ہی سائرس نے بے چینی سے کھولا' اس میں بہت جلدی میں یہ لکھا ہوا تھا۔

"اگر تم کسی طرح مجھے ایک بار فیصل تک پہنچانے میں میری مدد کرو تو میں اپنی ساری زندگی کی کمائی تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں، یہ بات ماہ لقاء سے بھی چھپانے والی ہے اس لیے کاغذ میں لکھ کے دے رہی ہوں...'

تحریر پڑھ کر اور یہ جان کر کہ بلقیس کے ارادے کیا ہیں' سائرس کو کھڑے کھڑے اپنے پیروں میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی اسے صاف لگا کہ وہ باقاعدہ کانپ رہا تھا!!!

جیتے جاگتے کرداروں سے جڑی
اس چشم کشا کہانی کا آخری حصہ
آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے۔


محمد اسلم آزاد

# پچھتاوے مقدر ٹھہرے

گل حمید کا خیال

آنکھ میں چبھنے لگی ہے اب یہ بینائی مجھے
زندگی! کس موڑ پر آخر تو لے آئی مجھے

**محبت میں سب کچھ تیاگ دینے والی ایک حرماں نصیب کا قصہ' عبرت' وادی بولان سے**





بولان کے خشک و بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں ندی بولان کے کنارے ایک قافلہ رواں دواں تھا۔ سب سے آگے دو بڑے بڑے کتے تھے جن کے پیچھے بھیڑ، بکریوں کا ریوڑ تھا اور پھر اونٹ اور خچر تھے جن میں سے کچھ پر گھریلو سامان اور جھگیاں لدی ہوئی تھیں اور کچھ اونٹوں پر بوڑھے اور چھوٹے چھوٹے بچے جھولتے جا رہے تھے جبکہ قافلے میں شامل جوان مرد، عورتیں پیدل چل رہے تھے۔ دائیں جانب بل کھاتی ہوئی سڑک تھی جس پر چھوٹی بڑی گاڑیاں رواں دواں تھیں جن میں سوار مسافران قافلے والوں کو تجسس اور حیرت سے تک رہے تھے کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو سیکڑوں میلوں کا تھکا دینے والا دشوار سفر پیدل کرتے ہیں؟ ان سخت جان لوگوں کو تپتی دھوپ کی پرواہ تھی نہ اپنے پیروں میں پڑے اُن چھالوں کی جن سے مسلسل خون رس رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا بھوک سے برا حال تھا اور بھوک سے بلکنے سے اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر انہیں یہ تمام مشقتیں اٹھانا تھیں جب تک اُن کے مویشی فروخت نہیں ہو جاتے کہ جنہیں پال پوس کر اور انہیں بیچ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانا اُن کا مقصد تھا اور اس مقصد کے لیے وہ ہر سال نومبر میں ساراوان سے جھالاوان کچھی کا سفر کرتے اور مارچ میں کچھی سے ساراوان، قلات، سوراب کا سفر کرتے۔ یہ سفر کرتے کرتے اُن کے آباؤ اجداد کی عمریں گزر گئیں مگر وہ اس سفر سے کبھی نہ تھکتے تھے بلکہ اپنے وارثوں کے لیے بھیڑ، بکریوں کے اس ریوڑ کے ساتھ یہ سفر بھی ترکے میں چھوڑ گئے تھے۔

خانہ بدوشوں کے اس قافلے میں بوڑھا گل خان بھی تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی کمال خان، جمال خان، تین بیٹے جو ریوڑ سے آگے اور ایک بیٹا اپنی ماں اور دو بہنوں کے ساتھ پیدل چل رہا تھا اور بوڑھا گل خان اونٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک بھائی کمال اس اونٹ کی رسی کو پکڑے آگے رواں تھا اور اس کے ساتھ جمال خان بھی قدم سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ اب شام ڈھلنے کو تھی اور وہ مچھ کے بعد رندلی، ڈھاڈر کی حد میں پہنچ چکے تھے۔ پنجرہ پل سے آگے ایک چھوٹی سی سرنگ تھی جسے عبور کر کے وہ دربی پہنچ چکے تھے۔ اب جانوروں پر سے سامان اتار کر پتھروں پر چٹائی بچھا کر دو روز پہلے پکی ہوئی روٹی اور سالن نکالا گیا۔ اسے ذرا گرم کر کے پیٹ کی آگ بجھائی گئی اور پھر بستروں پر ڈھ سے گئے۔ جلد ہی انہیں نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اگلی صبح پھر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ دوپہر تک یہ قافلہ ندی ناڑی کا پل کراس کر کے سبی سے ہوتا ہوا شام کو کچھی کے ایک ایسے علاقے میں پہنچا جہاں آس پاس کے کھیتوں میں جوار کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ مال مویشیوں کو ایک کھلے میدان میں چھوڑ دیا گیا اور نیشنل ہائی وے روڈ کے قریب ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن دیکھ کر قافلے والوں نے وہیں پر پڑاؤ ڈال دیا کیونکہ کچھی کے اکثر علاقوں میں میلوں تک پانی کا نام و نشان نہیں ہوتا اور ریلوے اسٹیشن پر ہر دوسرے، تیسرے دن ٹرین کے ذریعے پانی لایا جاتا اور ایک بڑی زیر زمین ٹینکی کو اس سے بھر دیا جاتا ہے۔ آس پاس کے دیہات والے وہاں سے پانی بھرتے ہیں جبکہ خانہ بدوش عورتیں بھی یہ پانی بھرتی ہیں۔ صبح سویرے ہی وہ عورتیں گدھوں پر مشکیں لاد کر ریلوے اسٹیشن پر پانی بھرنے جاتیں اور شام کو بھی پانی بھرنے کے بعد پھر کھانے کا بندوبست کرتیں، یوں وہ ہر روز صبح کو پانی بھرنے جاتیں تو اُس وقت اسٹیشن سنسان پڑا ہوتا تھا جبکہ شام کے وقت ایک ٹرین آ کر وہاں چند منٹ رکتی تو

وہاں رونق سی ہو جاتی۔

گل نازاور اُس کی بیٹیاں ناز بخت اور تاج بخت جب پانی بھرنے جاتیں تو اسٹیشن پر کھڑی اتنی لمبی ٹرین اور اس میں سوار مسافروں کو بڑی حیرت اور تجسس سے دیکھتیں۔ایک روز جب ٹرین اسٹیشن پر رکی تو ٹرین میں سے دیگر مسافروں کے ساتھ ایک نوجوان بھی اترا جو کافی خوبصورت تھا۔کالی پینٹ شرٹ میں ملبوس نوجوان کے ایک ہاتھ میں کچھ کاپیاں تھیں۔ناز بخت کی نظر اُس پر پڑی تو وہ اُسے دیکھتی رہ گئی۔وہ نوجوان بھی محبت پاش نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ناز بخت کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔اس نے گھبرا کر اپنی نظریں ہٹا لیں مگر دلِ بے قرار کا اصرار تھا کہ اُس خوبرو نوجوان کو دوبارہ دیکھا جائے۔دل کی خواہش پر اُس کی نظر دوبارہ اٹھی تو وہ بھی منتظرِ دید وہیں کھڑا تھا۔چند لمحوں کے بعد ٹرین نے ہارن دیا تو اس نے اپنی جیب سے سیٹی نکال کر بجائی اور ٹرین آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔مسافر دوڑ کر اُس میں سوار ہونے لگے۔ وہ ایک ڈبے کے دروازے پر کھڑا ہو کر پیچھے کی جانب مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ ناز بخت کی آنکھیں بھی اُس کا تعاقب اُس وقت تک کرتی رہیں جب تک ٹرین نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

''نازو، یہ تم اتنی دیر تک ٹرین کو کیا دیکھ رہی ہو؟'' بہن تاج بخت کی آواز پر وہ چونکی اور اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تاجو، مجھے ٹرین بہت اچھی لگتی ہے، میرا جی چاہتا ہے، میں بھی اس میں سوار ہو کر سفر کر کے مزے لوں۔''

یہ سن کر اس کی بوڑھی ماں مشکیں گدھے پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''بیٹی......! ہمارے بال سفید ہو گئے اور اس عمر تک پہنچ گئے مگر ہم نے ریل گاڑی میں کبھی قدم نہیں رکھا تو تم اِس میں کیسے سفر کر سکتی ہو؟ ہم خانہ بدوشوں کے لیے تو یہ گدھے ہی ریل ہیں جن پر ہم سفر کرتے ہیں۔'' اس بات پر تینوں ماں بیٹیاں ہنسنے لگیں اور پھر اپنے کاموں میں لگ گئیں مگر نہ جانے کیوں نازو کا دل اداس تھا، کسی کام میں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔رات میں جب وہ بستر پر لیٹی تو اُس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے جانے کب نیند کی دیوی نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح جب وہ اٹھی تو اس کی ماں اور بہن بھیڑ، بکریوں سے دودھ نکال رہی تھیں۔اس نے ہاتھ منہ دھو کر کھانا پکایا اور ناشتہ کر کے اسٹیشن پر پانی بھرنے کے لیے چل پڑی۔اسٹیشن پر دور سے آتی ٹرین دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ٹرین کے رکتے ہی مسافر اترنے لگے مگر اس کی نظریں اسی خوبرو نوجوان کو تلاش کر رہی تھیں جو دور سے ہی پلیٹ فارم پر نظر آ رہا تھا۔اس کی نظریں نازو پر پڑ گئی تھیں۔وہ چلتے ہوئے قریب آیا اور تھوڑے فاصلے پر رک گیا۔ایک ڈبے سے ٹیک لگا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس وقت نازو کی ماں اور بہن پانی بھرنے میں مصروف تھے اور وہ خود بھی ڈول سے مشک بھر رہی تھی مگر اس کی نظریں خوبرو پر تھیں۔اسی اثناء میں مشک بھر چکی تھی مگر وہ بے دھیانی میں پانی بھرتی جا رہی تھی اور پانی نیچے بہتا جا رہا تھا۔یہ دیکھ کر ماں چلائی۔

''ناز......! تم اندھی ہو گئی ہو کیا؟ بھری ہوئی مشک میں پانی انڈیلتی جا رہی ہو؟''

وہ گھبرا کر چونکی۔ اُسی وقت ٹرین نے ہارن بجایا، گارڈ نے وسل دی اور گاڑی رینگنے لگی۔نازو نے دیکھا، وہ خوبرو نوجوان اسے ہاتھ ہلاتا ہوا دور جا رہا تھا۔

اُسی رات اُس کی بہن تاج بخت اُسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو نازو......! میں کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تو اُس ٹرین والے بابو کو دیکھتی ہے۔ جونہی ٹرین اسٹیشن پر آتی ہے، تیرا چہرہ کھِل جاتا ہے اور تم دونوں ایک دوسرے کو گھور گھور کر دیکھتے ہو۔ دیکھ بہن......! ان پردیسی اور شہری بابوؤں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا، کیسے ہوتے ہیں؟ اس لیے تو اپنے قدم روک لے ورنہ نقصان اٹھائے گی۔''

''تاجو، مجھے اُس بابو سے محبت ہو گئی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اُس کی ہو جاؤں، اُس کے گھر میں رہوں جہاں در ہو، دیوار ہو، ایک ایسی چھت ہو جہاں نہ تیز آندھی، لو آئے اور نہ بارش کی بوندیں آئیں، نہ میلوں کا پیدل سفر کرنا پڑے نہ پیروں میں چھالے ہوں۔ جب کہیں آنا جانا ہو تو ٹرین پر سفر کریں۔ تم ہی کہو کہ ہم خانہ بدوشوں کی بھی کیا زندگی ہے؟''

تاجو نے گھبرا کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بس، بس، نازو......! آگے کچھ نہ بولنا، میں سب سمجھ گئی ہوں، تم اُس بابو کی محبت میں پاگل ہو گئی ہو اسی لیے نادانوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ صبح ہونے دو، میں اماں کو سب کچھ بتا دیتی ہوں پھر دیکھنا، تمہارا دماغ کیسے ٹھیک ہوتا ہے۔''

بہن کی بات پر نازو رونے لگی اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو بہن......! تم ہی میری اکیلی بہن اور دوست ہو جس سے میں کوئی بات نہیں چھپاتی۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، یہ بات تم کسی کو نہ بتانا ورنہ بھائی والے میری ہڈی پسلی توڑ دیں گے۔''

''میری پیاری بہن......! ایسی غلطی مت کر ورنہ تو پچھتائے گی۔'' تاجو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تاجو، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گی، بس ہم ایک دوسرے کو دور سے دیکھتے ہیں۔''

بہن کی بات پر تاجو سر ہلاتی ہوئی خاموش ہو گئی۔

اگلے روز دونوں بہنیں صبح کو پانی بھرنے گئیں تو وہ خوبرو بابو اسٹیشن پر بیٹھا ہوا تھا۔یہ دیکھ کر دونوں حیران رہ گئیں۔اُس وقت اسٹیشن پر رش نہیں تھا۔وہ پانی کی ٹنکی کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔تاجو خاموشی سے پانی بھرنے لگی جبکہ نازو اور وہ بابو ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ایک خاموشی سی چھائی ہوئی تھی پھر وہ اٹھ کر اس کے ذرا قریب آیا۔

''میرا نام ساحل ہے اور میں سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں۔'' وہ نازو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟'' نازو اُس کی بات پر سٹپٹا گئی۔

وہ بہن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام ناز بخت ہے اور یہ میری بہن تاج بخت!''

''میں یہاں دو دن کی چھٹی لے کر تم سے ملنے آیا ہوں۔کیا تم مجھ سے کچھ دیر کے لیے اکیلے میں مل سکتی ہو؟''

نازو اپنی بہن تاجو کی طرف دیکھنے لگی اور تھوڑا سوچنے کے بعد بولی۔ ''میں آج کچھ نہیں کہہ سکتی، کل بتاؤں گی۔'' پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا پلیٹ فارم کی طرف چلا گیا۔

''نازو، تم حد سے آگے بڑھتی جا رہی ہو اس لیے مجھے اماں کو سب کچھ بتانا پڑے گا۔'' واپسی پر تاجو نے اس سے کہا۔

''تاجو بہن، آج رات کو اس بارے میں بات کروں گی، ابھی آپ اماں سے کچھ نہ بولیں۔'' نازو نے بہن کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔اُس وقت تو تاجو خاموش ہو گئی مگر رات کو اُس نے نازو

سے پوچھا۔

''نازو! تم نے جو اُس بابو سے کہا تھا کہ میں کل جواب دوں گی تو تم اُس کو کیا جواب دو گی؟''

''میں آپ کے ساتھ اُس سے ملنے جاؤں گی۔''

''نازو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا واقعی تم نے اُس سے ملنے کا ارادہ کرلیا ہے؟'' تاجو حیرانی سے بولی۔

''ہاں! کل رات کو ہم ریل کے پل کے نیچے ملاقات کریں گے' بس آپ میرے ساتھ ضرور چلنا۔'' یہ کہتے ہوئے نازو نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ تاجو کا دل نرم ہوگیا اور وہ خاموش ہوگئی۔

چہار سو رات کا سناٹا تھا' چاند کی آخری راتیں تھیں' آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ کبھی کبھی سناٹے میں کتے کے بھونکنے کی آواز خاموشی میں ارتعاش پیدا کررہی تھی۔ نازو اور تاجو چادر میں خود کو لپیٹے آہستہ آہستہ ریل کے پل کی طرف جارہی تھیں جہاں ساحل اُن کا منتظر تھا۔ اُس نے دور سے دونوں بہنوں کو دیکھا اور چند قدم بڑھ کر اُن کے قریب آیا پھر وہ تینوں پل کے نیچے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک کچھ خاموشی چھائی رہی پھر ساحل اور نازو ایک دوسرے سے اپنی محبت کا اظہار کرنے لگے' ساتھ جینے مرنے کے وعدے ہونے لگے۔ تاجو خاموش بیٹھی اُن کی باتیں سن رہی تھی' وہ بھی اپنی بہن کی خوشی کے لیے ساحل سے کہنے لگی کہ اس سے کبھی بے وفائی نہ کرنا اور اس محبت کے سفر میں اسے تنہا نہ چھوڑنا۔ ساحل نے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ جب دونوں بہنیں ساحل کی باتوں سے مطمئن ہوگئیں تو اُس وقت رات کافی ڈھل چکی تھی اور وہ دونوں واپس آکر خاموشی سے اپنے بستر میں سوگئیں۔

صبح کو جب اُن کی آنکھ کھلی تو بابا کہہ رہا تھا۔

''گھاس ختم ہوگیا ہے اور گرمیاں آرہی ہیں۔ دو تین دن بعد سارا اوان جائیں گے جہاں نازو اور تاجو کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔'' یہ سن کر تاجو تو دل ہی دل میں خوش ہوئی مگر نازو اداس ہوگئی۔

رات کو جب دونوں بہنیں بستر پر لیٹیں تو نازو اپنی بہن تاجو سے گلے مل کر روتے ہوئے بولی۔

''بہن' آج کی رات میں آپ کے ساتھ ہوں پھر نہ جانے زندگی میں ہم ملیں یا نہ ملیں اس لیے مجھے جی بھر کے گلے لگالو۔''

''کیا مطلب نازو؟'' تاجو نے اسے حیرت سے دیکھا۔ کیا تم ساحل کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہو؟''

''ہاں......'' نازو نے کہا۔

''دیکھو! ایسا قدم مت اٹھاؤ۔'' تاجو نے اسے سمجھایا۔

''میں اُس کے بنا نہیں رہ سکتی' بس دُعا کرو کہ ہم دونوں سدا خوش رہیں۔'' نازو سسکتے ہوئے بولی۔

شام ہوچکی تھی' بھیڑ بکریوں کا ریوڑ اور دوسرے مال مویشی بھی آگئے تھے۔ سارا سامان بندھا ہوا تھا۔ جھگیاں لادی جارہی تھیں اور اب منزل کی جانب روانہ ہونا تھا۔ نازو اور تاجو اسٹیشن پر پانی بھرنے گئی تھیں۔ اس دوران ٹرین اسٹیشن پر آئی اور نازو ساحل کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر چلی گئی۔ جب ٹرین نظروں سے اوجھل ہوگئی تو تاجو روتی' دھاڑیں مارتی ہوئی ماں باپ کے پاس پہنچی۔

''اماں' نازو پتہ نہیں کہاں کھو گئی؟ وہ میرے ساتھ پانی بھر کر اسٹیشن سے میرے ساتھ باہر آئی جب ہم نے سڑک پار کی تو دیکھا کہ نازو میرے پیچھے نہیں تھی جبکہ وہ سڑک تک میرے ساتھ آئی



تھی۔'' تاجو کی بات سن کر گھر والوں کے ہوش اڑ گئے' وہ بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچے اور نازو کو تلاش کرنے لگے مگر یہ بات تاجو ہی جانتی تھی کہ نازو تو اب تک کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہوگی۔ جوں جوں رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی' ماں باپ کے اندیشوں میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ جب نازو کا کوئی سراغ نہ ملا تو وہ بالآخر تھک ہار کر واپس آگئے جبکہ دوسری طرف نازو اپنے محبوب کے ساتھ ٹرین میں سفر کررہی تھی اور راستے کے حسین مناظر میں کھوئی ہوئی تھی۔ رات کے گیارہ بجے ٹرین کوئٹہ اسٹیشن پر پہنچی تو اُس وقت بھی اسٹیشن پر کافی رش تھا۔ وہ دونوں اُسی اسٹیشن پر اتر گئے۔ ساحل اُسے ایک رکشے میں بٹھا کر بڑے سے ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل کے بڑے سے کمرے کو دیکھ کر نازو حیران رہ گئی۔ وہ کبھی اشتیاق سے نرم و ملائم صوفے پر بیٹھتی تو کبھی کھڑکی سے باہر جھانکتی جہاں اُس وقت بھی بازار میں بڑی رونق لگی ہوئی تھی پھر جب ساحل نے ٹی وی آن کیا تو نازو کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اس چھوٹے سے ڈبے میں چلتی پھرتی تصویروں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''ساحل' اس شہری زندگی میں اور ہم خانہ بدوشوں کی زندگی میں کتنا فرق ہے۔'' اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

''نازو' یہ رونق تو کچھ بھی نہیں ہے' جب تم میرے ساتھ سیالکوٹ دیکھو گی تو تمہیں زندگی کا مزہ آجائے گا۔'' وہ رات گئے تک محبت بھری باتیں کرتے رہے۔

صبح ناشتہ کر کے وہ ریلوے اسٹیشن پر آئے جہاں ٹرین تیار تھی۔ جب ٹرین روانہ ہوئی تو نازو کو بار بار یہ احساس ستا رہا تھا کہ میرے اس طرح بھاگ جانے سے میرے گھر والوں کو بہت دکھ ہوا ہوگا اور وہ مجھے اب بھی تلاش کررہے ہوں گے۔ اگر میں اُن کے ہاتھ لگ گئی تو وہ کلہاڑیوں سے مجھے قتل کردیں گے۔ موت کے خوف سے اُس کے پسینے چھوٹ جاتے اور جب تاجو یاد آتی تو وہ اپنے آپ سے کہتی۔ 'نہیں' تاجو نے انہیں یہ تو نہیں کہا ہوگا کہ میں ٹرین میں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہوں ورنہ اگلے اسٹیشن پر میں پکڑی جاتی۔ شاید سب لوگ آج سارا اوان کے لیے روانہ بھی ہوئے ہوں گے مگر سارا اوان پہنچ کر وہ اپنی برادری والوں کو کیا کہیں گے کہ اُن کی بیٹی بھاگ گئی ہے یا گم ہوگئی ہے؟

وہ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ 'دیکھو نازو' تم نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا ہے' تم بھی کبھی سکھی نہیں رہ سکتی ہو۔' مگر پھر ساحل کو دیکھ کر مستقبل کے سپنے بُننے لگی۔ ٹرین جب بلوچستان سے سندھ کی سرحد میں داخل ہوئی تو نازو مطمئن ہوگئی کہ اب اُس کے گھر والے اُس تک نہیں پہنچ سکتے۔

رات دس بجے ٹرین نے سکھر اسٹیشن عبور کیا تو ساحل اُس سے بولا۔ ''نازو' تم آرام سے بیٹھو' میں اگلے ڈبوں سے مسافروں کی ٹکٹیں چیک کر کے آتا ہوں۔'' نازو کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے لگی اور ساحل ٹکٹیں چیک کرنے آگے بڑھ گیا۔ ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک زبردست دھماکے کی آواز گونجی اور ساتھ ہی ایک جھٹکے سے ٹرین رک گئی اور ڈبوں کی لائٹ بھی چلی گئی۔ اس اچانک افتاد پر مسافر چیخ و پکار کرنے لگے۔ دراصل ٹرین کے اگلے ڈبے پٹری سے اتر کر گرے ہوئے تھے اور اس میں پھنسے سوار مسافر چلا رہے تھے۔ اُن میں کچھ زخمی تھے تو کچھ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ایک قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا۔ اُس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور یہ حادثہ ایسی جگہ پیش آیا تھا جہاں

دور دور تک جنگل بیاباں تھا لہٰذا مسافروں کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ نازو روتی چیختی ہوئی اپنے ساحل کو تلاش کر رہی تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد امدادی ٹیمیں آئیں اور صبح تک انہوں نے مسافروں کو بوگیوں میں سے نکالا۔ اُن میں ایسی نعشیں بھی تھیں جن کی شناخت بھی ممکن نہیں رہی تھی اور جو زخمی تھے انہیں ایمبولینس میں ہسپتال لے جایا گیا۔ نازو کھڑی نعشوں کو غور سے دیکھ رہی تھی کہ اُس کی نظر ایک لاش پر ٹک گئی۔ ہاں وہ نعش ساحل کی تھی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور چیخنے چلانے لگی کہ اُس کی محبت کا مسافر اُسے راستے میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ اب وہ نہ پیچھے جا سکتی تھی اور نہ آگے۔ اس کے آگے ایک انجانی منزل تھی اور پیچھے موت...... نازو کو اپنی موت کا خوف نہیں تھا مگر اس ذلت آمیز موت سے ڈرتی تھی کہ اس کی برادری میں یہ بات عام ہو جائے گی کہ نازو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور اتنے دنوں تک اپنا منہ کالا کر کے اب واپس چلی آئی۔ یہی بات اسے ایک انجان منزل کی طرف لے جا رہی تھی اور وہ ایک بار پھر ٹرین میں بیٹھ کر رات آٹھ بجے ایک اسٹیشن پر پہنچی تو ہر کوئی اپنی منزل کو روانہ ہو گیا مگر وہ اسٹیشن پر کھڑی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ کچھ لوگ اُسے گھور رہے تھے۔

اچانک اُس کی نظر ایک لنگڑے فقیر پر پڑی۔

''اے بابا' کچھ اللہ کے نام پر دیتے جاؤ۔ اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ تم خیر سے منزل پر پہنچو گے۔'' نازو نے سوچا کہ اس نیک بندے سے مدد لینی چاہیے۔ جب وہ فقیر چلتے چلتے اُس کے قریب آیا تو وہ اُس کے پیروں پر گر پڑی۔

''بابا! میں ایک بدنصیب ہوں' میرا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔ تم مجھے سہارا دے دو۔'' فقیر اُسے دلاسہ دینے لگا اور اسٹیشن سے باہر آ کر ایک رکشے میں سوار ہو کر ایک بنگلے کے گیٹ پر لے آیا اور اس کی گھنٹی بجانے لگا۔

''بابا' کیا یہ تمہارا گھر ہے؟'' نازو نے حیرت سے پوچھا۔ ابھی وہ جواب دیتا کہ اندر سے ایک شخص نے گیٹ کھولا اور یہ دونوں اس میں داخل ہو گئے۔ نازو حیرانگی سے اُس بنگلے کو دیکھتے ہوئے اُس کے ساتھ چلتے ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس بڑے کمرے میں ایک شخص بڑے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ اس کے اردگرد لنگڑے' نابینا اور معذور افراد بیٹھے ہوئے تھے اور وہ پیسے گن رہا تھا۔ اس طرح اچانک لنگڑے فقیر کے ساتھ رات کے وقت ایک لڑکی کو دیکھ کر وہ حیرانی سے صوفے سے کھڑا ہو گیا اور باقی لوگوں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ نازو سمجھ گئی کہ یہ کوئی سردار ہے جو غریبوں' مسکینوں کی مدد کرتا ہے اور ان فقیروں کو بھی پیسے دے رہا تھا اور یہ بابا بھی میری مدد کرنے کے لیے مجھے یہاں لے آیا ہے۔

جب سب چلے گئے تو وہ لنگڑا فقیر دروازے کو بند کرتے ہوئے بولا۔

''سائیں' میں آپ کے لیے آج بھتہ نہیں' ہیرا لایا ہوں۔ یہ دیکھو' کتنی حسین اور جوان ہے۔ آپ نے پہلے کبھی ایسا ہیرا نہیں دیکھا ہوگا' بس سائیں' آپ کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ اب ہم پہ بھی کرم کرو کہ اسٹیشن کے ساتھ ویگن اڈے پر بھی بھیک مانگوں' شاید اس جیسا کوئی اور ہیرا پھر مل جائے۔''

''واقعی فقیرا' تو ہیرا لایا ہے۔'' وہ سردار مونچھوں کو تاؤ دیتا نازو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آج کے بعد تو اسٹیشن اور ویگن اڈہ کیا' سارے شہر میں بھیک مانگ سکتا ہے اور اس ہیرے کے بدلے میں تو آزاد ہے' تجھ سے کوئی حساب کتاب نہیں لیا جائے گا۔ جتنا کماؤ' اس میں مجھے ایک پائی بھی نہ دو' بس جب کوئی ایسا ہیرا مل جائے تو یہاں لے آ۔ میں اپنے بندوں کو کہہ دوں گا کہ وہ تجھے تنگ نہ کریں۔''

وہ فقیر اسے دعائیں دیتے ہوئے جانے لگا تو نازو اس کے پیروں میں گر گئی۔

''بابا...... یہ تم کیا کر رہے ہو؟ میں نے تمہیں نیک اور اچھا سمجھا تھا اور تیرے ساتھ یہاں آئی تھی مگر تم میرا سودا کر کے جا رہے ہو؟'' نازو گڑگڑا رہی تھی اور فقیر چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص نوٹوں کی گٹھڑی اس کی جانب پھینکتے ہوئے بولا۔

''فقیرا...... یہ تمہارا انعام ہے' تم جاؤ۔''

فقیر خاموشی سے چلا گیا۔ نازو اس شخص کے قدموں میں گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔ وہ تیز آواز میں گرجا تو ایک خادم دوڑا دوڑا کمرے میں آیا۔

''اس لڑکی کو اوپری منزل کے کمرے میں لے جاؤ اور اس کی خوب خاطر تواضع کرو تا کہ اس کی اچھی قیمت مل سکے۔''

خادم نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ نازو کو اوپری منزل پر لے آیا اور کچھ دیر کے بعد اس کے لیے اچھے اچھے کھانا لایا مگر نازو اپنی نادانی پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ اس نے ایک شیطان پہ بھروسہ کیا جو اسے یہاں تک لے آیا۔ اسے کبھی اپنے آپ پہ غصہ آتا تو کبھی اس لنگڑے فقیر پہ کہ جو اسے اس جہنم میں چھوڑ گیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے کہ اسے خریدنے والے جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ اس ذلت کی زندگی سے موت اچھی ہے پھر رات کے نہ جانے کس پہر وہ کھڑکی تک آئی اور اپنی آنکھیں بند کر کے کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

## کاش کہ ایسا ہو

ہم تم ہوں ساتھ بیٹھے
گلے شکوے ہوں دور دور
ڈوبی ہوئی خلوص کے
اندر ہو پور پور
وعدہ خلافی یاد
نہ آئے کسی کو بھی
ناہ ہو تذکرہ
کسی کی بھی
بے وفائی کا
سود و زیاں سے
ہٹ کے مجھے
اک شام چاہیے
جس میں ہوں
دل کی باتیں
پیاری پرانی ساعتیں
جو خوشیوں سے بھرا ہو
ایسا جام چاہیے
اپنے ساتھ ہمیشہ
تیرا نام چاہیے

شگفتہ شفیق

فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ کوئی اللہ کا نیک بندہ نماز پڑھنے کے لیے مسجد جا رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر نازو پر پڑی جو بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے فوراً دوسرے لوگوں کی مدد سے اُسے ہسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹروں نے کہا کہ اس لڑکی نے اونچی عمارت سے چھلانگ لگائی ہے اور جس کی وجہ سے اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں اور ناکارہ ہوگئی ہیں۔ اگر وہ منہ کے بل گرتی تو شاید یہ نہیں بچتی لیکن اب یہ زندہ تو رہے گی مگر اپنے پیروں پر چل نہیں سکے گی۔ یہ سن کر وہ شخص یہ سمجھ کر اسے وہاں چھوڑ کر چلا گیا کہ یہ جس کسی کی بھی ہوگی، وہ اسے خود تلاش کر لیں گے۔

نازو کو ہوش آیا تو پہلا خیال اُس کے ذہن میں یہی آیا کہ وہی ظالم لوگ اُسے یہاں ہسپتال میں لائے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ پہنچ جائیں، مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ یہ سوچ کر نازو نے اٹھنا چاہا تو اس کے دونوں پیروں نے اس کا ساتھ نہ دیا، تب اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ چل نہیں سکتی۔ اسی وقت ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”لڑکی......! تمہارا نام کیا ہے؟ صبح سویرے کوئی تمہیں یہاں چھوڑ گیا تھا اور اب شام ہوگئی ہے مگر کوئی نہیں آیا۔ کیا تمہارے گھر والے تم سے اتنے بے زار ہیں کہ تمہاری دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں، تم ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی ہو مگر تمہیں دیکھنے نہیں آئے؟“ یہ سن کر نازو کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

”میرے گھر والے مجھ سے بے زار تو نہیں تھے میں اُن سے بے زار ہوگئی تھی کہ جس کی مجھے یہ سزا ملی ہے کہ میں موت سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی ہوں۔“ یہ سن کر پاس ہی بیڈ پر لیٹی مریضہ نے اسے دلاسہ دیا جس کے بعد تقریباً ایک ماہ تک وہ ہسپتال میں رہی۔

جس دن وہ ہسپتال سے فارغ ہوئی تو اس کی آنکھوں سے اشکوں کا ریلہ بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر چلتی اپنے جسم کو گھسیٹتے ہوئے باہر آئی تو سامنے ہی کچھ فاصلے پر اُسے کسی بزرگ کا مزار نظر آیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے رینگتے ہوئے اُس دربار تک پہنچی تو اُس کے نرم و نازک ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ وہ رو رو کر پروردگارِ عالم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہی۔ وہ سارا دن اسی طرح روتی گڑگڑاتی رہی۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا کہ شام ہوگئی۔ دربار کا متولی دربار بند کرنے اندر آیا تو وہ اردگرد سے بے نیاز اپنے گناہوں پر اشک بہا رہی تھی۔ متولی اُسے اپنے چھوٹے سے گھر میں لے آیا اور اس کی روداد سن کر کہا۔

”بیٹی......! تم گھبراؤ مت، اَب یہیں پر آرام سے رہو۔“ یہ سن کر نازو کی آنکھوں سے فرطِ مسرت سے آنسو چھلک پڑے کہ اِس ولی کی کرامت سے اُس کے رَب نے اُس کی دُعا قبول کر لی تھی اور اُسے انجان شہر میں حفظ و امان سے رہنے کے لیے ایک محفوظ ٹھکانہ عطا کر دیا تھا جہاں اُس کی عزت و آبرو محفوظ رہتی۔

آج 25 برس بیت گئے، نازو اپنی زندگی کی گاڑی کو اپنے دو ہاتھوں پر رینگتے ہوئے گھسیٹ رہی ہے۔ ان پچیس برسوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کو یاد کر کے روئی نہ ہو مگر اَب اُس کے آنسو اس غلطی کا مداوا نہیں کر سکتے جو اُس نے پچیس سال پہلے گھر چھوڑ کر کی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسی طرح مرتے دم تک پچھتاوے کی آگ میں جلتی رہے گی، تاہم اسے ایک خوشی ہے کہ اُس نے اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔

صدام حسین غازی تینو

# کالی رسم

عارف شفیق کا خیال

ظلم کی تیرگی میں دیا چاہیے
اپنی پہچان اپنا پتا چاہیے

**سندھ دھرتی پر صدیوں سے رائج ایک کالی رسم سے پھوٹتی غم ناک کہانی**



میں اکثر رات میں سفر کرتا ہوں اس لیے کہ رات کا سفر مجھے اچھا لگتا ہے۔ اس بار بھی جب مجھے لاڑکانہ جانا تھا تو میں نے سفر کے لیے ایسی ٹرین کا انتخاب کیا جو رات کے وقت کوٹری جنکشن سے نکلتی تھی اور صبح لاڑکانہ پہنچا دیتی تھی۔ وقتِ مقررہ پر میں اسٹیشن گیا اور اپنی مطلوبہ ٹرین میں سوار ہوگیا۔ سفر چونکہ تقریباً آٹھ سے دس گھنٹے کا تھا اس لیے میں نے ایک برتھ پہلے ہی بک کرالی تھی تاکہ سکون سے آرام کرتا ہوا جاؤں۔ ٹرین میں چڑھتے ہی میں برتھ پہ لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر میں مجھے نیند آ گئی۔ پتا نہیں کب ٹرین چلی؟ اچانک جھٹکا لگا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ باہر نظر ڈالی تو علم ہوا' ٹرین جامشورو اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ مجھے بھوک محسوس ہونے لگی' سو ٹرین میں ہی مجھے کولڈ ڈرنک اور چپس وغیرہ مل گئی۔ میں اپنی برتھ پر بیٹھ کر آرام سے کھانے لگا۔ ٹرین دوبارہ چل پڑی تھی۔ بوگی میں رش بہت تھا۔ اگر دو دن پہلے میں برتھ بک نہ کرواتا تو مجھے بھی دیگر مسافروں کی طرح کھڑے ہوکر سفر کرنا پڑتا۔ اب میں کھانے پینے سے انصاف کرنے کے بعد اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ٹرین آہستہ ہوئی اور پھر رک گئی۔ کچھ نئے مسافر چڑھے اور پھر ٹرین چل دی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا سوار ہونے والے مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو مجھے پریشان سی لگ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے' وہ بار بار اپنے بالوں کو درست کر رہی تھی اور اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو ترتیب دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا کھڑا تھا جو اسے سنبھال رہا تھا۔ وہ سہمی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

میں نے سوچا' اس کی طبیعت خراب ہے اس لیے میں نیچے اترا اور اس لڑکے سے کہا۔

''بھائی......! لگتا ہے' بہن کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ اس کو میری برتھ پہ لٹا دو۔''

''نہیں بھائی......! مہربانی! ہم یہیں ٹھیک ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ارے نہیں بھائی......! آپ بہن کو لٹا دو۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''نہیں پلیز' ہم یہیں ٹھیک ہیں۔'' اس بار لڑکی بولی۔

''پلیز بہن' آپ چلیں' آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے۔'' میرے اتنے اصرار پر وہ مان گئے لیکن مجھے بھی ساتھ ہی بٹھا لیا۔ میں نے اُن کو جوس دیا اور اُن سے کھانے کا پوچھا۔ انہوں نے منع کیا لیکن میں پھر بھی چپس لے کے آیا اور اُن کو دی۔ وہ کھانے لگے۔ اس دوران میں نے لڑکے کا نام پوچھا۔ اُس نے اپنا نام جہانگیر بتایا۔

''میرا نام صدام حسین ہے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''بھائی......! ہماری منزل کا کچھ پتا نہیں۔'' اس نے اداس لہجے میں کہا۔

''کیوں' کیا مطلب؟'' میں نے اُسے حیرانی سے دیکھا۔ لڑکے کے جواب دینے سے پہلے ہی لڑکی رو پڑی۔

''دیکھیں پلیز' آپ نا روئیں' کیوں رو رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا مگر لڑکی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ لڑکے نے اسے سمجھایا تو وہ چپ ہوگئی۔

تب لڑکے نے بتایا۔ بھائی صدام......! ہم گھر سے بھاگ کر آئے ہیں۔''

''کیا!! کیوں؟'' میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔



''دنیا ساری ہماری دشمن بن گئی ہے' تب سے جب سے محبت کی ہے۔''

''ہم نے محبت کرنے کا جرم کیا ہے اس لیے سب ہمارے دشمن بن گئے ہیں۔'' لڑکے نے کہا۔

'اوہ' تو گویا یہ دو پریمی تھے۔' میں نے سوچا۔

''جہانگیر بھائی' آپ فکر نہ کریں' میں آپ کی ہر طرح کی مدد کے لیے تیار ہوں۔'' میں خلوص سے بولا۔

''آپ کی مہربانی' جتنا آپ نے کیا ہے' اس کا ہم شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔''

''ارے نہیں یار' ایسی کوئی بات نہیں' میں نے کون سا کارنامہ کیا ہے' یہ تو میرا فرض تھا۔'' میں نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ میرے رویئے سے وہ بھی بے تکلف ہوگئے اور پھر لڑکے نے اپنی کہانی کچھ یوں سنائی۔

''میرا نام جہانگیر ہے' مجھے پیار سے شان کہا جاتا ہے۔ میں جام شورو میں رہتا ہوں۔ مہران یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ ہم تین بھائی ہیں' دو مجھ سے بڑے ہیں اور تین بہنیں' وہ بھی مجھ سے بڑی ہیں۔ میں کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ خاندان بھر میں دولت کے حوالے سے ہمارا کوئی جوڑ نہیں ہے چونکہ میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے سارے گھر کا لاڈلا تھا' میری ہر خواہش پوری ہوتی تھی۔ میں نے جب پانچ کلاسیں پاس کیں تو مجھے بیکن ہاؤس ہائی اسکول میں داخل کروایا گیا لیکن مجھے وہاں مزہ نہیں آیا اور میرے کہنے پر سٹی اسکول' حیدرآباد میں داخل کروا دیا گیا جہاں میری ملاقات سحرش سے ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا میل جول دوستی میں بدلتا چلا گیا۔ ہم ساتھ کھاتے تھے' ساتھ پڑھتے اور ہر جگہ ساتھ ساتھ ہوتے۔ گزرتے وقت میں ہم بڑے ہوتے گئے اور ہماری دوستی محبت میں تبدیل ہوگئی۔ اب ہمیں ایک پل بھی ایک دوسرے کے بنا چین نہیں آتا تھا' کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ ہم ایک دوسرے میں کھوئے رہتے تھے۔ ہم ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھاتے تھے اور آنے والی زندگی کے سنہرے منصوبے بنایا کرتے تھے پھر ایک دن ہمیں اسکول چھوڑ کر جدا ہونا پڑا لیکن فون پر ہمارا رابطہ رہتا تھا۔ سحرش نے والدین کے کہنے پر لیاقت میڈیکل یونیورسٹی' جام شورو (LUMS) میں داخلہ لے لیا جبکہ میں باہر جانا چاہتا تھا لیکن والدین کے کہنے پر مجھے مہران میں داخلہ لینا پڑا۔ وقت تیزی کے ساتھ گزرتا رہا۔ میں اکثر سحرش سے ملنے لمس (LUMS) جایا کرتا تھا۔ ہم اکثر گھومنے نکل جاتے تھے۔ ایک دن سحرش کے بھائیوں نے ہمیں ساتھ دیکھ لیا' انہوں نے سحرش کو گھر بھیج دیا اور مجھے اتنا مارا کہ میرے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ آنکھ کھلی تو خود کو ہسپتال میں پایا۔ بھائی پریشان تھے' بہنیں مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں' سو تینوں آئی ہوئی تھیں۔ دو دن بعد مجھے ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ بھائیوں کو پتا چل چکا تھا کہ یہ سب کس نے کیا ہے' سو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اُس لڑکی کو بھول جاؤں۔

''نہیں' یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

''اگر تو نے اُسے نہ بھلایا تو ہم اُسے مار دیں گے۔'' بڑے بھائی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

''اور انہوں نے جو تجھے مارا ہے' اس کا حساب ابھی باقی ہے۔'' دوسرے بھائی نے بھی طیش میں کہا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر اپنے بھائیوں سے التجا کی کہ اس بات کو ختم کر دیں، غلطی میری تھی لیکن بھائی غصے میں طنطناتے ہوئے چلے گئے۔

مجھے سحرش کی فکر تھی۔ اگر میرے بھائی کوئی ایسی ویسی حرکت کرتے تو میرا اور سحرش کا ملن ممکن نہیں ہو سکے گا۔ میں دل ہی دل میں خیر کی دُعا مانگ رہا تھا۔

میری تینوں بہنیں میرے پاس بیٹھی مجھے دلاسہ دے رہی تھیں۔ گھر میں بس میری بہنیں ہی تو تھیں جن سے میں دل کی بات کرتا تھا۔ بڑی دو بہنوں کی عمر ڈھل گئی تھی لیکن پیسے اور ذات پات پہ گھمنڈ کرنے والے بھائی اور والد صاحب نے اُن کی شادی نہیں کی' صرف اس لیے کہ کوئی ہماری برابری کا ہے ہی نہیں' اس دقیانوسی سوچ کا عذاب میری دو بہنوں کو بھگتنا پڑ رہا تھا۔ تیسری بہن ابھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی۔ میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اس کو اس عذاب سے ضرور بچاؤں گا۔

سارا دن گزر گیا۔ رات گئے بھائی لوٹے تو بہت خوش تھے۔ انہوں نے فخر سے بتایا کہ ہم نے اُن کا ایک لڑکا مار دیا۔ یہ بات مجھ تک پہنچی تو میں بے چین ہو گیا اور دل میں رونے لگا۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ اب تو میں اور سحرش کبھی نہیں مل سکتے۔ میری بہنیں مجھے دلاسے دے رہی تھیں لیکن دشمنی کی ابتدا ہو گئی تھی۔

گھر کے باہر پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ کتنے ہی غنڈے اوطاق میں ہتھیاروں کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔ وہاں سحرش کو قید کر دیا گیا' اس کے باہر جانے پر پابندی تھی۔ ان کے یہاں بھی بڑا سخت پہرہ لگا ہوا تھا۔ اس کے بھائی یہی کہہ رہے تھے کہ ان کا ایک جوان مار کر ہم اپنا بدلہ لیں گے۔

میری پڑھائی کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ میں بھی گھر میں قید ہو گیا تھا۔ اکثر بھائیوں سے باہر جانے کے لیے لڑ پڑتا لیکن وہ نہیں مانتے۔ اسی دوران ایک روز میری چھوٹی بہن نے مجھے بتایا کہ وہ ایک لڑکے سے پیار کرتی ہے' وہ بھی اُسے چاہتا ہے۔ وہ لڑکا ہمارے پڑوس کا تھا' زبیر نام تھا۔ میں اسے جانتا تھا' اچھا لڑکا تھا۔ بہن کا کہنا تھا کہ وہ رشتہ بھیجے گا تو میں نے فوراً اُسے منع کر دیا کیونکہ مجھے معلوم تھا' میرے بھائی نہیں مانیں گے۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ یہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ بہن کو میری بات سمجھ میں آ گئی۔

دوسرے دن میں زبیر سے ملا' اسے ساری بات بتائی اور ایک دن مقرر کیا اور واپس گھر آ گیا۔ دونوں بڑی بہنیں اس راز میں شامل تھیں۔

مقررہ وقت پر رات کو دونوں بہنوں نے اپنی چھوٹی بہن کو کچھ زیور جو ان کی قسمت میں پہننا نہیں لکھا تھا اور کچھ رقم دی تا کہ وہ دوسرے شہر جا کر اپنا گھر لے سکے پھر رات کے آخری پہر جب سب سو رہے تھے' ہم تینوں نے اپنی چھوٹی بہن کو بہت سی تاکیدوں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

صبح بھائیوں کے چلانے پر میری آنکھ کھلی تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا' چھوٹی بھاگ گئی ہے۔ بہنیں دکھاوے کے لیے رو رہی تھیں۔ میں بھی رونے کی اداکاری کرنے لگا۔ بھائی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگے لیکن چھوٹی کو ڈھونڈ نہیں پائے۔

دوسرے دن زبیر کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کورٹ میرج کر لی ہے اور کرائے کا مکان ملا ہے۔ جلد ہی اپنا گھر لے لیں گے۔ میں بہت خوش ہوا۔ بھائیوں کی تلاش جاری تھی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

کچھ عرصے بعد میں یونیورسٹی دوبارہ جانے لگا تھا لیکن اب دو گارڈز میرے ساتھ ہوتے تھے۔ ایک



دن سحرش سے فون پر میری بات ہوئی۔ میں نے اس کی دوست سے نمبر حاصل کیا تھا پھر فون پر ہمارا رابطہ ہونے لگا۔ اسی طرح ایک سال بیت گیا۔ اس دوران میں دوسرے شہر جا کر چھوٹی بہن سے مل بھی آیا تھا۔ وہ امید سے تھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ چھوٹی کو یہ خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہو گی۔ ایک دن بھائیوں کو جانے کیسے زبیر اور چھوٹی کے بارے میں پتہ لگ گیا۔ انہوں نے چھوٹی اور زبیر کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنے غصے کی پیاس بجھائی۔ اُن کی موت کی خبر میں نے اخبار میں پڑھی۔ مجھے شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ امید سے تھی پھر بھی بھائیوں کو اُس پر رحم نہیں آیا۔ کتنے ظالم تھے میرے بھائی' مجھے ان سے نفرت ہو رہی تھی لیکن میں ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا' بس بہن کا ماتم کر کے صبر کر لیا۔

ایک روز سحرش کی کال آئی' وہ کسی سہیلی کے گھر سے بات کر رہی تھی۔

''جہانگیر' میری شادی طے ہو گئی ہے مگر میں تمہارے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی ورنہ میں خودکشی کر لوں گی۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ پور پور میری محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں بھی اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا لہٰذا میں نے اسے کچھ دن بعد جام شورو اسٹیشن پہ بلایا۔ ہم نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے بھی اپنی بہنوں کو بتایا' وہ فکر مند ہو گئیں پر مجھے جانے سے روک نہیں سکتی تھیں۔ جانتی تھیں' میں سحرش کے بغیر نہیں رہ سکتا اور پھر آج ہم بھاگ نکلے اور اب آپ کے سامنے ہیں۔'' اپنی بپتا سنا کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے جب سحرش کو دیکھا' اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جہانگیر بھی رو رہا تھا۔ انہیں غم زدہ دیکھ کر میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔

میں نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''اب کہاں کا ارادہ ہے؟''

''ابھی تو سکھر جا رہے ہیں۔''

''وہاں کوئی جان پہچان والا ہے؟''

''ہاں' میرے دوست رہتے ہیں۔''

''اگر میری ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' میں نے اخلاص سے کہا۔

''نہیں بھائی' بہت بہت مہربانی آپ کی۔'' اس نے جواب دیا۔

رات بھر ہم تینوں جاگتے رہے۔ فجر کی اذان کے وقت ٹرین نے ہمیں لاڑکانہ میں اتارا۔ اسٹیشن پر ہم نے نماز پڑھی اور ناشتہ کیا پھر میں نے ان دونوں کو سکھر کی وین میں بٹھا کر رخصت کر دیا اور اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ پندرہ دن بعد میں حیدرآباد لوٹ آیا اور اپنی زندگی میں ایسا مصروف ہوا کہ جہانگیر اور سحرش کو بھول گیا۔

چند ماہ بعد میں صبح کا اخبار پڑھ رہا تھا کہ جہانگیر اور سحرش کی تصویر دیکھ کر چونک پڑا۔ تصویر کے ساتھ ہی خبر تھی کہ کل رات سکھر کے ایک گھر میں نامعلوم افراد گھس گئے اور میاں بیوی کو قتل کر دیا۔ عورت امید سے تھی۔ دونوں کو سفاکی سے ذبح کیا گیا تھا۔ میں نے خبر پڑھی تو بلک بلک کر رونے لگا۔ میں جانتا تھا' یہ سحرش کے بھائیوں کا ہی کارنامہ تھا۔

میرے ذہن میں بس یہی سوچ تھی کہ دنیا چاند پہ پہنچ چکی ہے لیکن سندھ میں آج بھی کاروکاری کا عفریت محبت کرنے والوں کو نگل رہا ہے۔ کیا محبت کرنے والے انسان نہیں ہوتے جو انہیں کاری قرار دے کر بے دردی سے مار دیا جاتا ہے؟ جانے کب تک سندھ کی بچی کو اس کے حق سے محروم رکھا جائے گا اور اسے کاری کر کے مارا جاتا رہے گا؟



ندا فاطمہ

# جینا ہی پڑے گا

یاسمین صہبا کا خیال

ہنسنے والو اس پر بھی کچھ غور کرو
ہنستے ہنستے اشک بہانے پڑتے ہیں

جیون کا زہر ہر ایک کو پینا ہی پڑتا ہے اس خیال کو اجاگر کرتی مختصر کہانی



پریشانیاں کس کی زندگی میں نہیں ہوتیں؟ ہر ایک کی زندگی میں ایک وقت میں یا تو خوشی ہوتی ہے یا پھر غم ہوتے ہیں مگر میری والدہ کی زندگی میں ایک ہی وقت میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز دیکھے ہیں' اُن کی کہانی' اُن ہی کی زبانی سنیے۔

''میرا نام ارم ہے۔ میری آنکھ لیاقت آباد کے تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹے سے گھر میں کھلی۔ میرے والد سنار تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ اُن کی دوسری بیوی سے ہم چھ بہن بھائی تھے' ایک بھائی اور دو بہنیں مجھ سے بڑے جبکہ دو بھائی مجھ سے چھوٹے تھے۔ میرے والد کی پہلی بیوی ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد انتقال کر گئی تھی۔ میں ابھی چھ سال کی ہی تھی کہ میری والدہ کو بھی موت نے آلیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا صدمہ تھا اور پہلی بار میں نے قریب ترین رشتے کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے مجھے موت کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ والدہ کی وفات سے ہم بہن بھائی ایک محبت کرنے والی ہستی سے محروم ہو گئے۔ اب والد کے سامنے یہ مسئلہ سر اٹھائے کھڑا تھا کہ اتنے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال کیسے کی جائے؟ لہٰذا ابو کو تیسری شادی کرنی پڑی۔ ہماری سوتیلی ماں روایتی سوتیلی ماں جیسی ثابت ہوئی تھیں۔ میں گھر کا تمام کام کرتی' کپڑے دھوتی' کھانا بناتی پھر اپنے ایک چھوٹے بھائی کو بھی سنبھالتی۔ ہماری تیسری امی ہم لوگوں کو سنبھال نہ سکیں' انہیں صرف اپنی فکر رہتی تھی اس لیے ابو کو چوتھی شادی کرنی پڑی۔ نئی امی قدرے بہتر تھیں' ہم اُن کے دور میں اسکول بھی پڑھنے جایا کرتے تھے لیکن ہمارے علاقے کے ماحول کی وجہ سے مجھے اپنی پڑھائی چھوڑنی پڑی۔ اُس دن میں بہت روئی تھی۔ اگر پہلا غم ماں کا تھا تو دوسرا غم ادھوری پڑھائی کا سہنا پڑا۔ وقت گزرتا رہا اور میں نے جوانی کی حدود میں قدم رکھ دیا۔ جوانی میں مجھ پر خوب رنگ روپ چڑھا۔ میری خوبصورتی کے چرچے تھے۔ جوانی میں ہر انسان کی خواہشیں اور خواب عروج پر ہوتے ہیں' میرا بھی یہ ہی عالم تھا۔ اُس وقت تک میری تین بڑی بہنوں اور بڑے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ اُن ہی دنوں ابو کے گلے میں تکلیف ہوگئی' یہ تکلیف بڑھتے بڑھتے کینسر کی شکل اختیار کر گئی۔ اس مرض نے انہیں نڈھال کر دیا۔ ہم سب بہن بھائی اُن کی خدمت کرتے۔ ابو کو میری فکر تھی لہٰذا انہوں نے اپنے بھائی کے بیٹے سے میری شادی طے کر دی۔ ابو کی خواہش تھی کہ وہ مجھے دلہن بنے دیکھیں۔ ابو کا ایک اور گھر ناظم آباد میں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بیاہ کر اُس مکان میں رہوں لیکن اُن کے نصیب میں مجھے دلہن کے روپ میں دیکھنا نہیں تھا اور ایک روز وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ یہ دوسرا بہت بڑا صدمہ تھا جو زندگی میں مجھے ملا تھا۔ پہلے ماں گئی' اب باپ کا سایہ بھی اٹھ گیا اور مجھے یتیم کر گیا۔ ابو کی وفات کے بائیس دن بعد میری شادی ہوگئی' یوں ابھی میں ابو کے غم میں نڈھال ہی تھی کہ میری زندگی کا نیا سفر شروع ہو گیا اور اس طرح میں اپنے سسرال والوں کے ساتھ اپنے ابو کے مکان میں رہنے لگی۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ میری سسرال خراب تھی یا برے لوگ تھے' بس ان سب کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھے جبکہ شادی کے بعد ایک لڑکی کو شوہر کے ساتھ ساتھ سب کو مطمئن کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے' بس وہی حالات تھے۔ کچھ عرصے بعد اللہ نے میری گود ایک بیٹے کی صورت بھر دی جس کا نام عدنان رکھا گیا۔ میں اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ چھ سال بعد میرے ایک اور بیٹا ہوا جو بہت خوبصورت تھا۔ اُس کا نام ہم نے یوسف رکھا مگر نہ جانے اُس کو کس کی نظر لگ گئی۔ ابھی وہ بمشکل ڈیڑھ

برس کا تھا کہ شدید بیمار ہو گیا' اسے ایسا بخار چڑھا جو اُس کے سیدھا دماغ پر اثر کر گیا اور اس طرح وہ ذہنی مریض بن کر رہ گیا۔ مجھے بہت دکھ ہوا کہ میرا اتنا خوبصورت بچہ ذہنی معذور ہو گیا۔ اُن ہی دنوں میری بیٹی ندا دنیا میں آئی۔ اب میرا ایبنارمل بچہ اور بیٹی ندا دونوں چھوٹے تھے' بڑا بیٹا عدنان اسکول میں پڑھتا تھا۔ دونوں چھوٹے بچوں کو میں اکیلے سنبھالتی تھی کیونکہ میری سسرال والے چھ سال بعد ہی گھر چھوڑ کر دوسرے گھر شفٹ ہو گئے تھے۔ میرا بیٹا یوسف جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا' اس کی عجیب حرکتیں بھی بڑھتی گئیں۔ وہ گھر سے باہر نکل جاتا' سب کو تنگ کرتا' سب محلے والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ بچہ ذہنی مریض ہے۔ بہرحال وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ میری شادی کو بیس سال کو ہونے کو تھے کہ میرے شوہر کو دل کا دورہ پڑا مگر یہاں یہ بتاتی چلوں کہ مجھے اُس وقت علم نہیں تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ میرے چچا ڈاکٹر تھے' اُن سے علاج ہو رہا تھا مگر انہوں نے مجھے کچھ نہ بتایا۔ میرا بڑا بیٹا عدنان اُس وقت اٹھارہ برس کا ہو گیا تھا۔ اُسے بھی معلوم تھا مگر اُس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں پوچھتی رہتی کہ ان کو کیا ہوا ہے؟ مگر کوئی کچھ نہ بتاتا۔ اسی دوران میں امید سے بھی ہو گئی تھی۔ میرے حمل کو چھ ماہ ہو گئے تھے کہ شوہر کو دوسرا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ یہ میری زندگی کا تیسرا بڑا صدمہ تھا۔ پہلے ماں پھر باپ' اب شوہر۔ شوہر تو میرا وہ شجر تھا جس کے سائے تلے میں اور میرے بچے سکون کی زندگی جی رہے تھے' اب وہ شجر نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اُس کے سائے کے بنا زندگی کی دھوپ میں سفر کرنا تھا۔ میں غم برداشت کر کر کے ایسے نڈھال ہو گئی تھی جیسے کسی مسافر پر اتنا بوجھ ڈال دیا جائے جسے اٹھانے کی اُس میں نہ ہمت و طاقت نہ ہو لیکن مجھے جینا تھا' اپنے لیے نہیں' اپنے بچوں کے لیے۔ شوہر کی موت کے چار ماہ بعد ایک اور بیٹی نازیہ میری گود میں آ گئی مگر وہ بھی بخار میں مبتلا ہو کر ذہنی مریضہ بن گئی۔ یوں ایک اور اولاد ایب نارمل ہو گئی۔ میرا دوسرا بیٹا یوسف اور چھوٹی بیٹی نادیہ دونوں ذہنی مریض ہو گئے۔ میں نے اُن لوگوں کا بہت علاج کروایا لیکن ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ یہ زندگی بھر ایسے ہی رہیں گے۔ وقت آگے بڑھتا گیا' میرے بچے عدنان اور ندا بڑے ہو گئے' شادی کے قابل ہو گئے۔ جب میں اُن دونوں کے رشتے کے لیے گھر سے نکلی تو لوگوں نے بہت باتیں بنائیں کیونکہ ہمارا معاشرہ ایب نارمل بچوں کو قبول نہیں کرتا تو اُن کے گھر رشتہ کون کرتا مگر قدرت کی مہربانی سے میرے بڑے بیٹے کی شادی بہن کی لڑکی سے اور میری بڑی بیٹی کی شادی بڑی بہن کے لڑکے سے ہو گئی۔ اس طرح میں دو بڑی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی۔

زندگی کا سفر اسی طرح جاری تھا کہ اچانک ایک روز یوسف کی طبیعت بگڑی اور پھر کوئی علاج' کوئی تدبیر' کوئی دُعا کام نہ آئی اور یوسف ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ اَب میرے پاس بس اپنے بیٹے کی یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں!!

آج میں' میرا بڑا بیٹا عدنان' اُس کی بیوی' ایک پوتی اور میری معصوم ایب نارمل بچی نادیہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں آج بھی اپنے ابو کے مکان میں رہتی ہوں۔ نادیہ اکثر بیمار رہتی ہے۔ اِس مہنگائی کے دور میں گھر کے خرچے کے ساتھ نادیہ کی دوائیوں کا خرچہ آسان نہیں مگر میں حالات کا مقابلہ کر رہی ہوں' زندگی کی جنگ لڑے جا رہی ہوں۔ کوئی رشتہ دار نہیں پوچھتا' کوئی نہیں دیکھتا۔ میں نے زندگی سے اکیلے ہی مقابلہ کیا' کسی نے ہاتھ بڑھا کر ساتھ نہ دیا مگر میں پھر بھی مضبوط ہوں' مجھے قدرت کی ہر آزمائش پر پورا اترنا ہے کیونکہ بہرحال آپ چاہیں یا نہ چاہیں آپ کو اپنے حصے کی زندگی تو جینا ہی پڑتی ہے۔





فاطمہ بلگرامی

# جن آنکھوں میں خواب بسے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ قسط نمبر 12

**خلاصہ:** داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی افتخار الملک نامی شخص سے شادی کی تھی...... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا...... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ افتخار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ نامی ایک نہایت موڈ لڑکی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں ملنے کے لیے وزیٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی فہمیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوبصورت ذہین اور حاضر جواب لڑکی عنبر بھی ہے جو داؤد کو اچھی لگتی ہے...... اور ایک رشتے دار رابیل اختر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود جیل کاٹی ہے اور وہ منشیات کا عادی بھی رہ چکا ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راحیلہ کا ایک طویل خط ملتا ہے، جسے داؤد نے بہن سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو محبوب سمجھ کر اُس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی۔ یہ خط راحیلہ نے مرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ داؤد جہاں ایک طرف اِس بات سے خوش ہے کہ عنبر اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے، وہاں اس کے لیے یہ بات بھی حیرانی اور پریشانی کا باعث ہے کہ موم نے آخر فہمیدہ سے جو اس

کی بہن ہے اس کے رشتے کے بارے میں سوچا بھی کیسے...... داؤد کی ملاقات رابیل سے ہوتی ہے جو اسے اپنی کہانی سناتا ہے اور یہ کہانی کردار در کردار آگے بڑھتی ہے، رابیل خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اُسے ایک سازش کے ذریعے ہیروئن کا عادی بنایا گیا...... اور پولیس کی نوکری سے نکلوایا ہی نہیں، اُس سے مجرمانہ عمل کرانے کی بھی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ جیل پہنچ گیا...... اور پھر جیل سے فرار ہوتا ہے، داؤد وغیرہ کی انڈیا آمد ہوتی ہے، یہاں مختلف اوقات میں رابیل داؤد کو اپنی کہانی سناتا رہتا ہے۔ **اور اب آگے پڑھیے:**

''دوستوں ابھی تو ایسے ایسے راز سے پردہ اٹھے گا کہ تمہاری عقل چکرا کر رہ جائے گی۔'' سہیل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اچھا!'' آصفہ نے بھی طنزیہ انداز میں کہا۔

''فی الحال تو چائے پیو۔'' پھر سہیل نے اشفاق کو اشارے سے کچھ سمجھایا وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''کیا ہم زندہ نہیں؟'' صادقہ کی آواز سنائی دی۔

''فکر نہ کرو اگر مر چکے ہیں تو بھی ساتھ ہیں۔'' کمال نے آوازہ کسا۔

میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں جانب نگاہیں موڑ کر دیکھیں۔ نجمہ، آصفہ اور شگفتہ بھی موجود تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔

''قیدی بننا ہماری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔'' نجمہ نے ٹکڑا لگایا۔ ''پہلے جیل میں تھے پھر سہیل کے گھر میں پھنسے اور اب یہاں۔ اس دس بائی دس کے کمرے میں۔''

''لگتا ہے چائے میں نشہ آور دوا تھی۔'' آصفہ نے کہا۔

''جی نہیں، پیار بھری لوری تھی جسے سنتے ہی ہم سب سو گئے۔ عقلمند کی وادی جان بغیر نشے کے ہم بے ہوش کیسے ہوئے؟'' صادقہ نے طنز کیا۔

''کہیں دونوں جھگڑ نہ پڑیں اسی ڈر سے میں نے باتوں کا رخ موڑ دیا۔'' کیا تم نے اندازہ لگایا کہ مرنے سے پہلے نور کیا کہنا چاہتا تھا؟''

''سہیل بھی شیر خان نہیں ہے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ نور نے جیسے ہی کہا کہ یہ شخص اور اسے گولی ماردی گئی۔ شاید وہ اس کا اصل نام بتانا چاہتا تھا۔'' آصفہ نے مسکرا کر کہا۔

''غلط، ایک نہیں ایسے بہت سے ثبوت ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سہیل ہی شیر خان ہے۔'' میں نے مسکرا کر آصفہ کی طرف دیکھا۔ ''نور کوئی اور بات بتانا چاہتا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی بات جسے سنتے ہی ہم سہیل کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔''

''تو اب کیا ہم اس کا اچار ڈالیں گے۔'' صادقہ جل کر بولی۔

''تو نہیں سمجھی وہ ہم سے بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے۔'' آصفہ بولی۔ ''تم نے بھی سنا ہوگا۔ وہ ہمیں اس علاقے میں بھیجنا چاہتا ہے جہاں افیون کی کاشت ہوتی ہے۔ وہ علاقہ موت کی وادی کہلاتا ہے۔ وہاں دوستوں کے لئے جان دی جاتی ہے مگر دشمنوں کو کسی حالت میں بھی بخشا نہیں جاتا۔''

''یعنی ہمیں ان کھیتوں پر قبضہ کرنا ہوگا۔''



''کھیتوں پر نہیں، کسانوں پر انہیں مافیا کے چنگل سے نکال کر اپنے قبضے میں لینا ہوگا تاکہ وہ اپنا مال ہمیں دیا کریں۔''

''ایک بات کہوں۔'' کمال نے کہا۔ ''میرا تو خیال ہے اس کا ساتھ دے دیا جائے تاکہ ہم وہاں تک جا پہنچیں لیکن وہاں پہنچ کر ہمارا مشن بدل جائے گا۔ ہم وہاں کے لوگوں کو ترغیب دیں گے کہ اس زہر کی کاشت بند کر دیں۔''

''فی الحال تو یہ سوچو کہ یہاں سے نکلا کیسے جائے۔'' نجمہ بولی۔

''کھڑکیوں پر کوشش کرنی چاہیے۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''یہ مت بھولو کہ یہ کمرا ابھی چائنیز ہوٹل میں ہوگا۔''

''یہ بعد کی بات ہے کہ ہم کہاں ہیں؟'' کہتے ہوئے کمال نے پوری قوت سے کھڑکی پر گھونسا مارا۔

کھڑکی کا پلہ شاید بہت پرانا تھا۔ اکھڑ کر دور جا گرا۔ لکڑی کا پلہ ٹوٹتے ہی میرا دل جھوم اٹھا۔ کھڑکی میں سلاخیں بھی نہیں تھیں۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم چائنیز ہوٹل میں نہیں تھے۔ کسی ویران جگہ پر بنی عمارت میں قید تھے۔ عمارت کے گرد چار فٹ اونچی دیواریں تھیں۔ دیواروں کے پار دور دور تک پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ عمارت سنسان ہے۔ کوئی آدمی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔

''پہلے میں باہر کودتا ہوں میرے پیچھے کمال آئے گا تاکہ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جائے تو سنبھالا جا سکے۔'' میں نے کہا۔ اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔

واقعی وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے اشارہ دیا کہ بعد دیگرے سب باہر نکل آئے۔ باہر آتے ہی میں نے

صحن میں قدم رکھا۔ ابھی بہ مشکل دو قدم چلے ہوں گے کہ میرے اوپر کوئی بھاری شے آ پڑی۔ میں نے پھرتی سے قلابازی لگادی تھی پھر بھی میری شرٹ پھٹتی چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کس کونے میں وہ بلڈ ہاؤنڈ چھپا ہوا تھا جس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو میرا انزخرا ادھڑ جاتا۔ کتا پھر اچھلا تھا کہ میں نے دوبارہ قلابازی کھائی۔ کمال نے موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے پلے کو اٹھا لیا تھا اور ایسا تاک کر مارا کہ کتے کی کھوپڑی اڑ گئی وہ خون میں نہا گیا اور زمین پر گر کر اینٹھنے لگا تھا۔ شگفتہ کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا جب کہ آصفہ، صادقہ اور نجمہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح چاق و چوبند تھیں۔

''ارے بھئی آگے بھی بڑھو۔'' کمال نے ٹوکا۔

ہم سب ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ سامنے سے ایک جیپ آتی نظر آئی۔ جیپ دیکھتے ہی میں نے سب کو لیٹ جانے کا اشارہ کیا اور نیچی آواز میں بولا۔ ''واپس بلڈنگ کی جانب۔''

ہم سب فوجیوں کی طرح سرعت سے سینے کے بل رینگتے ہوئے برآمدے میں پہنچے اور پھر سامنے والے دروازے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے میں ایک آدمی اوندھا پڑا تھا۔ اس کے نزدیک ہی دیسی شراب کی خالی بوتل پڑی تھی۔ لگتا تھا ایک کتے اور ایک آدمی پر بھروسا کر کے سہیل نے سمجھ لیا تھا کہ وہ طوفان کا راستہ روک لے گا، لیکن یہ اس کی عقل پر ہنسنے کا موقع نہیں تھا آنے والوں کی نگاہوں سے چھپنے کا موقع تھا۔ میں نے صادقہ کو الماری کے پیچھے، آصفہ اور نجمہ کو پلنگ کے نیچے چھپنے کا اشارہ دیا اور خود دروازے کی آڑ میں ہو گیا۔ دوسرے پلے کے پیچھے کمال کھڑا ہو گیا۔ شگفتہ، صادقہ کے پیچھے چھپ گئی۔ اسی وقت باہر سے جیپ کے رکنے کی آواز آئی پھر کسی نے پکارا ''جمیل!''

میں سمجھ گیا کہ انٹا غفیل پڑے اس شخص کا نام جمیل ہے۔

پکارنے والا کمرے کے دروازے پر آ کر بولا۔ ''سالے، اس نے آج پھر چڑھا لی۔ باس نے سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ قیدی چالاک ہیں ان پر خاص نظر رکھنی ہے'' اس نے آگے بڑھ کر لیٹے ہوئے شخص کو لات ماری۔ نشے میں دھت پڑے شخص نے کسمسا کر کروٹ لی۔ اسی وقت باہر سے آواز سنائی دی۔ ''ارے ٹائیگر مر گیا۔ فرحان جلدی آؤ۔''

اندر آنے والا الٹے پیروں واپس پلٹ گیا۔ اس نے باہر پہنچتے ہی کہا'' لگتا ہے قیدی فرار ہو گئے۔''

''ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے انہیں تلاش کر سکتے ہیں۔'' ایک دوسری آواز سنائی دی۔

''چلو، انہیں سڑک تک پہنچنے سے پہلے روکنا ہے۔''

کچھ لمحے بعد گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ ہم پھر باہر نکل آئے۔ گھر سے باہر آنے سے پہلے انٹا غفیل پڑے شخص کی مشکیں کس دی تھیں۔ باہر آتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے سے تین گاڑیاں آ رہی تھیں۔ آگے آگے کالی کار تھی۔ اس کار کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا وہ بلٹ پروف کار تھی۔ یقیناً اس میں سہیل ہوگا۔

میں نے مڑ کر کہا۔ ''ہری اپ واپس، اوپر چھت پر۔''

سب دوڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کسی نے دیکھ نہ لیا ہو۔



باہر آنے سے پہلے ہی میں نے اوپر جانے والی سیڑھیاں دیکھ لی تھیں۔ اسی کے ذریعے ہم اوپر پہنچے اور ایک جانب دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ یکے بعد دیگرے گاڑیاں آ کر پورچ میں رکیں اور لوگ اترے۔ دل نے چاہا کہ نیچے جھانک کر دیکھیں لیکن ہمت نہ ہوئی۔ کسی کی بھی نظر پڑ سکتی تھی۔ تبھی نیچے سہیل کی آواز سنائی دی۔ ''ٹائیگر مرا پڑا ہے۔ اندر دیکھو۔ لگتا ہے قیدی فرار ہو گئے ہیں۔''

نیچے سے کئی لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اسی وقت کسی اور کار کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی پھر کسی نے کہا۔ ''باس میں نے سڑک تک دیکھ لیا وہ ادھر نہیں گئے ہیں۔''

''تو کیا انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ تلاش کرو ورنہ......'' سہیل گرجا۔

''باس کہیں وہ اسی کوٹھی میں چھپے ہوئے نہ ہوں۔''

''ہاں، تلاش کرو۔''

''تبھی مجھے سیڑھیوں پر دھمک سنائی دی، کوئی اوپر آ رہا تھا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

میں زینے کی داہنی جانب تھا اور درمیان میں دیوار تھی۔ وہ زینے پر کھڑا سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ یقیناً اس کی آنکھیں سرچ لائٹ کی طرح گردش کرتی ہوئی اس کونے سے اس کونے تک کا جائزہ لے رہی تھیں اور میں اپنا سینہ زمین سے چپکائے دم سادھے لیٹا تھا۔ میرے پیچھے کمال تھا اور اس کے پیچھے باقی سب، تو اس کا داہنا پیر میرے ہاتھ کی پہنچ میں تھا' میں اگر چاہتا تو اسے کھینچ کر گرا سکتا تھا مگر میں پہل کا قائل نہ تھا۔

''اے ادھر کون ہے؟'' نو وارد نے بائیں جانب دیکھتے ہوئے ہانک لگائی۔

میرے دل میں چور تھا۔ میں نے بغیر کچھ پوچھے سمجھے اس پر چھلانگ لگا دی۔ حالانکہ مجھے سوچنا چاہئے تھا کہ ہم اس کے داہنے جانب ہیں اور اس نے بائیں جانب دیکھتے ہوئے ہانک لگائی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں تیندوے کی طرح اچھل کر اس پر جا پڑا اور اژدہے کی طرح اس کے جسم سے لپٹ گیا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ اس کے منہ کا ڈھکن بن گیا تھا۔ وہ زور لگا رہا تھا اور میں اسے دابے ہوئے تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ تڑپ نہ سکے کیونکہ چھت پر ہونے والی دھینگا مشتی کی دھمک نیچے کمرے میں با آسانی سنائی دے جاتی اور تجسس نیچے والوں کو چھت پر کھینچ لاتا۔ اسی لئے میری کوشش تھی کہ ہلکی سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ اسی دوران میں کمال نے اپنا کمال دکھا دیا اس نے نو وارد کی کنپٹی دبا دی تھی۔ بے چارہ چیخ بھی نہ پایا تھا کہ بے ہوش ہو گیا۔ اس بے ہوش شخص کو میں نے دیوار کی آڑ میں کھینچ لیا اور گٹھڑی کی طرح ایک جانب ڈال دیا' اور پھر میں اس کی جیب سے پستول نکال ہی رہا تھا کہ نیچے سے کسی نے ہانک لگائی۔ ''صاحب جان، اے او صاحب جان کہاں مر گیا؟''

میں نے اندازہ لگا لیا کہ نو وارد کو پکارا جا رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر لڑکیوں کی جانب دیکھا وہ سب چوبند تھیں۔ ست باندھے تیار۔ شکار آیا کہ جھپٹیں۔ شگفتہ کے علاوہ سب ہی مار کٹائی میں ایکسپرٹ تھیں۔ مردوں کی پٹائی تو ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ صادقہ نے غراتی آنکھوں سے مجھے سامنے دیکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سر گھما کر پوری توجہ سیڑھیوں کی جانب لگا دی۔ چند لمحوں کے بعد سیڑھیوں پر دھپ دھپ کی آواز آنے لگی میں سمجھ گیا کہ اس بار آنے والا بھاری بدن کا ہے اس سے نمٹنا اتنا آسان نہیں جتنی آسانی سے پہلے والے کو چت کر دیا تھا۔ میں نے کمال کا ہاتھ دبا کر ہوشیار کیا اور آنے والے کی راہ دیکھنے لگا۔ دل کی دھڑکن کنپٹیوں میں محسوس ہو رہی

تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دل سینے کا پنجر توڑ کر باہر آجائے گا۔ عجیب سا ماحول طاری تھا۔ اپنی سانسوں کی سرسراہٹ سے بھی خوف آرہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھ پر عجیب سا خوف طاری ہوتا جارہا تھا۔ اس سے پہلے جو شخص آیا تھا اس کے انتظار میں ایسی کوفت ایسا خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ کوفت، اس بات کی تھی کہ وہ جلد آجائے اور جو ہونا ہے ہوجائے۔ خوف اس بات کا تھا کہ اگر ناکام رہا تو زندگی کی بھی ضمانت نہیں۔ سہیل زندہ نہیں چھوڑے گا۔

بڑی مشکل سے جاں گسل لمحے کا خاتمہ ہوا اور آنے والے کا پیر نظر آیا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ پیر بہ زبان خاموشی اس کی تندرستی کی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ بھاری تن و توش کا تھا۔

اس نے چھت پر قدم رکھتے ہی چاروں جانب دیکھا اور پھر صاحب جان کو گالیاں دیتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ سارے اندیشے غلط ثابت ہوگئے۔ تنے ہوئے اعصاب معمول پر آگئے۔ سب کی جان میں جان آئی۔ خطرہ ٹل گیا تھا اب انتظار تھا کہ ان کی گاڑیاں باہر نکلیں۔ جب تک وہ نہیں جاتے ہیں ہمارے فرار کی راہ بند رہے گی۔

''صاحب جان کہاں مر گیا؟'' سہیل کی آواز سنائی دی۔

''پتا نہیں باس اوپر بھی نہیں ہے۔''

''تلاش کرو۔'' وہ دھاڑا۔

اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی۔ ''باس! اوپر...... کوئی ہے۔'' مجھے ایسا لگا گویا میرے سینے میں برچھی اتر گئی ہو، خوف کے عفریت نے گلا دبوچ لیا ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا تھا شگفتہ بیٹھ رہی تھی۔ اسی کی غلطی نے ہمیں مروا دینے کا سامان کر دیا تھا۔

''ہوشیار!'' میں نے سرگوشی میں کمال کو مخاطب کیا اور پستول کو آگے کر لیا۔

''احتیاط! میاں احتیاط۔'' کمال نے ٹوکا۔ ''پہلے انہیں اوپر آنے دو پھر دیکھا جائے گا۔''

اس کا مشورہ غلط نہیں تھا۔ سیڑھیاں پتلی تھیں ایک وقت میں دو آدمی آتے تے پہلے آنے والوں کو ہم بہ آسانی سنبھال سکتے تھے۔ کچھ کو آصفہ صادقہ اور نجمہ سنبھال لیتیں۔ بعد میں جو ہوتا دیکھا جاتا یوں بھی آنے والے دوست تو تھے نہیں۔

ابھی میں خیالوں میں ہی گم تھا کہ سہیل کی تند آواز سنائی دی۔ ''دلاور جا کر دیکھو۔''

میں تیار ہوگیا۔ نیچے چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں مگر آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ تبھی سیڑھیوں پر چاپ سنائی دی۔ میں مستعد ہوگیا۔ آنے والا اکیلا تھا مگر چاپ بھاری تھی۔ یقیناً بھاری تن و توش کا آدمی ہوگا۔ اس سے نبٹنا آسان ہوگا بھی یا نہیں۔ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ میرے اندازے سے بھی پہلے اوپر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ وہ نیولے کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھرتی سے اس کے پیر کو پکڑ کر کھینچ لیا۔ اس کے گرتے ہی کمال نے سواری گانٹھلی اور آصفہ نے سرعت سے اس کی کلاشنکوف چھین لی۔ صادقہ کب پیچھے رہنے والی تھی اس نے پوری قوت سے کھڑی ہتھیلی سے اس کی گردن پر وار کیا۔ چٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یقیناً اُس کا منکا ٹوٹ گیا ہوگا۔ اس کا بدن رہ رہ کر جھٹکے لے رہا تھا۔ میں نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لینی شروع کی۔ اس نے ڈبل ہالسٹر لگا رکھا تھا دونوں میں پستول تھے۔ ضرور وہ سہیل کا باڈی گارڈ ہوگا تبھی تو اس طرح مسلح تھا۔ میں نے صادقہ، آصفہ اور کمال کو پستول دے دیے اور کلاشنکوف خود رکھ لی۔

''کہاں مر گیا؟'' نیچے سے سہیل کی دھاڑ سنائی دی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ دو دو ہاتھ کرنا ناگزیر ہے۔

''شمیم تو جا کر دیکھ وہ اوپر کیا کرنے لگا۔ لگتا ہے صاحب جان کے ساتھ گھونٹ لینے لگا۔'' سہیل پھر دھاڑا۔ سیڑھیوں پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میں سمجھ گیا کہ آنے والے تعداد میں دو تین ہیں۔ ان سے کیسے نمٹا جائے۔ پہلے آنے والے صرف تلاشی کے لئے آئے تھے مگر اب جو آرہے تھے ان کا مقصد اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنا تھا۔ پہلے والے آڑ میں بیٹھتے ہیں۔ وہ آتے ہی پہلے دیوار کے پیچھے دیکھیں گے اور ہم سب دیکھ لئے جائیں گے۔ موقع نہیں تھا کہ ہم سب بکھر جاتے۔ سب کا ایک ساتھ پکڑے جانا یقینی تھا۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ آخری سانس تک مقابلہ کروں گا۔ تبھی مجھے پیٹھ کی جانب سے آواز سنائی دی۔ ''بچو کھیل ختم ہو چکا اپنے اپنے ہاتھ اٹھا لو۔''

میں نے مڑ کر دیکھا میرے پیچھے ایک نوجوان کلاشنکوف تھامے کھڑا تھا۔ اس کے کپڑوں پر زنگ کا داغ تھا میں سمجھ گیا کہ وہ پائپ کے ذریعے چھت پر چڑھا ہے۔ ٹھیک اسی وقت سیڑھیوں سے آواز آئی۔ ''ہری اپ فوراً ہاتھ اٹھا دو ورنہ چھلنی کر دوں گا۔'' سیڑھیوں پر بھی کلاشنکوف بردار موجود تھے۔

ہم سب بے بس ہو چکے تھے کوئی چارہ نہ تھا۔ آنے والا اتنی چالاکی سے آیا تھا کہ ہلکی سی آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہم سب سامنے کی سیڑھیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور وہ پچھلی جانب سے پائپ کے ذریعے چڑھ آیا تھا۔ اس نے کلاشنکوف سیدھی کر لی تھی۔ ہماری ہلکی سی لغزش ہمیں موت کے منہ میں دھکیل دیتی اسی لیے میں نے خاموشی سے ہاتھ اٹھا دیے میری تقلید سب نے کی۔

''چلو نیچے اترو۔'' اس نے کلاشنکوف ہلائی۔

ہم سب قطار باندھ کر نیچے کی جانب چل پڑے۔ میری لاشنکوف بھی اس نے چھین لی تھی لیکن پستول میری کمر میں تھا اگر ہاتھ نیچے رہتا تو میں رسک لے لیتا۔

''کیا میں ہاتھ نیچے گرا لوں۔'' آصفہ نے پوچھا۔

''ہاں لڑکیاں گرا لیں۔''

آصفہ، صادقہ، نجمہ اور شگفتہ نے ہاتھ نیچے گرا لیا لیکن کمال اور میں اسی حالت میں بڑھتے رہے۔ تبھی صادقہ نے بہت بڑا کام کر دکھایا وہ مڑی اور دھائیں دھائیں کی آواز سے فضا کانپ اٹھی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور سیڑھیوں سے پھسلتا ہوا نیچے لڑھکا ہم سب پھرتی سے کنارے ہو گئے جب وہ لڑھکتا ہوا میرے نزدیک پہنچا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلاشنکوف کو روک لیا اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ تبھی نیچے سے فائر ہوا۔ صادقہ نے جوابی گولی چلائی۔ میں نے کاشن دیا۔ ''ہری اپ سب اوپر چلو۔'' خود بھی دوڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا میں نے ایک پہلی والی کلاشنکوف سنبھال لی اور نووارد کی کلاشنکوف کمال کو تھما دی۔ آصفہ نے زخمی کے دونوں پستول نکال لیے تھے۔ ایک اس نے نجمہ کو تھما دیا۔ میں نے اپنا پستول شگفتہ کو دے دیا ہم اوپر سے فائر کر رہے تھے اور نیچے سے وہ لوگ جم کر مقابلہ ہو رہا تھا۔ ہم پائپ کی جانب سے بھی ہوشیار تھے، کئی لوگوں نے چڑھنے کی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو لیا تھا، میں سمجھ رہا تھا کہ زیادہ دیر اور ٹھہرنا ممکن نہیں ہے گولیاں ختم ہوتے ہی ہم بھیگے چوہے کی طرح پھنس جائیں گے۔ اسی لیے میں نے اشارہ کیا کہ وہ سب سیڑھیوں سے نیچے اتریں۔ وہ سب پوزیشن لے کر نیچے

اترنے لگے۔ میں نے دیوار کے نزدیک پہنچ کر آخری برسٹ مارا اور خاموشی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ چار پانچ سیڑھیاں اترتے ہی لڑکھڑا گیا۔ نیچے سے ہینڈ گرینیڈ پھینکا گیا تھا۔ پوری عمارت لرز کر رہ گئی تھی۔ شاید چھت بھی ٹوٹی تھی۔ اگر ہم اوپر رہتے تو یقیناً زخمی ہو جاتے۔ ہم سب سیڑھیوں سے اتر کر آنگن میں آ گئے۔ دشمن لان میں مورچہ بند تھے۔ پچھلا دروازہ کھلا ہوا۔ ادھر کوئی بھی نہ تھا۔ ہم نے موقع سے فائدہ اٹھالیا اور باہر نکل آئے۔ دور دور تک چٹیل میدان تھا۔ اگر ہم دوڑتے بھی تو زیادہ دور نہ جا پاتے، دور سے ہی کسی گولی کا نشانہ بن جاتے۔ اس لیے آصفہ نے اشارے سے دیوار کی آڑ لے کر مین گیٹ کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

سہیل کے گرگے ابھی تک چھت کی جانب فائر کر رہے تھے۔ اس درمیان تین گرینیڈ بھی پھینکے جا چکے تھے۔ پھر بھی عقل کے ماروں کو اتنی سمجھ نہ آئی تھی کہ چھت چھلنی ہو چکی ہوگی۔ وہاں کوئی بھی نہ ہوگا۔ ان کی غفلت سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ ان پر برسٹ مارا، آٹھ کے آٹھوں لڑھک گئے۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر کرولنگ کرتے ہوئے لان میں داخل ہوا۔

سہیل کی بلٹ پروف کار وہاں نہ تھی۔ لگتا تھا کہ وہ پہلے ہی فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اطمینان کے لئے دروازے پر برسٹ مارا لیکن کسی جانب سے کوئی ہلچل محسوس نہ ہوئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھتے دیکھ کر کمال بھی آ گیا۔ انٹا غفیل پڑے آٹھوں کی جانب میں بڑھا۔ ان میں سے صرف ایک کی سانس چل رہی تھی۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کے لئے تڑاتڑ تھپڑوں کی بارش کی۔ وہ کراہتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''سہیل کہاں ہے؟''

''وہ...... شر......'' اس کے آگے کچھ کہہ نہ سکا اور لڑھک گیا۔ ہم نے اس کی وین پر قبضہ کیا اور باہر نکل آئے۔

''وین کو الٹی جانب لے چلو...... سڑک خطرناک ثابت ہوگی۔'' آصفہ نے کہا۔

کمال نے وین کا رخ تبدیل کر دیا۔ ہچکولے کھاتی وین اونچے نیچے راستے پر بڑھتی چلی گئی۔ کافی دور جانے کے بعد ہم نے دیکھا کہ شہر کی جانب سے کئی وین آگے پیچھے چلی آ رہی تھیں۔ یقیناً وہ سہیل کے گرگوں سے بھری ہوئی ہوں گی۔ کہیں وہ ہمیں دیکھ نہ لیں یہی سوچ کر میں نے کہا ''کمال وین کو کسی آڑ میں کھڑی کر دو۔''

''یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔'' اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ دوری پر ایک سوکھا تالاب نظر آیا۔ اسی گہری جگہ پر وین کھڑی کر کے کمال نے کہا ''دور سے دیکھے جانے کا خطرہ نہیں ہے پھر بھی ہمیں الگ الگ جگہوں پر پوزیشن لے کر بیٹھنا چاہیے۔''

اس کے خیال ظاہر کرتے ہی صادقہ، آصفہ، نجمہ پتھروں کی آڑ لینے کے لئے دوڑ گئیں۔ ان کے پاس پستولیں تھیں۔ کمال نے کلاشنکوف سے ایک بڑے سے پتھر کی جانب اشارہ کیا۔ ''میں تو ادھر جا رہا ہوں۔'' ہم سب پوزیشن لے کر بیٹھے تھے اور نگاہیں وینوں پر جمی تھیں۔ تینوں وین عمارت کی جانب بڑھتی جا رہی تھیں۔ پہلی وین عمارت میں داخل ہوئی اور پھر فوراً ہی یوٹرن ہو گئی اور آخری وین کے نزدیک جا کر رکی۔ دروازہ کھلا اور ڈرائیور اتر کر سامنے والی وین میں بیٹھے کسی شخص سے کچھ کہنے لگا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اندر کا حال بتا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس وین میں سے ایک شخص اترا اور اس نے چیخ کر کچھ کہا تھا۔ باقی دونوں وینوں سے بھی کئی شخص اتر کر اس کے آس پاس کھڑے ہو گئے۔ اس نے انہیں ہدایت دی اور خود جھک کر زمین پر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھنے لگا۔ وہ جوں جوں بڑھ رہا تھا ہمارے چہروں کی رنگت بدل رہی تھی، دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ ''ٹریگر پر انگلیاں اکڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم سب یکا یک بارود کی طرح بھک اٹھیں گے۔ بم کی طرح پھٹ پڑیں گے۔

جوں جوں وہ ہمارے نزدیک آ رہا تھا مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ موت نزدیک آتی جا رہی ہے اس کے ساتھ آنے والوں کی تعداد دس سے زائد تھی۔ میری نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں کہ آصفہ کی دبی دبی آواز سنائی دی۔

''گولیاں دیکھ بھال کر خرچ کرنا۔ ہمارے پاس گولیوں کا اسٹاک بالکل نہیں ہے۔ ایک بھی گولی برباد نہ ہو۔''

تبھی ہماری جانب گولیوں کا سیلاب امنڈا۔ ڈھیر ساری گولیاں ہمارے سامنے کھڑی پتھر کی چٹان سے ٹکرائیں، جواب میں کمال نے بھی برسٹ مارا۔ وہ سب اچھل اچھل کر پتھروں کے پیچھے چھپ گئے۔

''افسوس، ہمارے پاس گرینیڈ نہیں ہے۔'' صادقہ کی تیز بڑبڑاہٹ گونجی۔ ''تم میرے پیچھے آؤ۔'' کہتے ہوئے آصفہ نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ کچھ دور آ کر اس نے کہا۔ ''نگاہیں دوڑاؤ شاید کوئی بڑی سی ڈال نظر آ جائے۔''

''ڈال! ڈال سے کیا کرو گی؟''

''گول چٹان کو لڑھکانا چاہتی ہوں۔ اگر یہ چٹان لڑھکی تو سیدھی اس ڈھلان پر گرے گی جس پر وہ سب موجود ہیں۔ چٹان اتنی بڑی ہے کہ ایک کنکری تک اس کی مار سے بچ نہ پائے گی؟'' آصفہ کہتی چلی گئی۔ ''مجھے یقین ہے یہ چٹان اُن کے لئے موت کا ہرکارہ بن جائے گی۔''

''واہ! کمال کا آئیڈیا ہے۔''

''مگر آئیڈیا کا کیا کیا جائے۔ یہاں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ جس سے چٹان لڑھکائی جائے۔ گنوں کی بٹ یا کسی ہلکی چیز سے چٹان گرائی نہیں جا سکتی ہے۔ کاش اس وقت ہمارے پاس ایک بھی گرینیڈ ہوتا۔''

''سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے؟''

آصفہ بولی۔ ''دکھ کی بات تو یہی ہے کہ ہمارے پاس چٹان گرانے کا کوئی سامان نہیں ہے۔''

ڈھلوان کی طرف سے رہ رہ کر فائرنگ ہو رہی تھی ہم سمجھ رہے تھے کہ فائرنگ کی ہر آواز کے بعد وہ اور اوپر چڑھتے چلے آ رہے ہوں گے۔ کچھ توقف کے بعد آصفہ بولی۔

''ایک اور ترکیب دماغ میں آئی ہے حالانکہ وہ اتنی کارگر نہیں ہے جتنی چٹان والی تھی مگر پھر بھی کچھ نہ کر پانے سے تو بہتر ہی ہوگا۔''

''جلدی بولو۔''

مجھے کچھ بتانے کی بجائے وہ لپک کر وہاں پہنچی جہاں کمال اور صادقہ پوزیشنیں لئے فائرنگ کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ انہیں کچھ ہدایت دے کر پھر وہ واپس آ گئی۔

''کیا رہا آصفہ؟'' میں نے پوچھا ''کوئی ترکیب سوچی؟''

''ڈھلان پر جتنے بڑے بڑے پتھر ہیں ان کی جڑوں میں برسٹ مارو۔''

''اس کا فائدہ۔''

"نہیں اوپر آنے کی آڑ نہیں ملے گی۔"

"اسکیم بہت کمزور ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس گولیاں کم ہیں اور پتھروں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لئے بڑی مقدار میں گولیاں چاہئے۔"

"کوشش کرنا ضروری ہے۔" کہنے کے ساتھ آصفہ نے میرے ہاتھ سے کلاشنکوف لے کر برسٹ مارا۔ ریت ہوا میں اڑی مگر چٹان ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تبھی دوسری جانب سے کسی نے چیخ کر کہا۔ "باس وہ پاگل ہوگئے ہیں۔ بے مقصد گولیاں برباد کررہے ہیں۔"

"ان کے پاگل پن پر توجہ نہ دو، آگے بڑھو۔" کسی دوسرے نے ہدایت دی۔

آصفہ نے فائرنگ بند نہ کی تھی۔ بالآخر چٹان اکھڑ گئی اور لڑھکتی ہوئی میدان میں جاگری۔ مگر ہم جو چاہتے تھے وہ نہ ہوا۔ چٹان دوسری طرف جاگری تھی۔

"نہیں آصفہ" تبھی صادقہ بولی۔ "اس طرح گولیاں برباد کرنا عقلمندی نہیں ہے۔" آصفہ جھنجلا اٹھی۔ "اس کے علاوہ کر کیا سکتے ہیں۔"

کمال نے چٹکی بجائی۔ "میں کرسکتا ہوں۔"

"کیا؟"

"ایک کرشمہ۔" وہ مسکرایا۔ "تم سب یہیں ٹھہرو۔ میرا کرشمہ دیکھنے کے بعد تم بھی میری عقل کی داد دو گی۔"

"کیسا کرشمہ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ سننے میں نہیں دیکھنے میں مزہ آئے گا۔ آج میرا کمال دیکھو، مجھے صرف پندرہ منٹ چاہئیں۔ کسی بھی طرح انہیں پندرہ منٹ روک لو۔"

کہنے کے ساتھ ہی وہ داہنی جانب سرکتا چلا گیا۔ فوجیوں کے انداز میں وہ سینے کے بل کہنیوں کی مدد سے سانپ کی طرح رینگتا ہوا بڑھتا چلا جارہا تھا۔ تبھی ڈھلان کی جانب سے زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔ ہم سب جواب دینے میں مصروف ہوگئے۔ میری کلاشنکوف رہ رہ کر گولیوں کا مینہ برسا رہی تھی۔ میں گھوم گھوم کر برسٹ مار رہا تھا۔ گولیاں قریب الختم تھیں لیکن حوصلے بلند تھے۔ میری نگاہیں اس ٹیلے کی جانب تھیں جس کے پیچھے دشمن چھپے ہوئے تھے اور وقفے وقفے سے گولیاں چلا رہے تھے۔ تبھی ہم سب چونک اٹھے۔ ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایسا پاگل پن میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیسے کمال نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔ اگر مجھے ذرہ برابر بھی شک ہوتا تو میں اسے ہٹنے نہ دیتا۔ اُس نے رینگتے ہوئے ایک لمبا چکر کاٹا تھا اور ان کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔ ان کی پشت پر پہنچ کر اس نے للکارتے ہوئے دوڑ لگا دی تھی۔ کلاشنکوف کا برسٹ جاری تھا۔ انگارہ اگلتے کلاشنکوف کے ذریعے اس نے وہ کر دکھایا جو کسی صحیح العقل سے ممکن نہ تھا۔ دشمنوں نے اس پر بھی برسٹ مارا تھا۔ خون کی دھارا چھلتے میں نے بھی دیکھی تھی مگر وہ رکا نہیں تھا دوڑتا چلا گیا تھا۔ خودکشی کرنے والوں پر دو چار گولیاں کب اثر کرتی ہیں۔ مرتے مرتے وہ سب کو مار گیا تھا۔ اس کی جنونی کیفیت دیکھ کر صادقہ بھی مشین پستول سے فائر کرتی دوڑ پڑی تھی۔ کئی گولیاں اسے بھی لگی تھیں۔ مجھ پر تو گویا سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ کلاشنکوف کے ٹریگر پر انگلیاں اکڑ کر رہ گئی وہ اس وقت تک انگارہ اگلتی رہی جب تک میگزین خالی نہ ہوگیا۔ ٹیلے کی ایک جانب صادقہ پڑی تھی دوسری جانب کمال، دونوں خون میں غلطاں تھے۔ کافی وقت یوں ہی گزر گیا تب میں نے آصفہ کو



جھنجوڑا۔ "یہ...... یہ کیا ہوگیا۔"

اس نے چونک کر سر کو جھٹکا۔ "دیکھو...... شاید وہ زندہ ہوں۔"

میں نے سینے کے بل رینگنا شروع کردیا۔ چند گز کا فاصلہ میلوں کی دوری بن گیا تھا۔ پتھروں کی چبھن بے چین کیے دے رہی تھی لیکن سامنے چھپے دشمنوں کا خوف برداشت کرنے پر مجبور کررہا تھا۔

میں کھسکتا، رینگتا صادقہ کے نزدیک پہنچا۔ وہ تمام خطروں سے آزاد ہوگئی تھی۔ سر میں پیوست گولیوں نے اسے موت کی گود میں سلا دیا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد میں اور آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ ٹیلے کے نزدیک پہنچا۔ اس وقت میرا دل بے قابو ہورہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا سینے کا پنجر توڑ دے گا۔ اسی ٹیلے کے پیچھے تو دشمن تھے۔ کہیں وہ میرے نزدیک پہنچنے کے منتظر تو نہیں لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ ٹیلے کے پیچھے چھ لاشیں پڑی تھیں۔ ان سے کچھ دوری پر کمال آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اس کا جسم چھلنی ہورہا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچا اپنے پیارے دوست کو کندھے پر لادا۔

مجھے کھڑے ہوتے دیکھ کر آصفہ، نجمہ اور شگفتہ بھی کھڑی ہوگئیں اور میری جانب بڑھنے لگیں۔ آصفہ اور نجمہ نے اپنی پیاری سہیلی کو اٹھایا اور میرے ساتھ چلنے لگیں۔ نزدیک ہی ایک نالہ تھا۔ ہم نے فرار کے لیے اسے چنا تھا۔ اس پہاڑی نالے کے کنارے کئی گڑھے تھے انہی میں ان دونوں کو لٹایا اور بھاری دلوں سے ان پر مٹی ڈالنے لگے۔ دو قبریں بنانے کے بعد ہم نے دشمنوں کا اسلحہ جمع کیا اور چل پڑے۔ ہم پہاڑ کے اوپر چڑھ رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ پہاڑ کی دوسری جانب سڑک ہوگی۔

شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جارہا تھا اور چڑھائی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پہاڑ زیادہ اونچا نہیں تھا مگر ہم ٹوٹے ہوئے تھے، قدم منوں بھاری ہورہے تھے۔ تبھی شگفتہ بولی۔ "مجھ سے اب چلا نہیں جارہا ہے۔" اور وہ بیٹھ گئی۔

"پلیز شگفتہ، ہمت سے کام لو دوسری جانب سڑک ہوگی۔ کسی گاڑی والے سے لفٹ لے کر ہم جلد ہی شہر پہنچ جائیں گے۔"

"نہیں آصفہ! اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور تم سب نکل جاؤ۔"

"ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ یہیں کسی جگہ رات بسر کرلی جائے۔ یوں بھی رات میں گاڑیوں کا ملنا ممکن نہیں ہے۔" نجمہ نے کہا۔

میں نے ان دونوں کی جانب دیکھا۔ چہرے اترے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے معرکے کے بعد آگے بڑھنا واقعی ان کے لیے ناممکن تھا۔ اس لیے میں نے آصفہ سے کہا۔ "ایسا کرتے ہیں کہ یہیں ٹھہر جاتے ہیں صبح ہوتے ہی پھر چل پڑیں گے۔"

"اور اگر سہیل لاؤ لشکر کے ساتھ آگیا تب؟ معرکے کے وقت وہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مزید آدمیوں کو لانے کے لیے خاموشی سے نکل گیا تھا۔"

"قسمت کے لکھے کو کون ٹالے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

یکایک مجھے ایک جگہ غار نما گڑھا نظر آیا۔ میں اسی جانب بڑھ گیا۔ نزدیک پہنچ کر دیکھا وہ قدرتی سرنگ تھی۔ شاید کبھی زلزلے وغیرہ سے وہ سرنگ بن گئی ہوگی۔ میں نے انہیں آواز دی۔ ان کے نزدیک آتے ہی کہا۔

"اس غار میں رات بسر کی جاسکتی ہے۔"
"اور اگر اندر سانپ بچھو ہوئے تو؟" شگفتہ بولی۔
"موت باہر بھی ہے اور اندر بھی۔ آنی ہوگی تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔"
میری بات کا ان پر خاصا اثر پڑا اور سب سے پہلے شگفتہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے بعد میں۔ میرے پیچھے آصفہ اور نجمہ تھیں۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ماچس نکال کر جلائی۔ وہ ایک کشادہ غار تھا اور دور تک پھیلا تھا۔
"کیوں نہ ہم آگے بڑھیں؟" آصفہ نے کہا۔
"چلو۔ میں نے دوسری تیلی جلالی۔
"فکر نہ کرنا، میرے پاس دو لائٹر بھی ہیں۔" آصفہ نے کہا۔ "لاشوں کی تلاشی میں ملے ہیں۔"
"لائٹر جلالو، تیلیاں کم ہیں۔" میں نے مشورہ دیا۔
اس نے لائٹر جلالیا غار تنگ ہوتا جارہا تھا ہم سب آگے پیچھے بڑھتے جارہے تھے۔ کافی دور آگے جانے کے بعد ہمیں تازہ ہوا کا احساس ہوا۔
"شاید ہم دوسری جانب نکل آئے ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔
کسی نے جواب نہیں دیا۔ گیس لائٹر کی ہلکی روشنی میں سب بڑھتے رہے کچھ دور جاتے ہی ہمیں تاروں بھرا آسمان نظر آگیا۔ باہر آتے ہی مجھے ہنسی آگئی۔ ہم جہاں سے چلے تھے وہیں آگئے تھے۔ سرنگ چکر کھاتی ہوئی پہلے دہانے کے نزدیک ہی ختم ہوئی تھی۔
"یہ بھی اچھی رہی۔" آصفہ مسکرائی۔
"خیر تم تینوں سو جاؤ میں پہرہ دے رہا ہوں۔" میں نے مشورہ دیا۔
"نہیں!" آصفہ بولی۔ "ہم باری باری سے پہرہ دیں گے۔"
"ایسا کرو، کچھ دیر کے لیے میں سو لیتا ہوں۔ بارہ بجے اٹھا دینا کیونکہ پچھلے پہر جاگنا زیادہ مشکل ہے۔"
"ہاں ایسا ممکن ہے، تم سو جاؤ میں پہرہ دوں گی۔" آصفہ نے کہا۔ "میں وہیں کھردری زمین پر لیٹ گیا۔
کچھ دوری پر نجمہ اور شگفتہ بھی لیٹ گئیں۔ جسم تو پہلے ہی تھکا ہوا تھا کچھ ہی دیر میں نیند آگئی۔ کافی دیر تک میں سوتا رہا جھنجھوڑنے پر آنکھ کھلی۔ شگفتہ اور نجمہ بے خبر سو رہی تھیں۔
"میں نے ان دونوں کو بیدار نہیں کیا، وہ پھر سو جاتیں۔" کہتے ہوئے آصفہ لیٹ گئی۔
میں اٹھ کر غار کے دہانے پر چلا آیا۔
آسمان پر صبح کا تارا جگمگا رہا تھا۔ آصفہ نے جان بوجھ کر مجھے بیدار نہیں کیا تھا۔
نیند بھگانے کے لیے میں غار کے دہانے سے باہر نکل آیا اور چہل قدمی کرتے ہوئے شہر پہنچنے کے طریقہ کار پر غور کرنے لگا۔ یکایک میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی اور میں چونک گیا۔ کل اتنی فائرنگ ہوئی تھی پھر لوگ متوجہ کیوں نہیں ہوئے تھے۔ کہیں یہ جگہ آبادی سے کافی فاصلے پر تو نہیں ہے؟ اس نئے خیال نے مجھے پریشان کر دیا تھا، کہ پتا نہیں کتنا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑے گا۔ ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ایک دوسرے غار پر پڑی۔



پتا نہیں، کس خیال کے تحت میں اس میں داخل ہوگیا۔ آصفہ کا لائٹر میرے ہی پاس تھا۔ اسے میں نے جلا لیا۔ ہلکی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ یہ غار بھی پہلے والے کی طرح شیطان کی آنت تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد دوسرے سرے پر نکلا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس جگہ سے کافی دور نکل آیا تھا جہاں آصفہ وغیرہ تھیں۔ میں اس بار باہر سے ہی ان کے پاس پہنچا آصفہ ہنوز بیدار تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں گئے تھے؟"
"ایک اور غار دیکھا ہے۔ داہنی جانب بالکل قریب ہے اس کا دوسرا سرا کافی آگے ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"خیراب کہیں نہ جانا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔
میں وہیں غار کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ مشرقی افق پر سپیدی سحر نمودار ہو رہی تھی۔ پہلی بار ایسا منظر دیکھا تھا۔ شہر میں ایسا منظر کبھی کبھی ہی نظر آتا ہے اس لیے میں مبہوت سا بیٹھا تھا کہ چونک گیا۔
سامنے سے کئی گاڑیاں قطار در قطار چلی آرہی تھیں۔ ان چھ سوزوکی وجیپ میں سہیل کی کار نہ تھی۔ ان کا رخ ہماری جانب تھا میں سمجھ گیا کہ یہ سہیل کے گرگے ہیں اور اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے آرہے ہوں گے جب ان کی لاشیں دیکھیں گے تو بارود کی طرح بھبک اٹھیں گے۔ میں نے آصفہ کو پکارا۔ وہ کچی نیند میں تھی فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"تیار ہو جاؤ۔ مہمان آرہے ہیں ان کی خاطر داری کرنا ہے۔"
اس نے فوراً ہی نجمہ اور شگفتہ کو بھی بیدار کر دیا۔ سب نے کلاشنکوف سنبھال لی۔ نجمہ اور آصفہ پر تو بھروسا تھا مگر شگفتہ کے بارے میں شک تھا کہ وہ کلاشنکوف چلا بھی پائے گی کہ نہیں۔
ان کے تیار ہوتے ہی میں نے کہا۔ "آصفہ تم اور نجمہ برابر والے غار میں رینگتی ہوئی داخل ہو جاؤ تاکہ دوسرے سرے پر مورچہ بنا سکو۔"
میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ نجمہ کو ساتھ لے کر سینے کے بل رینگتی ہوئی برابر والے غار میں داخل ہو گئی۔
"شگفتہ تم غار میں پوزیشن لے کر بیٹھ جاؤ۔ میں باہر نکل کر مورچہ بنا رہا ہوں۔" میں بھی باہر نکل گیا۔ غار کے سامنے ہی ایک بڑی سی چٹان تھی۔ اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ اجالا پھیلتا جا رہا تھا اور دشمن نزدیک آتے جا رہے تھے۔ پہلے معرکے والی جگہ پر وہ سب رک گئے۔ ٹیلے کے پیچھے کا منظر نظروں سے اوجھل تھا۔ اس لیے دیکھ نہ پایا۔ یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ رہے ہوں گے۔ کچھ دیر بعد وہ آگے بڑھتے نظر آئے۔ آگے آگے چل رہا شخص جھک جھک کر زمین پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ نرم ریت پر ہمارے قدموں کے نشان دیکھ رہا ہوگا پھر اس نے ڈھلان پر آکر اپنے ساتھیوں کو پھیلا دیا۔ اس نے اس طرح پہاڑی کی گھیرا بندی کی تھی کہ چڑیا بھی پہاڑی سے نکل نہ سکے۔ ان کی نگاہیں ہمارے غار کی جانب لگی ہوئی تھیں اور ان کی گنوں کا رخ بھی ہماری جانب تھا۔ وہ سب بالکل تیار تھے۔
"انتظار کس بات کا ہے۔ آتش بازی شروع کر دو۔" شگفتہ نے کہا۔ وہ غار سے نکل آئی تھی اور میرے پیچھے سینے کے بل لیٹی تھی۔

"وقت آنے دو۔" میں نے کہا۔ "آج میں تمہارے ہاتھوں کا کمال بھی دیکھوں گا۔"

اس نے جواب نہیں دیا۔

سہیل کے گرگوں نے آہستہ آہستہ پیش قدمی شروع کردی۔ ابھی وہ غار کے نزدیک بھی نہ پہنچے تھے کہ آنے والے شخص نے دونوں ہتھیلی کو بھونپو کی طرح بنا کر منہ پر رکھا اور چیخ کر بولا۔ "ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ ورنہ ہمیں اپنی طاقت کا ٹریلر دکھانا پڑے گا۔"

"طاقت کا ٹریلر تو کیا دکھائے گا تجھے ہم دکھائے دیتے ہیں، لے دیکھ اسے ہینڈ گرینیڈ کہتے ہیں۔" نجمہ نے گرینیڈ اچھال دیا۔ "تمہارا گرینیڈ تم کو مبارک!"

زبردست دھماکے کے ساتھ وہ حصہ دھویں، آگ اور دھول سے اٹ گیا۔

"حملہ!" کسی نے چیخ کر کہا۔

ہر جانب سے برسٹ مارا جانے لگا۔ ان کا نشانہ اس غار کا دہانہ تھا جس میں آصفہ اور نجمہ بیٹھی تھیں۔

اگر اسے بے وقوفانہ حملہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، گولیاں صرف پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر چھترا رہی تھی۔

وہ پوزیشن ہی ایسی جگہ لیے ہوئے تھیں کہ کسی بھی طرف سے چلنے والی گولی ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی تھی لیکن عقل سے عاری دستہ دنا دن فائرنگ کیے جا رہا تھا۔ جواب میں وہ دونوں بھی وقفے وقفے سے گرینیڈ اچھال رہی تھیں۔ اب تک میں خاموش تھا۔ شگفتہ کو بھی روک رکھا تھا۔ مجھے شک سا ہونے لگا تھا کہ آصفہ زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے گی۔ میں نے اس کی مدد کرنے کی ٹھان لی مگر اپنی پوزیشن بتانے کے حق میں نہ تھا۔ میں نے شگفتہ سے کہا۔ "تم اس وقت تک خاموش رہو گی جب تک میں اشارہ نہ کروں۔" پھر میں نے سینے کے بل کھسکنا شروع کردیا۔ پتا نہیں خود میری عقل کو کیا ہو گیا تھا۔ اس کی مدد دوسری طرح سے بھی کرسکتا تھا ان کی توجہ ہٹانے کے لیے نیا محاذ کھول سکتا تھا مگر اس وقت یہ بات یاد نہ آئی اور میں کھسکتے ہوئے دوسرے غار میں داخل ہو گیا پھر دوڑتا ہوا اندر ہی اندر دوسری جانب پہنچا اگر میں پہلے ہی آصفہ کو پکار نہ لیتا تو وہ مجھ پر بھی فائر کردیتی۔

اس کے نزدیک پہنچ کر میں نے کہا۔ تم اپنی کلاشنکوف بھی دو۔ میں دراڑ میں پھنسا کر بیک وقت دونوں سے فائر کروں گا۔"

اس نے فوراً دے دی۔ میں رینگتا ہوا دہانے پر پہنچا پھر ایک دراڑ میں دونوں کی نالیاں فٹ کیں اور برسٹ مارا اسی وقت ڈھلان سے آواز آئی۔ "اگر شگفتہ کو بچانا چاہتے ہو تو بندوقیں پھینک دو۔"

"نہیں آصفہ! سرینڈر مت کرنا۔" شگفتہ چیخی۔ "اس کتے کی باتوں میں نہ آنا۔ تم لوگ میری پروا مت کرنا۔"

"تیری پروا کیسے نہ کریں شگفتہ!" نجمہ بڑبڑائی۔ "اگر تو نہ رہی تو یہ جنگ جیت کر ہم کیا کریں گے۔ دو کا زخم کیا کم ہے کہ تیسرا زخم بھی اٹھالیں۔" پھر وہ میری جانب مڑ کر بولی۔ "ہاتھ اٹھا کلاشنکوف پھینک کر میرے ساتھ باہر چلو۔" پتا نہیں اس کی آواز میں ایسا کیا جادو تھا۔ میں نے اپنی کلاشنکوف پھینک کر ہاتھ اٹھا دیے۔ میرے ساتھ آصفہ بھی باہر نکل آئی ہم سب ہاتھ اٹھائے قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔

شگفتہ پھر چیخی "نہیں نہیں تم سب ایسی بے وقوفی نہ کرو۔"



مگر ہم نے اس کی بات پر کان نہ دھرا۔

شگفتہ چیخ چیخ کر ہمیں رکنے کو کہہ رہی تھی لیکن ہم سب آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ میری نگاہیں اس شخص پر جمی تھیں جس نے شگفتہ کی کنپٹی پر پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ اس نے جھلا کر کہا۔ "تو گلا پھاڑنا بند کرے گی یا نہیں؟"

"نہیں! تو کیا کرلے گا؟"

"میں...... میں تجھے گولی مار دوں گا۔"

"تو...... تو مجھے گولی مارے گا؟" شگفتہ غرا اٹھی۔ "اور تو مجھے گولی مار دے گا تو ان کو کیسے سنبھالے گا جو دم بہ دم بڑھتے آرہے ہیں ان کے ہاتھ صرف اس لئے اٹھے ہوئے ہیں کہ مجھے کچھ نہ ہو، اگر تو نے ذرا بھی بدسلوکی کی تو یہ تجھے پھاڑ کر رکھ دیں گے۔"

وہ شخص سمجھ گیا۔ شگفتہ کی باتوں میں صرف سچائی ہی سچائی تھی وہ بولنا بھی چاہتا تو بول نہ پاتا۔

تبھی شگفتہ نے ایک ایسی حرکت کردی جسے کوئی بھی صحیح العقل نہیں کرسکتا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ ہم سب اس کی خاطر موت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اس نے موت کی پروا کئے بغیر ہاتھ گھما دیا تھا۔ ریوالور دور جا گرا تھا اور اس نے سرعت سے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں پھنسا دیئے تھے۔ وہ شخص بوکھلا گیا تھا۔ چاروں طرف کھڑے اس کے گرگے سکتے کے عالم میں کھڑے رہ گئے، ہڑبڑا کر اس شخص نے شگفتہ کے ہاتھ کو گردن سے ہٹانے کی کوشش لیکن ناکام رہا شاید شگفتہ نے جان کی بازی لگادی تھی اس لئے اس کی نسیں اکڑ سی گئی تھیں اور اس شخص کی سانس رکنے لگی تھی وہ آزادی کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن ناکامی اس کا مقدر تھی۔ اس کے ساتھیوں کی گنوں کا رخ ہماری طرف سے ہٹ کر شگفتہ کی طرف ہو گیا تھا۔

وہ شخص کچھ کہنا چاہتا تھا مگر غوں غوں کے علاوہ ایک بھی لفظ نہ نکلا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا تبھی ایک شخص نے دہاڑ کر کہا۔ "کمانڈر کو چھوڑ دے لڑکی ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔" شگفتہ نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بولی۔ "چلا گولی میں بھی دیکھوں تجھ میں کتنا دم خم ہے۔"

شاید وہ یہی چاہتی تھی۔ ہمیں بچانے کے لئے اپنی جان قربان کردینا چاہتی تھی تبھی تو وہ بار بار انہیں اُکسا رہی تھی۔ میں نے اسے روکنے کے لئے چیخ کر کہا۔ "تو...... تو کیا پاگل ہو گئی ہے۔"

تبھی کوئی چیخا "یہ...... یہ لڑکی پاگل ہو گئی ہے مار ڈالو اسے فائر۔"

ایک بار پھر بندوقیں گرجیں شگفتہ نے چھلانگ لگادی۔ شگفتہ کو گرتے دیکھ کر ہم سب بے ساختہ چیخے۔

"شگفتہ۔"

کہانی عروج پر تھی کہ وہی لڑکی جو ہمیں کمرے تک لائی تھی اند آئی اور ہنستے ہوئے بولی "اگر آپ لوگوں کی باتیں ختم ہو گئی ہوں تو چلیے سب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

آگے کا احوال جاننے کے لیے
اگلی قسط آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



خلیل جبار

# کیسے کٹے تنہائی

محسن بھٹی کا خیال

قتل ہی اب میری امیدوں کا
اے میرے چاہنے والے کردے

**تنہائی سے اکتائی ایک بیوی کی روداد اس نے چور راستہ ڈھونڈا تھا**



میں خاموشی سے بیٹھا خبریں بنانے میں مصروف تھا۔ میرے سامنے والی ٹیبل پر سہیل انصاری پریس ریلیز بناتے ہوئے کئی بار مجھے دیکھ چکا تھا۔ جب اس سے رہا نہ گیا تو وہ بول ہی پڑا۔

’’کیا بات ہے، بڑی خاموشی سے کام ہو رہا ہے۔ اردگرد کا بالکل ہوش نہیں۔ تمہارے سامنے اتنا سینئر رپورٹر بیٹھا ہوا ہے۔‘‘

’’کبھی کبھی انسان کو خاموش بھی رہنا چاہیے۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’لیکن یار، کوئی بات ضرور ہے ورنہ تم اتنے سنجیدہ رہنے والے نہیں ہو؟‘‘

’’سہیل بھائی، تم بھی نا، بال کی کھال نکالنے والوں میں سے ہو۔ میں ایک اہم خبر بنانے میں مصروف ہوں، شہر میں ایک اور عورت قتل ہوگئی ہے۔‘‘ میں نے اپنی بات میں سسپنس پیدا کرتے ہوئے کہا۔

’’عورتوں کے قتل ہوتے ہی رہتے ہیں، اس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کون سی بات ہے؟‘‘

’’سہیل بھائی، مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے بال کہاں سفید کیے ہیں؟‘‘

’’اوئے، خاموش، یہ کیا بول رہے ہو؟‘‘ وہ رازدارانہ انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ’’رات ہی میں نے اپنی بیٹی سے بال کالے کروائے ہیں، کسی نے سن لیا تو دفتر میں میرا ریکارڈ لگ جائے گا۔‘‘

’’تم بھی مجھے غصہ دلانے والی بات کرتے ہو اس لیے میرے منہ سے سچی بات نکل جاتی ہے۔ شہر میں قتل ہوگیا ہے، قتل کے ساتھ مجھے چھوٹی چھوٹی چند خبریں قتل کے متعلق بنانی ہوتی ہیں، جب ہی خبر کا بکس بنتا ہے اس لیے خبر پر زیادہ محنت لگتی ہے۔‘‘

’’ہاں، ہاں، میں یہ سب سمجھتا ہوں لیکن مجھے تمہاری خاموشی پر اعتراض ہے۔‘‘ سہیل انصاری نے کہا۔

’’میں خاموش نہیں، اداس ہوگیا ہوں۔‘‘

’’بیوی کسی کی مری ہے، اداس عقیل بھائی ہو رہے ہیں؟‘‘

’’ہاں، میں اداس ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ارے بھئی، کیوں اداس ہو؟‘‘

’’سہیل بھائی، جو عورت قتل ہوئی ہے، وہ بہت خوبصورت تھی اور اس کا شوہر بھی خوبصورت تھا۔‘‘

’’تم اداس اس کے شوہر کے خوبصورت ہونے پر ہو یا اس کی بیوی کے؟‘‘ سہیل نے معنی خیز انداز میں مجھے گھورا۔

’’سہیل بھائی، میں تمہیں کیا کہوں؟‘‘ میں نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔

’’عقیل بیٹے، تم مجھے کچھ نہ کہو جو تم سے پوچھ رہا ہوں، وہ بتا دو۔‘‘ سہیل انصاری نے یہ کہتے ہوئے حسبِ عادت اپنا چشمہ درست کیا۔

’’سہیل بھائی، اُن دونوں نے پسند کی شادی تین سال قبل کی تھی اور اب اس کے شوہر نے ہی اپنی من پسند بیوی کو قتل کردیا۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ آخر اُس کے شوہر نے کیوں اُسے قتل کردیا؟‘‘

’’تم وجہ معلوم کرلیتے نا؟‘‘

’’اپنے ماموں سے وجہ معلوم کرتا۔‘‘ میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔ ’’جس نے قتل کیا، وہی وجہ بتا سکتا ہے اور وہ قتل کرکے روپوش ہوگیا ہے۔‘‘

’’بڑا افسوس ہوا یہ سن کر کہ قاتل روپوش ہوگیا ہے۔ تمہیں اس کے گرفتار ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ گرفتار ہونے پر وہ سب کچھ پولیس کے

سامنے فرفر اگل دے گا۔"

"ہماری پولیس کے سامنے ہر ملزم اپنے جرم کا اقرار کر لیتا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"عقیل بیٹے! تمہیں آج اتنی اچھی خبر ملی ہے پھر کچھ ہو جائے۔"

"بس، بس، خاموش رہیے، مجھے سب پتا ہے، میرے آنے سے پہلے آپ دو کپ چائے پی کر بیٹھے ہیں۔ تیسرے کپ کی آس مت لگائیے۔" میں نے کہا۔

سہیل انصاری اپنا راز کھلنے پر خاموشی سے پریس ریلیز بنانے میں مصروف ہو گئے۔

اخبار کا کام ہی ایسا ہے، ہم اچھی خبروں کی تلاش میں دن کا چین، رات کا سکون برباد کیے رہتے ہیں۔ اچھی خبریں ملنے پر خوشی بھی ہوتی ہے اور بعض دفعہ کوئی اچھی خبر افسردہ بھی کر جاتی ہے۔ میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اِن پانچ برسوں میں، میں اپنے بیوی بچوں کو کسی تفریحی مقامات پر لے گیا ہوں۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں بیگم نے گھومنے پھرنے کی فرمائش کی تھی لیکن میری اخباری مصروفیات کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنی خواہش ترک کر دی۔ وہ بھی سمجھ چکی تھی کہ کرائم رپورٹر کی جاب پولیس کی طرح چوبیس گھنٹے کی ہوتی ہے، جیسے ہی کسی خاص خبر کی اطلاع ملتی ہے، فوراً ہی بھاگنا پڑتا ہے۔ ٹی وی چینل کے مقابلے میں یہ سکون حاصل ہے کہ ہیڈ آفس بھیجنے کا وقت مقرر ہے۔ ٹی وی چینل کے رپورٹر کو خبر فوراً اپنے آفس بھیجنا ہوتی ہے۔ ان کے چینل سے پہلے کسی اور چینل سے خبر چل جائے تو جواب طلبی ہو جاتی ہے۔

مجھے خود بھی اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں اپنی فیملی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہا ہوں۔ انہیں تفریحی مقامات پر یا عزیز رشتے داروں کی تقریبات میں لے کر جانا چاہیے، بیگم کو وقت دینا چاہیے، اُس سے مختلف موضوعات پر باتیں کرنا چاہئیں۔ اس طرح بیگم خوش رہتی ہے اور اپنے گھریلو کام خوشی خوشی کرتی ہے۔ شوہر کے گھر آنے کی منتظر رہتی ہے لیکن میں ان سب باتوں کو سمجھتے ہوئے بھی مجبور تھا۔ ہر وقت میرے ذہن پر اچھی خبروں کی تلاش سوار رہتی تھی۔ رات گئے گھر پہنچنے پر تھکن سے چور بستر پر لیٹتے ہی خوابِ خرگوش کے مزے لینے لگتا تھا۔ صبح دیر سے بیدار ہوتے ہی دوسرے اخبارات چیک کرنے لگ جاتا کہ کہیں مجھ سے کوئی خبر رہ تو نہیں گئی اور یہ دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرا دیتا کہ کسی اور اخبار کے رپورٹر نے کوئی اہم خبر مس کر دی ہوتی تھی۔ میرا سیروں خون بڑھ جاتا تھا، گویا کل میری پرفارمنس بہت اچھی رہی تھی۔ اخبارات کے مطالعے سے فارغ ہو کر میں جلدی جلدی تیار ہو کر ناشتہ کرتا اور پھر مجھ پر کام کی دھن سوار ہو جانے پر گھر سے نکل جاتا۔ یہی میرا معمول تھا۔ کبھی کبھی جب میرا دل ملامت کرتا کہ میں یہ اچھا نہیں کر رہا ہوں، گھر کو توجہ دینی چاہیے تو میں دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتا کہ گھر میں جو آسائشیں ہیں، وہ اس نوکری کے دم سے ہیں، یہ نوکری نہ ہو تو بیگم طعنے دے دے کر میری زندگی اجیرن کر دے۔

عورت کے قتل والے واقعہ کو کئی دن گزر چکے تھے لیکن قاتل شوہر کو پولیس گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ صبح کا وقت تھا اور میں ابھی ناشتہ کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ خالد کی کال تھی۔

"ارے میرے بھائی! اتنی صبح صبح کیسے یاد کر لیا؟" میں نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔

"تم ابھی تک سو رہے ہو اور ایک اچھی خبر تمہاری منتظر ہے؟" خالد نے کہا۔

"اچھا، کیا خبر ہے؟"

"چند دن قبل شوہر کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی عورت کے شوہر کو پولیس نے رات ایک مکان پر چھاپہ مار کر گرفتار کر لیا ہے اور اسے ریمانڈ کے لیے سول عدالت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ کیوں، ہے نا خبر؟" خالد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، واقعی خبر زبردست ہے۔ میں ابھی پانچ منٹ میں کورٹ پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ارے، اتنی جلدی بھی کیا ہے، ناشتہ کر کے آ جاؤ۔ میں تمہیں ناشتہ نہیں کرا سکوں گا کیونکہ میں بٹوہ جلدی میں گھر بھول آیا ہوں۔" خالد نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا ہے، کورٹ کی کینٹین والوں سے تمہاری دُعا، سَلام بہت اچھی ہے۔" میں نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی گھر سے ناشتہ کرنے میں کون سی دیر لگے گی اور پولیس والے ملزم کو اتنی جلدی لے کر نہیں جائیں گے۔"

"بس ناشتے کے نام سے گھبرا گئے؟ میں ناشتہ کر چکا ہوں، تم بے فکر رہو۔"

"اچھا، اچھا پھر صحیح ہے۔" خالد نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

میں اپنی بائیک پر سول کورٹ پہنچ گیا۔ پولیس ملزم جمشید کو عدالت میں پیش کر کے تین دن کا ریمانڈ لے چکی تھی۔ کاغذی کارروائی مکمل ہو جانے پر ملزم جمشید کو تھانے لے جایا جاتا۔

تھانے کا اے ایس آئی فاروق میرا دوست تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ "تم پریس والوں کو کیسے خبر ہو جاتی ہے؟ ہم نے کسی کو بھی ملزم کی گرفتاری کی خبر نہیں دی ہے؟"

"پریس والے اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔" میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"ہاں، واقعی اس میں کوئی شک نہیں، تم لوگوں سے کوئی خبر چھپ نہیں سکتی۔"

"فاروق بھائی، مجھے ملزم سے کچھ بات کرنی ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی کاغذی کارروائی میں وقت لگے گا، جب تک تم ملزم جمشید سے بات چیت کر سکتے ہو۔" اے ایس آئی فاروق نے کہا۔

ملزم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور وہ دو پولیس والوں کے ساتھ عدالت کے باہر بچھی بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ خالد اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کر رہا تھا۔

"جمشید! میرا تعلق پریس سے ہے، میں تم سے قتل کے متعلق کچھ بات کرنا چاہتا ہوں؟" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

وہ کھوئے کھوئے انداز سے مجھے دیکھنے لگا۔

"تم نے اپنی بیوی مہر النساء کا قتل کر دیا، اس سے میری کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ یہ بات ہم پہلے ہی چھاپ چکے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں مہر النساء سے محبت ہوئی، تم نے شادی بھی کی پھر ایسی کیا بات ہوئی کہ جس سے تمہیں اتنی شدید محبت تھی، تم نے اسے قتل کر دیا، کیوں؟" میں نے کیوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"گزری باتوں سے کیا حاصل ہو گا، مہر النساء سے میں نے عشق کیا، شادی کی، یہ میری دیوانگی تھی۔ اُسے قتل کر دیا، یہ میری حماقت تھی۔" جمشید نے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم سے یہ پوچھنے کا مقصد ہی یہی ہے تا کہ کوئی اور ایسی دیوانگی اور حماقت نہ کر سکے۔ شادی کے بعد گھر میں ایسے اسباب پیدا نہ ہونے دے کہ اُسے

اپنی بیوی کو قتل کرنے کی نوبت آسکے۔"

"میری کہانی کچھ لمبی ہے۔" اس نے کہا۔

"مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے، تفصیل سے بتا دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"میں بڑھئی کا کام کرتا ہوں، ہم لوگوں کا کام مختلف نوعیت کا ہے۔ میرے استاد ضمیر الدین اپنے کام میں بڑی شہرت رکھتے ہیں، وہ بنگلوں میں فرنیچر کی سیٹنگ، الماریاں اور لکڑیاں لگانے اور لکڑی کی دیگر آرائش و زیبائش کے کام کا ٹھیکہ پکڑتا ہے۔ اس کے کئی شاگرد ہیں۔ اس کام کے سلسلے میں اسے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جانا پڑتا ہے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے، ہمیں راولپنڈی میں ایک بنگلے پر کام کا ٹھیکہ ملا تھا۔ ہم نے وہاں کام کے مکمل ہوجانے پر پروگرام بنایا کہ دامنِ کوہ کی سیر کی جائے۔ مری اور دیگر مقامات کی سیر کام کے دوران ملنے والی چھٹیوں میں ہم نے پہلے ہی کرلی تھی۔ دامنِ کوہ نہیں جاسکے تھے اس لیے یہ طے پایا کہ جس دن اپنے شہر کو روانہ ہوں گے، اُس سے ایک دن پہلے دامنِ کوہ جائیں گے۔

صبح ہماری روانگی تھی اس لیے شام میں ہم دامنِ کوہ میں تھے۔ وہاں ایک فیملی بھی آئی ہوئی تھی۔ اُن میں خواتین اور لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی جبکہ مرد ایک ہی تھا۔ لڑکیاں آپس میں خوب مذاق کررہی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر اچھل کود اور شور مچا رہی تھیں۔ اُن لڑکیوں میں ایک بہت خوبصورت لڑکی بھی تھی جو بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ خوب ہلہ گلہ کررہی تھی۔ اچانک ایک بلی نے جیسے ہی اس کے پاؤں کے پاس میاؤں کی، وہ گھبرا کر اتنے زور سے اچھلی کہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور توازن بگڑنے پر مجھ پر آگری۔ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس کے وزن سے میں بھی زمین پر گر پڑا۔ اب وہ میرے اوپر تھی اور میں نیچے۔ وہاں موجود سب لوگوں کی توجہ ہم دونوں پر ہوگئی تھی اس لیے وہ لڑکی بری طرح جھینپ گئی اور فوراً ہی سنبھلتے ہوئے اٹھ گئی۔ میں ہکا بکا یہ سوچتا رہ گیا تھا کہ یہ کیا ہوگیا اور کئی منٹ میں اس کے لمس کے احساس میں مبتلا رہا اور پھر میں بھی شرمندہ شرمندہ زمین سے اٹھا اور اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ لڑکیاں آپس میں باتیں ضرور کررہی تھیں لیکن وہ شور شرابہ کرنا بھول گئی تھیں۔ میری اور اُس لڑکی کی جب بھی آنکھیں ملتیں، ہم دونوں ہی شرما کر نظریں نیچے کرلیتے۔ بنگلے تک پہنچنے پر میرا استاد اور میرے ساتھی مجھے چھیڑتے رہے۔ ہم جن بنگلوں پر کام کرتے ہیں، وہیں ہماری رہائش کا انتظام بھی ہوتا ہے۔

"جمشید، کیا حسین اتفاق تھا۔" استاد ضمیر الدین نے مجھے چھیڑا۔

"استاد، کبھی ہمارے ساتھ ایسا اتفاق نہیں ہوتا۔" کاشف نے استاد کو آنکھ ماری۔

"تمہارے استاد کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا تو تمہارے ساتھ کیسے ہوسکتا ہے؟" استاد نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"استاد، وہ ایک اتفاق تھا۔" میں نے کہنا چاہا۔

"ہم کب کہہ رہے ہیں، وہ جان بوجھ کر تم پر گری تھی؟ ہم تو اپنی قسمت کو کوس رہے ہیں کہ زندگی میں ہمارے ساتھ ایسا اتفاق کیوں نہیں ہوا؟" استاد ضمیر الدین نے کہا۔

جب تک ہم سو نہیں گئے، استاد اور میرے ساتھی مجھ سے لڑکی والے معاملے پر مذاق کرتے رہے اور میں ہار مانتے ہوئے بستر پر ایسا بن گیا جیسے گہری نیند میں ہوں، تب کہیں جا کر میری جان چھوٹی۔

صبح ہم حیدر آباد جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوگئے۔ میری عادت تھی، میں سفر میں کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر بیٹھتا تھا۔ اس بار بھی کھڑکی کے پاس ہی بیٹھا گزرتے حسین منظر دیکھ رہا تھا۔ ٹرین کو چلتے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ مجھے اونگھ سی آنے لگی تھی، میری آنکھ لگ گئی۔ نجانے میں کتنی دیر سوتا رہا۔ اچانک میرے منہ پر پانی کے چھینٹے پڑے، میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ آگے کی کھڑکی سے پانی پھینکا گیا تھا۔ میں سخت غصے میں سیٹ سے اٹھا اور شور کرتا ہوا وہاں پہنچا۔

"کس جاہل نے پانی پھینکا ہے؟"

"جج...... جج...... جی، یہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔" ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا، وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی جو دامنِ کوہ میں مجھ پر گری تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی اور وہ سخت گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ دوسری سیٹوں پر اس کی فیملی موجود تھی، اُسے دیکھ کر میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور میں صرف یہ کہتے ہوئے پلٹ پڑا۔

"اچھا تو یہ بھی تمہاری حرکت تھی؟"

مجھے دیکھ کر استاد نے کہا۔ "کیا ہوا جمشید، تو بڑا غصے میں گیا تھا، مجھے لگ رہا تھا، دوچار کو پچھاڑ کر ہی آئے گا لیکن لڑکیوں کی طرح شرماتا ہوا واپس آگیا ہے۔"

"کہیں پھر کوئی لڑکی تو نہیں ٹکرا گئی؟" نعمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لڑکی کا ٹکرانا ضروری ہے کیا؟ دیکھ کر کام نہیں چل سکتا؟" میں مسکرایا۔

"اوئے، جمشید گیا کام سے، تم لوگ اس کی شادی کے چاول کھانے کی تیاری کرو۔" استاد نے قہقہہ لگایا۔

"استاد، چاول کھانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں، چاول کھانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔" استاد نے آنکھ ماری۔

مجھے وہ لڑکی کیا نظر آگئی تھی، میرا سفر خوشگوار ہوگیا تھا۔ میں وقفے وقفے سے باتھ روم جانے کے بہانے وہاں سے گزرنے لگا اور ایک جھلک اُس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ استاد اور میرے ساتھی مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ آخر استاد سے نہ رہا گیا۔

"کیوں جمشید، خیریت ہے، آج یہ تجھے حاجت زیادہ نہیں آرہی ہے؟"

"استاد، پتا نہیں، کیوں ایسا ہورہا ہے؟" میں نے بات بنائی۔

"استاد، وہاں چیز ہی ایسی موجود ہے، یہ بار بار وہاں نہیں جائے گا تو کہاں جائے گا۔" حبیب نے کہا۔

"کیا...... کیا...... کیا کہہ رہے ہو بھئی؟" استاد نے حیرت سے پوچھا۔

"استاد، وہاں وہی لڑکی اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھی ہے جو دامنِ کوہ میں جمشید پر گر کر اسے دیوانہ بنا گئی تھی۔" حبیب نے کہا۔

"ایسی کام کی بات تمہیں کیسے پتا چلی؟" استاد نے پوچھا۔

"استاد، جب جمشید بار بار اُس طرف جارہا تھا، ہمیں شک ہوا اور ہم نے اُس حسینہ اور اُس کی فیملی کو وہاں دیکھ لیا۔" نعمان نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"اس کا مطلب ہے، جمشید پر قسمت مہربان ہے۔" استاد نے میری طرف دیکھا۔ میں اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ شرمندہ سا ہوگیا۔ استاد نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ "ارے، میرا شاگرد ہو کر شرما رہا ہے؟ عشق مرد ہی کرتے ہیں اور بزدل پیچھا کرکے راز لیتے ہیں۔"

''استاد' ہم پر چوٹ؟'' نعمان زور سے بولا۔
''ابے' میرا شاگرد عشق کر رہا ہے اور تم اس کا حوصلہ بڑھانے کے بجائے اسے شرمندہ کرنا چاہتے ہو؟ تم بھی ٹرین میں کوئی لڑکی تلاش کر لو۔'' استاد نے کہا۔
استاد کی حوصلہ افزائی پر میرا سینہ فخر سے تن گیا۔ میرے ساتھی جو میرا مذاق اڑانے کے موڈ میں تھے' ان کے چہرے بجھ گئے۔ اب میں انہیں بتا بتا کر جانے لگا۔ وہ مجھے غصے سے دیکھنے لگے تھے۔ میں اُس لڑکی سے بات کر کے موبائل نمبر حاصل کرنا چاہتا تھا اور وہ مقصد رات میں حل ہو گیا۔ میں باتھ روم سے جیسے ہی باہر آیا' وہ اکیلی کھڑی تھی۔ اُس وقت وہاں کوئی بھی مسافر نہیں تھا' سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔
''ایسا کیا کھا لیا جو آپ کو بار بار آنا پڑ رہا ہے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
''تمہاری ایک جھلک دیکھنے کو یہ بہانہ کرنا پڑ رہا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔
''ایسا مجھ میں کیا ہے جو تم بے چین ہو؟'' وہ بولی۔
''کچھ تو ہے تبھی بار بار آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''ٹرین کا سفر ختم ہونے پر کیا کرو گے؟'' اس نے سوال کیا۔
''پھر موبائل کا سہارا لینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔
''تمہارے پاس میرا نمبر ہے؟'' وہ حیرانی سے بولی۔
''ہے نہیں' لوں گا۔''
''کس سے؟'' وہ زور سے ہنسی۔
''تم سے ہی لوں گا' [illegible] ے والدین سے نمبر مانگ کر مجھے جوتے کھانے ہیں؟'' میں نے کہا۔
''کبھی کبھی جوتے بھی کھا لینا چاہئیں۔'' وہ چہکی۔
''ارے نا بابا' جوتے کھانے سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
''عشق کرنے چلے ہو اور جوتے کھانے سے ڈرتے ہو' عاشق تو نہ جانے کتنی مار کھائے پھر بھی اُن کے سر سے عشق کا بھوت نہیں اترتا۔''
''میں اس معاملے میں بڑا بزدل ہوں۔''
''پھر مجھ سے کیسے عشق کرو گے؟''
''تمہاری خاطر بہادر بننا پڑے گا۔'' میں نے سینہ تانتے ہوئے کہا۔
''یہ تم نے مردوں والی بات کی ہے۔'' وہ بولی۔
''کہیں ایسا نہ ہو' باتوں باتوں میں موبائل نمبر لینا بھول جاؤں؟ اپنا نمبر لکھوا دو۔'' میں نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ اس نے خوشی خوشی اپنا نمبر دے دیا۔ میں نے اسے موبائل میں محفوظ کر لیا۔ میں اب مطمئن ہو کر اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے اب بار بار باتھ روم جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔
حیدر آباد آنے پر ہم سب اتر گئے جبکہ وہ فیملی کراچی کی تھی۔ ہم اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔ گھر پہنچ کر پہلی بار مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے۔ میں اُس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ میرے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔ اب میں فرصت ملتے ہی اُس سے بات چیت کرنے لگتا۔ اُس کا نام مہر النساء تھا۔ وہ گھر میں اپنی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی بڑی بہنوں کی ابھی شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ وہ راولپنڈی میں اپنے ایک عزیز کی شادی میں گئی تھیں اور شادی سے فارغ ہونے پر ہمارے ساتھ ہی ٹرین میں کراچی چلی گئی



تھیں۔ میں اُسے اپنانا چاہتا تھا۔ اتنی جلدی اُس کی شادی ممکن نہیں تھی۔ گھر والے پہلے بڑی بہنوں کی شادی کرنا چاہتے تھے اور انہیں رشتے کی تلاش تھی لیکن اچھے رشتے اتنی جلدی کہاں ملتے ہیں مگر مہر النساء کے بغیر میرا جینا دوبھر ہو گیا تھا۔ میں نے جب اپنے گھر والوں سے بات کی تو انہوں نے اس شادی سے انکار کرتے ہوئے برادری کی کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے پر زور دیا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ مہر النساء کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے والدین بھی کسی صورت مجھ سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مجبوراً ہمیں انتہائی قدم کورٹ میرج اٹھانا پڑا۔ مہر النساء اپنا گھر چھوڑ کر حیدر آباد چلی آئی۔ میرے گھر والے اسے کسی قیمت پر رکھنے کو تیار نہ تھے۔ ایسے میں کرائے کا مکان لے کر ہم دونوں نے رہنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دنوں بعد جب گھر والے راضی اور تیار ہو جائیں گے تو پھر اسے اپنے گھر لے جاؤں گا۔ میرا کام ایسا تھا' استاد کو جس شہر میں بھی بنگلے آرائش و زیبائش کا کام ملتا تھا' ہمیں وہاں لے کر چلا جاتا' جب تک کام مکمل نہیں ہو جاتا' ہمیں وہیں رہنا پڑتا۔ ایسے میں وہ کس طرح گھر میں اکیلی رہ سکتی تھی؟ شادی کے چھ ماہ تک استاد کو کام کے ٹھیکے شہر میں ہی ملتے رہے۔ اس طرح میں مہر النساء کے قریب ہی رہا پھر جب دوسرے شہر میں کام کا ٹھیکہ ملا تو مہر النساء پریشان ہو گئی۔
''تم مت جاؤ' یہیں کوئی کام ڈھونڈ لو۔'' اس نے کہا۔
''ہمارا کام ایسا نہیں ہے جو اس شہر میں کام ملتا رہے' مختلف بنگلوں پر جا کر کام کرنا پڑتا ہے۔ حیدر آباد میں اتنے بنگلے کہاں بنتے ہیں؟'' میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔
''میں کچھ نہیں جانتی' بس تمہیں کہیں نہیں جانا' یہیں رہو' جو روکھی سوکھی ملے گی' ہم گزارہ کر لیں گے۔'' اس نے کہا۔
مہر النساء کی بات پر میں پریشان ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کیسے سمجھاؤں؟ استاد کو جب میں نے یہ بات بتائی تو وہ بھی فکر مند ہو گیا۔
''جمشید' بات وہ ٹھیک کہہ رہی ہے' ہمارا کام ایسا ہے کہ مہینوں گھر سے دور رہتے ہیں۔ ایسے میں وہ بے چاری کیسے اکیلے وقت گزارے گی؟ تم ایسا کرو' اپنے گھر والوں سے بات کرو' وہ اگر نرم ہو جائیں تو اُسے والدین کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ نہیں مانتے تو پھر میں تمہیں اپنے ایک دوست کے فرنیچر کے کارخانے پر لگوا دیتا ہوں۔ وہاں کام زیادہ کرنا پڑے گا' مزدوری کم ملے گی لیکن فائدہ یہ ہو گا کہ تم گھر سے دور نہیں رہو گے۔'' استاد نے کہا۔
مجھے استاد کی یہ تجویز اچھی لگی اور میں استاد کے دوست محمد رفیق کے کارخانے پر کام کرنے لگا۔ مہنگائی کے اس دور میں کرائے کے مکان میں رہنا آسان کام نہیں ہوتا۔ مجھے مقررہ وقت کے بعد بھی کام کرنا پڑ رہا تھا۔ شروع سے میرا اصول تھا کہ چھٹی کے دن کام نہیں کرتا تھا لیکن اب گھر کا خرچہ پورا کرنے اور تھوڑی بہت بچت کرنے کی خاطر چھٹی کے دن الگ سے کام ملنے پر انکار نہیں کرتا تھا۔ تھوڑی بہت بچت سے ہی میں ذاتی مکان خرید سکتا تھا اسی لیے میں کمانے کی مشین بن گیا تھا۔ مہر النساء کو مجھ سے یہی گلہ تھا کہ میں اُسے وقت نہیں دیتا' اُس کی بوریت دور کرنے کے لیے میں نے نیا موبائل بھی خرید کر اُسے دے دیا تھا تا کہ جب وہ بور ہو' اپنے گھر والوں اور اپنی سہیلیوں سے بات کر سکے۔ اس کے باوجود بھی اُسے شکایت ہی رہی کہ میں نے اُسے ایک طرح سے قید خانے میں قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ میرا خیال تھا' میرے گھر والے

مہرالنساء کو قبول کرلیں گے' یوں بڑی فیملی میں رہ کر اس کا وقت اچھا گزر جائے گا لیکن یہ میری خام خیالی تھی' میرے گھر والوں کو اسے نہ قبول کرنا تھا اور نہ انہوں نے اسے کیا پھر اس نے مجھ سے شکایت کرنا چھوڑ دی۔ میرا خیال تھا کہ اس کا دل اس گھر میں لگ گیا ہے لیکن اس نے موبائل پر مختلف لڑکوں سے دوستیاں کرلی تھیں اس لیے سارا وقت اُن سے باتوں میں گزر جاتا تھا۔ لڑکوں سے دوستیاں ہونے پر وہ میری غیر موجودگی میں گھر سے باہر بھی جانے لگی تھی۔ پڑوسیوں کی زبانی مجھے علم ہونے پر جب میں نے مہرالنساء سے باز پرس کی تو وہ پھٹ پڑی۔

''گھر کا سودا سلف کون لائے گا؟ ٹھیک ہے' میں کل سے پکانے کا سامان اور دیگر اشیاء نہیں لاؤں گی' تم لا دینا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' اس کے ناراض ہونے پر میں ٹھنڈا پڑ گیا۔

''پھر کیا تھا؟''

''مجھے محلے کے لوگوں کی زبانی علم ہوا ہے کہ تم میری غیر موجودگی میں باہر جاتی ہو اس لیے پوچھ لیا۔ ظاہر ہے' جب میرے پاس وقت نہیں ہوگا پھر کون گھر کا سودا سلف لائے گا' تم ہی لاؤ گی۔''

''اس محلے کے لوگوں کو باتیں کرنے اور دوسروں کی غیبت کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا۔ ایسا کرتے ہیں کہ ہم کسی دوسرے محلے میں گھر لے لیتے ہیں تاکہ ان چغل خوروں سے نجات مل جائے۔'' مہرالنساء نے غصے سے کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے' اس محلے میں ہمارے رشتہ دار رہتے ہیں' ان کی وجہ سے مجھے اطمینان رہتا ہے کہ خدانہ کرے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو وہ تمہیں سنبھال لیں گے۔ یہی سوچ کر میں نے اس محلے میں گھر لیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا کام آئیں گے' انہیں میری غیبت کرنے سے فرصت ملے گی تو کچھ کریں گے نا؟''

''ایسی بات نہیں کرتے' وہ ہمارے اپنے ہیں' انہیں مجھ سے محبت ہے جبھی مجھ سے ایسی بات کی ورنہ اس دور میں کس کو پڑی ہے کہ وہ کسی کے بارے میں سوچے؟'' میں نے اُسے سمجھایا۔

میرے سمجھانے پر وہ بظاہر خاموش ہوگئی تھی لیکن پھر وہ محتاط انداز میں اپنے دوستوں سے ملنے لگی تھی۔ جب گلی میں سناٹا ہوتا' باہر نکلتی اور شام گئے لوٹنے پر وہ ہاتھ میں سبزی اور دیگر سامان لے کر آتی تھی۔ مہرالنساء نے جن لڑکوں سے دوستیاں کی تھیں' وہ اچھے کردار کے نہیں تھے۔ انہوں نے مہرالنساء کو بلیک میل کرنے کے لیے اس کی غیر اخلاقی وڈیو بنالی تھیں اور اسے جب فحاشی کے لیے مجبور کیا تو وہ نہیں مانی۔ غصے میں انہوں نے میرے موبائل پر وہ وڈیو بھیج دی' کلپ دیکھ کر میں سر سے پیر تک کانپ گیا اور غصے میں سیدھا گھر پہنچا۔ اتفاق سے دروازہ کھلا تھا' میں بغیر آواز کے گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت مہرالنساء زور زور سے موبائل پر کسی لڑکے سے باتیں کررہی تھی۔

''نہیں' نہیں' میں ہرگز ایسا کام نہیں کروں گی۔ تم نے کیا مجھے فاحشہ سمجھا ہوا ہے؟ تم لوگوں کے فریب میں آکر میں نے اپنی عزت گنوادی' کیا یہ کم گناہ ہے؟ مجھے دھمکیاں دینے کی ہرگز کوشش مت کرنا' میں صرف تم لوگوں سے دوستی رکھ سکتی ہوں' کسی اور سے دوستی ہرگز نہیں کروں گی۔''

مہرالنساء کی یہ باتیں سن کر میں پاگل سا ہوگیا تھا۔ اس نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ مجھے کتنا مان تھا اس پر لیکن میرے اعتماد کی اس نے کوئی قدر نہیں کی تھی۔ میں نے اُسے صفائی کا موقع دیے بغیر چاقو کے پے در پے وار کرکے ہلاک کردیا۔ پولیس



...بھی یہ پوچھ رہی ہے کہ میں وجہ بتاؤں کہ اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا؟ میری بیوی جیسی بھی تھی' وہ میری عزت تھی' اس نے میرے اعتماد کا خون کیا اور میں نے اس کا خون کردیا لیکن یہ سب باتیں میں کسی کو کیوں بتاؤں؟ گھر کی باتیں گھر میں دفن ہو جائیں' یہی اچھا ہوتا ہے۔'' جمشید اپنی کہانی سنا کر خاموش ہوگیا۔

''وہ وڈیو کلپ جو تمہیں ملی تھی' پولیس کو دکھا دیتے تاکہ تمہاری سزا میں کمی ہو جائے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''کہاں سے دکھاؤں؟ مہرالنساء کو قتل کرکے جو بدحواسی کی حالت میں بھاگا ہوں تو میری جیب سے موبائل بھی گر گیا تھا۔ اگر موبائل ہوتا بھی پھر بھی میں وہ وڈیو نہیں دکھاتا۔ کون ایسا شخص ہوگا جو اپنی بیوی کی شرمناک حرکتیں کسی دوسرے فرد کو دکھائے؟''

اس کے چہرے سے اداسی چھلک رہی تھی۔ ابھی وہ اور کچھ کہتا کہ پولیس مختلف کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے اسے سول جج کے ریڈر کے پاس لے گئی۔

میں اس کیس کے سلسلے میں جو کچھ جاننا چاہتا تھا' وہ جان چکا تھا اس لیے وہاں سے واپس چلا آیا۔ شام ہونے پر میں جلد ہی اخبار کے دفتر پہنچ گیا اور دن بھر میں جمع ہونے والی خبریں بنا کر بیورو چیف کے حوالے کردیں۔

''سر' ایک عرض ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں' بولو۔'' بیورو چیف الطاف نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر' مجھے ایک ماہ کی چھٹی چاہیے؟'' میں نے کہا۔

''ایک ماہ کی چھٹی؟ مجھے یاد پڑتا ہے' تم نے اپنی شادی کے موقع پر بھی اتنی لمبی چھٹی نہیں لی تھی۔ تیسرے دن ہی دفتر چلے آئے تھے۔'' الطاف نے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے' میں نے کبھی غیر ضروری چھٹی نہیں کی ہے۔''

''تم کام سے بہت مخلص ہو' میں اپنے دفتر کے عملے کو تمہاری مثال دیتا ہوں کہ تم لوگ معمولی معمولی بات پر چھٹی لیتے ہو لیکن عقیل بیمار ہونے پر بھی دفتر آتا ہے۔''

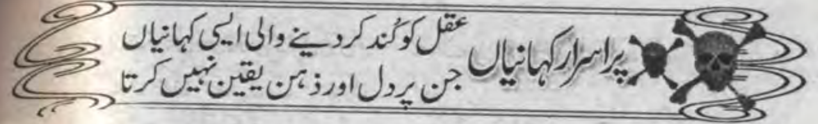
''سر' خبروں کا مسئلہ نہیں ہے' میں نے خالد کو کہہ دیا ہے' وہ شام کو کرائم کی خبریں ٹیلی فون پر لکھوا دے گا۔'' میں نے بتایا۔

''خبروں کی ہمیں اتنی فکر نہیں ہے' خبریں مل جائیں گی لیکن مجھے تشویش یہ ہو رہی ہے کہ تم ایک ماہ کی چھٹی کس طرح سے گھر میں گزارو گے؟'' بیورو چیف الطاف نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ چھٹی کی درخواست منظور کرلیں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے' تمہاری ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست منظور ہوگئی۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے درخواست پر دستخط کردیے۔

چند دن بعد میں لاہور کے شاہی قلعے میں بیگم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں بچے گھاس پر کھیل رہے تھے۔ بیگم اور بچوں کو خوش دیکھ کر میں بھی خوش تھا۔ میں پورے ایک ماہ کی چھٹی کو تفریحی مقامات کی سیر کرتے ہوئے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے ایک ماہ کی چھٹی کیوں لی تھی؟ جی ہاں' تاکہ میں اپنی بیوی اور بچوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکوں کہ کہیں میری بیوی بھی تنہائی کا شکار ہو کر موبائل دوستی کا سہارا لینے پر مجبور نہ ہو جائے......




ڈاکٹر مبشر حسن ملک

# رازِ کامیابی

ارتضا وارثی کا خیال

جو تیرگی میں گزرتا ہے وہ سفر کیا ہے
تو کہکشاں کا مسافر تجھے خبر کیا ہے

**وہ زندگی میں ترقی کرنا چاہتا تھا مگر اس کا طریقہ درست نہیں تھا**



احمد منظور ابھی تک حیات ہے، گو بہت ضعیف ہو چکا ہے، وہ بہت سچا آدمی ہے۔ کبھی لوگوں میں مقبول نہیں رہا۔ اس کی زندگی کا المیہ یہ رہا ہے کہ وہ بچپن ہی سے انتہائی ذہین اور محنتی تھا مگر تعلیم و تربیت کی نعمت سے محروم رہا۔ قیام پاکستان کے وقت اس کا بچپن غربت کی نذر ہو گیا جس کے بعد وہ زندگی میں کبھی نہیں سنبھل سکا۔ اس نے کئی پیشے اختیار کیے، کئی ہنر سیکھے مگر خوب سے خوب تر کی پیاس نے اسے ہمیشہ بے چین کیے رکھا۔ اس کی جواں عمری کا ایک انوکھا واقعہ سالہا سال سے خاندان بھر میں گردش کرتا رہا ہے جس کے گواہ آج بھی موجود ہیں۔ جب کبھی منظور کے سامنے اس واقعہ کا ذکر ہوتا ہے تو ایک ہلکی مگر جاندار مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل جاتی ہے۔ اس واقعے پر تبصرہ کرنا وہ ضروری نہیں سمجھتا، تاہم اس کے چہرے کے تاثر سے سامنے والے کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہو چکی ہے۔

نوجوانی میں اس نے ایک شرارت کی تھی جس کی وجہ سے اس کا تعلق مافوق الفطرت دنیا سے جڑتے جڑتے رہ گیا تھا، تاہم دورِ شباب میں اس نے جنات قابو کرنے کا عزم کیا اور اس میں سنجیدہ بھی ہو گیا، شاید اس کی غربت نے اسے اس طرف راغب کیا تھا۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا، حصولِ مقصد کے سلسلے میں وہ کئی افراد سے ملا، بے شمار در کھٹکھٹائے، دور دراز علاقوں کا سفر کیا، لوگوں سے ناقابلِ یقین کہانیاں سنیں، مافوق الفطرت قوتوں کا مشاہدہ کرنے والے ماہرین تلاش کیے اور آخر ان عاملین سے تعلق بنا لیا جو اسے اس کے مقاصد کے حصول میں رہنمائی کر سکتے تھے۔ بالآخر اسے ایک چلّے کا بتایا گیا جس کے پورا ہونے پر اس کے خواب کی تکمیل ہو سکتی تھی۔ اس کا متوقع چلّہ اکتالیس روز پر محیط تھا۔

احمد منظور کو اپنا عمل ایک وسیع برساتی نالے کے علاقے میں مکمل کرنا تھا جو بے حد ویران تھا۔ پنجاب میں اس قسم کے نالوں کو ''دواڑے'' کہا جاتا ہے۔ نالے میں پھیلی ہوئی ریت میں جگہ جگہ پانی کے ذخیرے موجود تھے۔ نالے کی ایک جانب پرانا قبرستان تھا جبکہ دوسری طرف کوسوں دور آبادی تھی۔ اسے اپنا چلہ قبرستان کے کونے میں بیٹھ کر کاٹنا تھا۔ عمل کا وقت روزانہ عشاء سے فجر تک تھا۔ اس عمل میں کسی بھی نوعیت کی کوئی معمولی سی غلطی بھی پورے عمل کو غارت کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ چلّے کے دوران بہادری لازمی شرط تھی۔ بزدل یا کم حوصلے والے شخص کا پتہ پانی ابتدائی مراحل میں ہی ہو سکتا تھا۔ یہ تمام باتیں احمد کو اس کے تجربہ کار عامل نے باور کرادی تھیں۔ ان ہدایات کو ذہن نشین کر کے احمد منظور نے اپنے عمل کا آغاز کر دیا۔ مغرب کے لگ بھگ وہ اپنی سائیکل پر گاؤں سے نکلتا تھا اور عشاء کے وقت مخصوص جگہ پہنچ جایا کرتا تھا چونکہ ان دنوں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی لہٰذا راستے میں اس کی مڈبھیڑ گاؤں کے کسی شخص سے نہیں ہوتی تھی جو اس سے پوچھ سکے کہ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟

پہلی رات قبرستان کو دیکھنے سے ہی اس کا حال برا ہو گیا تھا، تاہم اس نے بڑی ہمت کر کے اپنے عمل کا آغاز کر دیا۔ اس نے ایک حصار بنایا اور اس میں بیٹھ کر عامل کا بتایا ہوا عمل کرنے لگا۔ اس سنسان قبرستان میں اڑتے پرندوں کے پھڑپھڑاتے پروں کی آواز بھی اسے دہشت زدہ کیے دے رہی تھی جبکہ زمین پر چلتے مختلف اقسام کے عجیب و غریب کیڑے مکوڑے بھی اس کے خوف میں اضافے کے سبب بن رہے تھے۔ رات کے جانے کس پہر گونجنے والی خوف ناک آوازوں پر تو وہ لرز کر رہ گیا تھا مگر اپنا دل کڑا کر کے دائرے میں بیٹھا رہا۔ جس جگہ وہ چلّے پر

بیٹھا تھا اس نے وہاں ٹاٹ کا سائبان باندھ لیا تھا۔ رات میں جب تیز آندھی سی چلی تو اسے یہ سائبان اپنے سامنے ہوا میں معلق نظر آیا۔ رات بھر اس قسم کے دہشت ناک مناظر اس کا دل دہلاتے رہے تھے۔ کئی بار قبرستان کے سناٹے میں عورتوں کے بین کرنے کی صدائیں بھی گونجیں۔ ایسے ہی واقعات کے جلو میں وہ اپنے چلے کے ایام پورے کرنے لگا۔ ایک رات اس پر شعلوں میں جلتے تیروں کی بارش بھی ہوئی جو اس تک پہنچنے کے بجائے حصار کی حد سے باہر گرتے رہے۔ احمد منظور نے یہ سب کچھ بہت ہمت و حوصلے کے ساتھ برداشت کیا بلکہ وقت کے ساتھ وہ کچھ اور بھی نڈر ہو گیا۔

ایک رات حصار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے تعاقب کرتی ہوئی کتیا کو لات مار کر بھگایا۔ پہلے تو کتیا نے چلا کر احتجاج کیا پھر ذرا فاصلے پر بیٹھ کر نسوانی آواز میں بین کرنے لگی۔ اس کی دلخراش آواز روح کو فنا کیے دیتی تھی۔ جوں جوں اس کی منزل قریب آرہی تھی، اس قسم کے ہیبت ناک واقعات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک شب اس سے ایک بڑی غلطی سرزد ہو گئی۔ اس روز اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہ وظیفہ پڑھتے ہوئے دائرے میں سو گیا مگر اچانک کسی پراسرار آواز پر جاگا تو اردگرد عجب منظر دکھائی دیا۔

دائرے کے باہر بے شمار ڈونگے سجے ہوئے تھے، چند ایک سے دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک بڑا سا برتن دائرے کے اندر کھینچ لیا۔ ڈھکن اٹھا کر دیکھا تو برتن شوربے سے لبالب بھرا ہوا تھا اور تہہ میں ایک نوزائیدہ بچے کی لاش پڑی تھی۔ اس کے اعضاء شوربے کی سطح پر تیر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے برتن جلدی سے دائرے کے باہر پھینک دیا اور اپنے عمل میں مصروف ہو گیا۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ اس کی سائیکل غائب ہو چکی ہے۔ جس جگہ وہ سائیکل کھڑی کرتا تھا، وہاں اسے نظر نہیں آرہی تھی، تاہم وہ دائرے سے نکل نہیں سکتا تھا۔ صبح اسے اپنی سائیکل ایک درخت پر ٹنگی ہوئی نظر آگئی تھی۔ ان واقعات سے اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ منزل کے قریب تر پہنچ رہا ہے اسی لیے یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ وہ اندر ہی اندر خوش بھی تھا۔

اس شب اسے دور کہیں سے گھنگھروؤں کے بجنے کی آواز آنے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ کوئی مشعل بردار قافلہ اس کی جانب بڑھا چلا آرہا ہے۔ وہ بہت حیران ہوا کیونکہ ان وقتوں میں یوں رات میں تقریبات نہیں ہوا کرتی تھیں مگر اس کی حیرت جلد ہی خدشوں میں بدلنے لگی۔ بڑے بڑے گھنگھرو درحقیقت اونٹوں کے گلے میں لٹکے ہوئے تھے۔ اونٹوں کے قد بے حد لمبے تھے اور وہ اونچے اونچے درختوں پر منہ مار رہے تھے۔ ان اونٹوں کو طویل القامت شتربانوں نے سنبھال رکھا تھا۔ شتربانوں کی طرح اونٹوں کے چہرے بھی عجب اور خوفناک تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ جنات ہیں۔

اونٹوں پر لدا ہوا سامان انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں پر مشتمل تھا جن سے لہو ٹپک رہا تھا۔ کچھ ہڈیوں پر گوشت کے لوتھڑے بھی چپکے ہوئے تھے۔ انسانی کھوپڑیوں کے ساتھ بال بھی لٹک رہے تھے۔ یہ دل دہلا دینے والا قافلہ اس کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گیا پھر وہ خیمے گاڑنے لگے۔ قبرستان میں گویا ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ سامان اونٹوں سے اترنا شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی بڑی دیگیں چڑھا دی گئیں۔ جنات نے بڑی بڑی جھاڑیاں جڑوں سمیت اکھاڑ لیں تاکہ انہیں ایندھن کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ جہاں وہ پھونک مارتے تھے آگ جل پڑتی تھی پھر بڑے بڑے مشکیزوں سے



دیگوں میں پانی بھر دیا گیا۔ چند جنات نے انسانی ہڈیاں اٹھا کر دیگوں میں ڈال دیں اور دیگوں میں کف گیر چلنا شروع ہو گئے۔ اچانک ایک بڑا سا سانڈ بوکھلا کر قبرستان سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا مگر جلد ہی قابو آگیا۔ ایک طویل القامت جن نے اسے سینگوں سے پکڑا اور اس طرح پھینکا کہ وہ سیدھا ایک دیگ کے اندر جا گرا۔ اس قافلے کا ایک سردار تھا جس نے تمام دیگوں کا معائنہ شروع کر دیا پھر ایک خالی دیگ دیکھ کر وہ ناراض ہو گیا اور غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔

"اس میں کیا ڈالیں سردار؟" ایک جن نے اپنے سردار سے پوچھا۔ سردار نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اس کی نظریں احمد منظور پر جم کر رہ گئیں۔ وہ سردار کی شعلہ بار نظروں سے پگھلنے لگا۔ سردار کا چہرہ ٹین کے پچکے ہوئے ڈول کی طرح بے حد بھیانک تھا، رنگ کالا تھا جبکہ آنکھوں سے آگ برستی تھی۔ جب وہ دھاڑتا تھا تو زبان ناگ کی طرح باہر لپکتی تھی اور سر کے بال ہوا میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ غصے میں اس کے چہرے کے خدوخال تیزی سے بدل جاتے تھے۔

احمد منظور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ چند لمحے اسے غصے سے گھورنے کے بعد سردار نے لمبا بیلچہ نما کف گیر اٹھایا اور بجلی کی طرح احمد منظور کی طرف لپکا۔ قریب پہنچنے پر اس نے احمد منظور پر کف گیر کا وار کیا، ساتھ ہی اس کی پھنکار بھی سنائی دی۔ کف گیر دائرے کی حد سے باہر زمین میں دھنس کر رہ گیا۔

احمد منظور بدحواس ہو کر دائرے سے نکل بھاگا چونکہ اس کی حالت غیر ہو چکی تھی لہٰذا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس سمت دوڑا جا رہا ہے؟ خوف سے لرزاں وہ جس سمت بھی بھاگتا، اسے دو چار جن سامنے کھڑے نظر آتے۔ وہ ہر طرف سے گھر چکا تھا اور بے بس ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ تھکن

## غزل

بڑھ کے شعلہ شرر نہ ہو جائے
سب کو غم کی خبر نہ ہو جائے

شب گزاروں گا حوصلے کے ساتھ
پھر سے جب تک سحر نہ ہو جائے

درد دل تک رہے تو اچھا ہے
یہ کہیں دربدر نہ ہو جائے

ایک دل جو مرا اثاثہ ہے
کچھ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے

سر پہ دستارِ غم جو رکھی ہے
یہ بھی زادِ سفر نہ ہو جائے

موسموں کی ہے ساز باز بہت
قطرہ پل میں گہر نہ ہو جائے

دل کے طوفاں کو روک رکھا ہے
تیری بھی چشم تر نہ ہو جائے

دھوپ میں سائباں بنیں جو غیاث
زندگی وہ شجر نہ ہو جائے



غیاث الدین غیاث

**تم**

ہر ے عشق کی گواہی تم کیا دو گے
ہر ے عشق کی دہائی تم کیا دو گے
تم تو خود انجان ہو اس راہ میں
مجھے وفا تم کیا دو گے
یقین تو کیا تھا تم پر
خود سے بھی زیادہ
پر ہمیں کیا خبر تھی کہ تم ہی
زندگی بھر کی بے وفائی
ہمارے ہی نام لگا دو گے

لیلیٰ مروا اقبال۔ سیالکوٹ

سے چور چور ہو کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی اور کچھ لوگ اس کے اردگرد کھڑے اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ فوراً پہچان گیا' یہ اس کے گاؤں والے تھے۔ وہ لوگ دہشت زدہ احمد منظور کو اٹھا کر گاؤں لائے۔ خوف کے مارے اس کا برا حال تھا۔ وہ کئی روز تک شدید بیمار رہا۔ اس دوران وہ سوتے میں اپنے کپڑے پھاڑ دیتا تھا' چیخیں مارتا اور دیوانوں کی طرح چلاتا تھا۔ جب اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ایک روز وہ اپنے تین مہربان عاملین کے ساتھ قبرستان گیا۔ وہاں اس کا دائرہ ابھی تک موجود تھا۔ اکھاڑی گئی جھاڑیوں کے شواہد موجود تھے۔ چند جھاڑیاں بکھری ہوئی بھی ملیں۔ وہ پراسرار کتیا دائرے کے پاس موجود تھی جسے احمد منظور نے لات ماری تھی۔ وہ غصہ سے غرا رہی تھی۔ قبرستان میں چند درخت بھی اکھڑے پڑے تھے۔ احمد منظور کو وہ سانڈ بھی نظر آ گیا جو توانا اور بے حد پھرتیلا تھا۔ یہ سانڈ قبروں کے درمیان کھڑا تھا اور عاملین کو مسلسل گھور رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے احمد منظور کو جنوں کے سردار اور سانڈ کی نظروں میں مماثلت نظر آئی۔ وہ خوف زدہ ہو گیا پھر وہ چاروں افراد قبرستان سے نکل کھڑے ہوئے۔ ابھی تھوڑا ہی چلے ہوں گے کہ اسے احساس ہوا جیسے وہ سانڈ ان کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ سانڈ کے سانسوں کی حدت اپنی گردن پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اس بات کا ذکر ایک عامل سے کیا تو اس نے احمد منظور کو پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی ہدایت کی اور چند وظائف پڑھنے کو کہا مگر احمد منظور نے پلٹ کر دیکھ لیا اور اس کی سٹی گم ہو گئی کہ اس سانڈ کی گردن لمبی ہو کر اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ گھبرا کر دوڑ پڑا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے عاملین میں سے ایک نے وہیں رکنے کا فیصلہ کیا جبکہ دیگر دو نے اسے گھر تک پہنچایا۔

چند روز بعد وہی جنوں کا سردار احمد منظور کو خواب میں نظر آیا۔ اس نے زندہ بچ جانے پر اسے مبارک باد دی اور آئندہ اس طرح کے کاموں سے منع کیا۔ اس نے خبردار کیا کہ وہ ان کی دنیا میں مداخلت نہ کرے بلکہ اپنی دنیا میں رہ کر محنت کرے اور اپنی زندگی بنائے۔

احمد منظور اب بہت ضعیف ہو چکا ہے۔ اس واقعے کے بعد اس نے زندگی میں شدید محنت کی اور بہت کچھ حاصل کیا۔ آج وہ گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا زمیندار ہے۔ اسے دنیا کی ہر آسائش میسر ہے اور وہ اس پر اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا۔ وہ گاؤں کے نوجوانوں اور بچوں کو بس یہی تلقین کرتا ہے کہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی گُر ہے۔ محنت' محنت اور صرف محنت۔



نسرین رانا

# ایک مقدس لڑکی

سارے کے سارے حیرت سے گنگ کھڑے وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مقدس کے کان اور ناک سے کنکھجورے نکل رہے تھے اور وہ بے خبر پڑی تھی......

**اس کہانی پر یقین کرنا ہوگا کہ اس جہانِ رنگ و بو میں سب کچھ ممکن ہے**



مقدس کی وحشت ناک چیخوں سے سارا گھر گونج رہا تھا۔ وہ اپنا سر دیوانوں کی طرح گول گول گھما رہی تھی۔ کبھی وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پیٹتی، کبھی سر کو زمین پہ مارتی تو کبھی دیوار پر۔

چھوٹے بہن بھائی وحشت زدہ چہروں کے ساتھ ایک طرف کھڑے تھے۔ ماں دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی خوبصورت جوان بیٹی کو بے بسی سے دیکھ رہی تھی جسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس کے بال کھلے تھے اور اپنے ننگے سر کو پیٹ رہی تھی۔ اس پر جیسے جنون طاری تھا۔ جب وہ سر پٹختے پٹختے تھک گئی تو دلدوز آواز میں رونے لگی۔

بے بس و مجبور ماں دل شکستہ سی کبھی اپنی بیٹی کو دیکھتی تو کبھی اپنے شوہر کو۔

یوسف علی ایک کونے میں بیٹھا اپنی بیٹی کی حالت پر آنسو بہا رہا تھا۔

مقدس حسن کا نمونہ تھی۔ بڑی بہن کی رخصتی کے بعد اس نے گھر کا تمام کام بخوبی سنبھال لیا تھا۔ ماں کو تو وہ ایک بھی کام کرنے نہیں دیتی تھی۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوش اخلاق اور سگھڑ بھی بہت تھی۔ گاؤں میں اس کے سگھڑ پن کے چرچے تھے اور گاؤں کی لڑکیوں بالیوں کو مقدس کی مثال دی جاتی تھی۔ اپنے حسنِ اخلاق اور دوسروں کے کام آنے کی عادت نے مقدس کو اپنے گھر کا ہی نہیں بلکہ گاؤں بھر کی آنکھ کا تارا بنا دیا تھا۔ وہ ہر ایک کے کام آنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی۔ اڑوس پڑوس کے گھر میں کوئی بیمار ہو جاتا تو تندہی سے ان کی خدمت پر مامور ہو جاتی۔

اس کا دن بھر کا معمول لگا بندھا تھا۔ فجر سے ذرا پہلے اٹھتی، نماز پڑھتی پھر قرآنِ پاک لے کر بیٹھ جاتی۔ صبح کی روشنی پھیلتی تو ناشتہ بناتی اور گھر کے دیگر کاموں میں لگ جاتی اور پھر رات گئے تک ایک کے بعد دوسرے کام میں لگی رہتی اور جب تمام کاموں سے فارغ ہوتی تو رات کو ماں کے پاؤں دبانا اور باپ کے سر کی مالش کرنا بھی اس کے معمول میں شامل تھا۔ دونوں ماں باپ اپنی فرمانبردار بیٹی کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے۔ اس کی ایک چھوٹی بہن اور چھوٹا بھائی بھی تھا۔ دونوں بہن بھائی اپنی پیاری بہن مقدس سے بہت پیار کرتے تھے۔ دونوں اسی کے ساتھ سوتے تھے کیونکہ انہیں سوتے وقت کہانی بھی تو سننی ہوتی تھی۔ ماں اور یہ تینوں بہن بھائی کمرے میں نیچے زمین پر بستر بچھا کے سوتے تھے جبکہ باپ باہر صحن میں چارپائی پر سوتا تھا۔ چھوٹے بہن بھائی مقدس کے دونوں طرف سوتے تھے۔ ماں پاس میں سوتی تھی۔ اس چھوٹے سے گھرانے کی زندگی بہت پرسکون اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے بھرپور گزر رہی تھی کہ صبح جب وہ سو کر اٹھی تو پاگلوں کی طرح اپنا سر پیٹ رہی تھی۔ رات کو حسبِ معمول خوشی خوشی وہ چھوٹے بہن بھائی کو کہانی سنا کر سوئی تھی۔ صبح اٹھی تو اس کی اپنی کہانی خراب ہو چکی تھی۔

ماں باپ نے بہتیرا علاج کرایا، دَم دُرود، تعویذ گنڈے، حکیم، سنیاسی، ٹونے ٹوٹکے، پیر فقیر سب جگہ اپنی بیٹی کو لے کر گئے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کسی نے انہیں شہر کے بڑے ڈاکٹر کو بھی دکھانے کا کہا مگر شہر لے جانے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔

زندگی کی گاڑی اسی غم کے ساتھ چل رہی تھی۔ دن، ہفتے، ہفتوں، مہینہ اور مہینے، سال میں بدل گیا مگر مقدس کی حالت میں رتی برابر فرق نہیں آیا تھا۔ ماں باپ جوان بیٹی کے غم میں گھلے جا رہے تھے۔ چھوٹے بہن بھائی کا بھی حال اچھا نہیں تھا۔

دورے کی حالت میں وہ بے قابو ہو جاتی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو پیٹتی، کبھی زمین پر مارتی، کبھی دیوار پر مارتی۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر



روتی، اس کی ٹانگوں پہ زور زور سے اپنا سر مارتی، ماں کے دونوں ہاتھوں کو اپنے نازک ہاتھوں میں لے کر اپنے سر پر زور زور سے مارتی پھر روتے روتے بے ہوش ہو جاتی۔ سو کر اٹھتی تو حالت کچھ سنبھلی ہوتی مگر اچانک وہی صورتِ حال ہو جاتی۔ اپنے بالوں کو نوچتی، کبھی کبھی تو بار بار بے ہوش ہوتی۔ جب ہوش آتا تو کچھ پرسکون ہو جاتی۔ ہوش میں آتے ہی کھانا مانگتی۔ ماں نم آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے پیار کرتی اور کھانا آگے رکھ دیتی۔

کھانا سامنے دیکھ کر وہ خوش ہو جاتی اور یوں کھانے لگتی جیسے کئی دنوں کی بھوکی ہو۔

اس کی حالت عجیب پاگلوں کی سی ہو گئی تھی اسی لیے جب وہ گھر سے نکلتی تو محلے کے بچے شور مچاتے ہوئے اسے پگلی، پگلی کہہ کر پکارتے تھے۔

جب مقدس نارمل حالت میں ہوتی تو ماں اپنی پیاری بیٹی کی کنگھا چوٹی کرتی، اس کے سر کی مالش کرنے لگتی اور آنسو پونچھتے ہوئے وہ وقت یاد کرنے لگتی۔ جب بیٹی اپنی ماں کے تیل لگاتی تھی اور خوب مالش کرتی تھی پھر بڑے پیار سے بالوں کو سلجھاتی اور چوٹی باندھتی تھی۔

''اچھا! ماں کی خدمت ہو رہی ہے، باپ کی نہیں؟'' یوسف علی مسکراتے ہوئے بیٹی سے کہتے۔

''بابا! بھلا ایسا ہو سکتا ہے، آپ کے سر میں تیل ڈالنا بھول جاؤں؟ زبردست مالش کروں گی کہ آپ کو نیند آ جائے گی۔'' وہ ہنستے ہوئے کہتی۔

''آہ......'' اس کے منہ سے سسکاری نکلی تو ماں جیسے یادوں سے باہر آ گئی۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' وہ پیار سے بولی۔

''دُکھتا ہے اماں!'' وہ سر کو پکڑتے ہوئے بولی۔

''اچھا، میں آرام سے کروں گی۔'' ماں آہستہ آہستہ اس کا سر دبانے لگی۔ سامنے نظر اٹھا کر دیکھا تو یوسف کھڑا تھا۔

''اس کو تیار کر لے، شاہ صاحب کے پاس لے جانا ہے۔'' وہ افسردہ انداز میں بولا۔

''اچھا......'' ماں نے بھی اسی اداس لہجے میں کہا۔

تیل ڈالنے اور سر دبانے سے بیٹی کو نیند آ گئی تھی۔

''ارے، یہ تو سو گئی؟'' یوسف علی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ صاحب کے پاس جانا ہے۔''

''تھوڑی دیر سونے دو، ٹھہر کر چلے جائیں گے۔ کتنا سکون ملا ہے اسے۔ اچھا ہے، سو جائے ورنہ سر پیٹتی رہتی ہے۔'' ماں نے بیٹی کو بے چارگی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، پر زیادہ دیر نہ ہو جائے۔ شاہ صاحب کو بول کر آیا ہوں۔''

''اپنی مقدس ٹھیک تو ہو جائے گی نا؟'' ماں نے پرامید نظروں سے یوسف علی کو دیکھا۔

''ہاں، ہاں، شاہ صاحب کی بڑی تعریف سنی ہے۔ نئے آئے ہیں اپنے گاؤں میں اور بڑی دھوم ہو گئی ہے ان کی۔ مجھے لگتا ہے، اپنی مقدس کو وہ ٹھیک کر دیں گے۔'' یوسف نے پریقین لہجے میں کہا۔

مقدس سو کر اٹھی تو اماں ابا اسے گاؤں میں وارد ہونے والے شاہ صاحب نامی عامل کے آستانے پر لے گئے۔ شاہ صاحب کے آستانے پر عورتوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ خاصی دیر بعد اپنی باری آنے پر یوسف علی بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ عامل کی خدمت میں حاضر ہوا۔

شاہ صاحب آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے کالی چادر میں لپٹی ہوئی ایک جوان اور حسین لڑکی کھڑی تھی۔

کالی چادر میں اس کا خوب صورت چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا، بڑی بڑی آنکھیں، لمبی ناک اور

گلاب کی پتی کی طرح نازک لب۔ عامل صاحب اس کے حسن میں گم ہو گئے۔

''شاہ صاحب! یہ ہماری بیٹی مقدس ہے۔'' یوسف علی نے ادب سے کہا۔

''آں...... ہاں'' شاہ صاحب کو جیسے ہوش آ گیا۔ ''بہت پیاری ہے۔'' شاہ صاحب نے مقدس کو سرتاپا للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں آؤ ہمارے پاس۔''

''جاؤ بیٹی! شاہ صاحب بلا رہے ہیں۔'' یوسف علی نے بیٹی کو کہا۔ ''شاہ صاحب! اپنی بیٹی کے بارے میں، میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اب آپ اس کو اچھا کر دیں۔'' یوسف علی التجائیہ انداز میں بولا۔

''ہوں...... پتا ہے، ہمیں، اب چپ چاپ سب بیٹھ جاؤ۔ ہمیں پڑھائی کرنے دو۔''

ماں باپ سر جھکا کر نیچے سامنے بیٹھ گئے جبکہ مقدس کو شاہ صاحب نے گدی پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ وہ چند لمحوں تک آنکھیں بند کیے کچھ پڑھتے رہے پھر اچانک آنکھیں کھول دیں۔

''پتہ چل گیا کون ہے وہ بدبخت جس نے مقدس کو قابو میں کیا ہوا ہے۔'' وہ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

''کون ہے شاہ صاحب؟'' یوسف علی نے بے قراری سے پوچھا۔

''لڑکی پر جن عاشق ہو گیا ہے، وہ اسے ساتھ لے جائے گا۔ اس نے پوری طرح سے مقدس کو قابو کر لیا ہے۔ یہ خود اپنے بس میں نہیں ہے۔''

''ہاں، ہاں، آپ سچ کہہ رہے ہیں شاہ صاحب، یہ اپنے بس میں نہیں رہتی ہے، ہر وقت سر کو پیٹتی رہتی ہے۔'' اماں نے جلدی سے کہا۔

''مگر شاہ صاحب، اس جن سے کیسے پیچھا چھوٹے گا؟'' یوسف علی فکرمند تھے۔

''ہم ہیں نا، سب ٹھیک ہو جائے گا، علاج لمبا اور کٹھن ہے، پر میں سب سنبھال لوں گا لیکن......''

''لیکن کیا شاہ صاحب؟'' یوسف علی نے بے چینی سے پوچھا۔

''تمہیں لڑکی کو یہیں چھوڑ کر جانا ہوگا، اس کا علاج ابھی سے شروع ہوگا۔''

''پر شاہ صاحب، یہ آپ کو بہت تنگ کرے گی۔''

''ہم سب سنبھال لیں گے۔''

''ہم مقدس کو روز لے کر آ جائیں گے۔'' یوسف علی سوچتے ہوئے بولا۔

''تم مزدور آدمی ہو، روز روز کیا تکلیف کرو گے؟'' عامل نے قدرے ناگواری سے کہا۔

''اس کی ماں لے آئے گی۔'' یوسف اپنی جوان بیٹی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

''تمہیں علاج کروانا ہے تو کرواؤ ورنہ جاؤ۔'' عامل نے اسے غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... نہیں...... شاہ صاحب، ناراض مت ہوں، اچھا ہم چلتے ہیں، کب آئیں؟'' یوسف کی بیوی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''چوبیس گھنٹے بعد آنا۔ اگر لڑکی کی حالت مناسب ہوئی تو ساتھ لے جانا ورنہ مزید روکنا پڑے گا۔'' عامل نے مقدس کو خباثت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی بہتر۔'' دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی کو چھوڑ کر چلے گئے۔

عامل نے مقدس کو اپنے روبرو بہت قریب بٹھایا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سب تجھے پاگل کہتے ہیں لیکن تو نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ چل یہ چادر اتار۔''

مقدس حیرت سے اس کا منہ دیکھتی ہوئی اپنا سر دبانے لگی۔ عامل کی آنکھوں میں شیطانیت ناچ رہی



تھی، اس نے ایک جھٹکے سے اس کی چادر کھینچ لی۔ مقدس رونے لگی اور شیطان صفت عامل قہقہے لگانے لگا۔

''روتی کیوں ہے، تیرا پاگل پن ٹھیک کر دوں گا۔''

مقدس پر پھر سے وہی دورہ پڑنے لگا، وہ اپنے سر کو پیٹنے لگی، اسے سخت بے چینی ہو رہی تھی۔ عامل اپنے ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے اس پر جھپٹنے لگا اور وہ اضطراب کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اچانک پاس ہی اسے ایک ہتھوڑی نظر آئی، اس نے فوراً ہاتھ بڑھا کر ہتھوڑی اٹھائی اور پوری طاقت سے اس کمینے عامل کے سر پر دے ماری، وہ چکرا کر گر پڑا۔ مقدس اپنے سر کو زور زور سے دبا رہی تھی۔ آج اسے کچھ زیادہ تکلیف ہو رہی تھی، سر کا درد ناقابلِ برداشت تھا، وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے کمرے سے باہر بھاگنے لگی۔ عامل نے اسے پکڑنا چاہا تو اس نے جنونیوں کی طرح دونوں ہاتھوں، پاؤں سے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس مار کٹائی میں مقدس کی آستین پھٹ گئی، اس کی چادر تو وہ عامل پہلے ہی کھینچ چکا تھا، اس کا دوپٹہ جو گلے میں تھا، وہ بھی گر گیا تھا۔ وہ اپنی حالت کی پروا نہ کرتی، گرتی پڑتی اپنے سر کو پیٹتی ہوئی وہاں سے بھاگ نکلی۔

عامل کے آستانے سے باہر نکلی تو سامنے بیابان تھا۔ وہ جنگل جیسی جگہ گاؤں سے باہر تھی۔ مقدس جانے کب تک بدحواس اور تکلیف کے عالم میں بھاگتی رہی اور جب تھکن سے چور چور ہو گئی تو ایک جگہ گر پڑی۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ تکلیف سے دہری ہوئی جا رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ اسے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ وہ پھر اٹھی اور درد سے بلبلاتی ہوئی دوڑنے لگی مگر کچھ دور جا کر لڑکھڑاتی ہوئی گری اور بے ہوش ہو گئی۔ جہاں وہ گری تھی، وہاں بکرے کی سری پڑی تھی، اس کا سر اسی تازہ کٹی سری پر رکھا تھا۔

اسی وقت گاؤں کے چند لوگ اس راستے سے گزرے جن میں دو بزرگ، ایک امام صاحب بھی شامل تھے۔

سارے کے سارے حیرت سے مقدس کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی حیرت بجا تھی کیونکہ منظر ہی کچھ ایسا تھا۔ وہ سب مقدس کو اور کبھی بکرے کی سری کو دیکھتے تھے۔

مقدس کے کان اور ناک سے کن کھجورے نکل رہے تھے اور بکرے کی سری سے چمٹ جاتے جبکہ مقدس بے خبر پڑی تھی۔ وہ سب مقدس اور اس کے دوروں کے متعلق جانتے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر امام صاحب کی سمجھ میں ساری بات آ گئی۔

انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''جب کن کھجورے نکلنا بالکل بند ہو جائیں تو مقدس کو جگا دیں گے۔'' وہ سب کھڑے انتظار کرتے رہے، کب کن کھجورے نکلنا بند ہوں۔ آخر کچھ دیر بعد مقدس کے کان، ناک سے کن کھجورے نکلنا بند ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی اسے جگاتا، مقدس نے خود ہی آنکھیں کھول دیں۔

وہ جاگی تو اسے اپنا سر بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا، اس کا درد غائب ہو چکا تھا، اسے کوئی تکلیف نہیں تھی سوائے اس کے کہ اسے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور حیرت سے ان کن کھجوروں کو دیکھنے لگی جو بکرے کی سری پر چمٹے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر امام صاحب اور دوسرے لوگوں پر پڑی تو اسے اپنے دوپٹے اور چادر کا خیال آیا۔ وہ شرم سے خود میں سمٹ گئی۔ امام صاحب آگے بڑھے اور اپنی چادر اسے دیتے ہوئے شفقت سے کہا۔

''آؤ بیٹی، اپنے گھر چلو۔'' وہ ساتھ چلنے لگی مگر پھر پلٹ کر حیرانی سے بکرے کی سری کو دیکھنے لگی۔

''بیٹی! گھر چلو، میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔''

امام صاحب اس کی الجھن کو سمجھتے ہوئے بولے۔

٭......٭......٭

امام صاحب نے مقدس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دستک پر مقدس کا باپ یوسف علی باہر آیا۔

"امام صاحب! آپ؟" یوسف علی حیرت سے بولا۔

امام صاحب نے سلام کیا۔ یوسف نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ خیریت تو ہے پھر پیچھے کھڑی ہوئی اپنی بیٹی کو دیکھا۔ "تم......؟" وہ دم بخود سا بیٹی کو دیکھنے لگا جسے وہ عامل کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔

"ہم سب کچھ بتاتے ہیں لیکن اطمینان سے بیٹھ کر۔" یوسف علی سب کو اندر لے آیا۔

امام صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "ہم سب گاؤں آ رہے تھے کہ ہم نے دیکھا' مقدس ایک بکرے کی سری پر سر رکھے بے ہوش پڑی تھی اور اس کے دونوں کانوں اور ناک سے کن کھجورے نکل رہے تھے اور بکرے کی سری میں چمٹ رہے تھے۔ کچھ دیر تک تو ہم حیرت سے یہ منظر دیکھتے رہے پھر میری سمجھ میں ساری بات آ گئی۔"

"کون سی بات؟" یوسف علی نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"مقدس کے دورے والی بات' دراصل زمین پر سوتے میں اس کے سر میں کوئی کن کھجورا چلا گیا ہوگا اور پھر اس ایک سے بہت سارے کن کھجورے پیدا ہوگئے۔ جب وہ اس کے دماغ کا خون چوستے تھے تو اس کے سر میں شدید درد اٹھتا تھا اور تم سمجھتے تھے کہ اسے دورہ پڑ رہا ہے۔ مقدس کی حالت بگڑ جاتی تھی۔ قدرت کا کرنا کہ مقدس جس جگہ بے ہوش ہو کر گری' وہاں بکرے کی تازہ سری پڑی تھی جس میں گوشت اور خون لگا ہوا تھا۔ اس گوشت اور خون کی خوشبو سے دماغ میں جتنے بھی کن کھجورے تھے' وہ نکل گئے اور یوں اللہ کے فضل سے مقدس خود بخود صحت یاب ہوگئی۔ قدرت کو یہ معجزہ دکھانا تھا۔ اب بچی بالکل ٹھیک ہے۔" امام صاحب نے مقدس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

یوسف علی اور اس کی بیوی نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ ان کی بچی ٹھیک ہوگئی۔ اچانک باپ کو عامل کا خیال آیا۔

"بیٹی......! تمہیں تو ہم شاہ صاحب کے پاس علاج کے لیے چھوڑ آئے تھے' تم گاؤں کے باہر کیسے پہنچ گئیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ تب مقدس نے رو رو کر سارا احوال سنا دیا۔

"ایسے بدکردار شخص کو گاؤں میں نہیں رہنے دینا چاہیے' فوراً نکال دینا چاہیے۔" یوسف علی نے غصے سے کہا۔

"نہیں یوسف علی' ایسے شخص کو سخت سے سخت سزا دینی چاہیے۔ اگر ہم اسے گاؤں سے نکال دیں گے تو وہ دوسرے گاؤں میں جا کر ایسی گندی حرکتیں کرے گا۔ اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔" امام صاحب نے کہا جس کی سب نے تائید کی۔

٭......٭......٭

اماں ابا نے مقدس کا بے حد خیال رکھا' یوں چند مہینوں میں وہ پہلے والی صحت مند مقدس ہوگئی' تاہم ان دو تین مہینوں میں اس نے ماں کے ساتھ گھر کا کام کاج کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماں کہتی رہی کہ آرام کرو مگر مقدس جواب میں یہی بولتی کہ میں نے پہلے ہی آپ لوگوں کو اتنا تنگ کیا ہے' اب آپ کی خدمت کر کے ساری کسر پوری کر دوں گی۔ والدین سے حسنِ سلوک' نیکی اور اطاعتِ خداوندی کی برکت سے کچھ عرصے بعد اس کے لیے گاؤں سے ایک بہت اچھا رشتہ آیا۔ والدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ محمد ابراہیم بہت نیک اور شریف لڑکا تھا۔ یوں مقدس دلہن بن کر محمد ابراہیم کے گھر کی بہار بن گئی۔





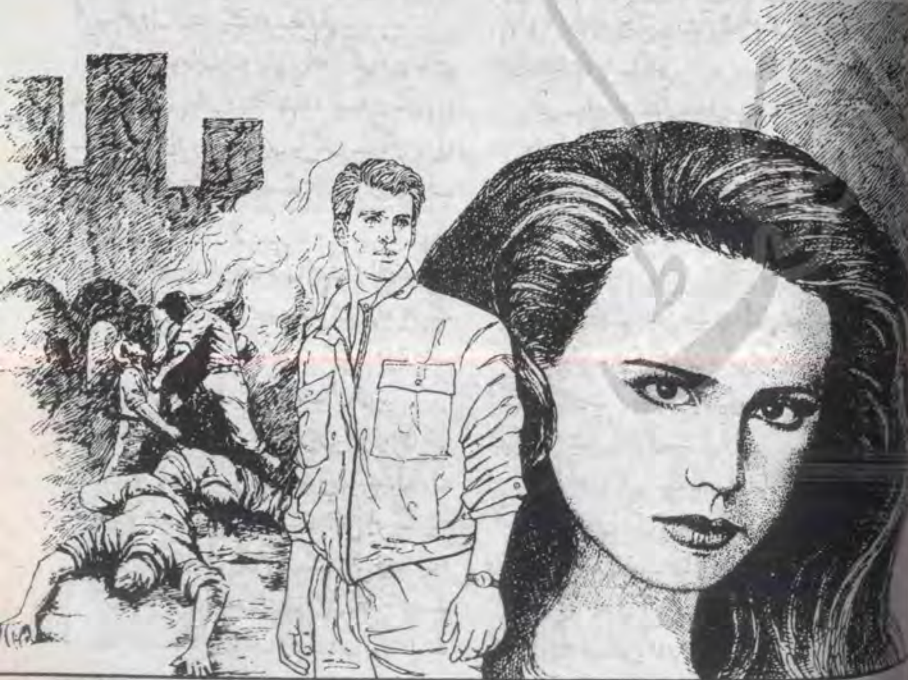
ارم زہرا

# میں کس کے ہاتھ پہ

امیر مینائی کا خیال

ملا کر خاک میں آئے کس کو؟
یہ کیسی گرد دامن پر پڑی ہے

روشنیوں کے شہر میں جاری موت کے کھیل سے جنم لینے والی ایک المیہ کہانی



خنک موسم کی سنہری دھوپ کھڑکی کے شیشے سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی بلیک کافی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں ریک پر لگی کتابوں پر ایک نظر ڈالتی ہوئی واپس اپنی جگہ پر آ گئی۔ مختلف کرائم اسٹوریز کے اخبارات' فل اسکیپ پیپرز میرے اردگرد بکھرے ہوئے تھے جبکہ میں بے مقصد ہی نیلی جلد والی ڈائری کے صفحات پلٹ رہی تھی جس میں شہر کے مختلف تھانوں کے نمبرز کا اندراج تھا۔

''پھر کوئی کرائم اسٹوری لکھنی ہوگی؟'' میری بہن منہ بسورتے ہوئے میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔

''ہوں......'' میں نے کافی کا مگ لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آخر کتنی کہانیاں لکھیں گی آپ؟'' وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پورے سال بارہ کہانیاں لکھ کر میں کون سا تیر مار دیتی ہوں؟ یہاں تو دہشت گرد ایک دن میں بارہ سے پندرہ افراد مار دیتے ہیں۔'' میں نے کنپٹی پر اپنی انگلیوں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا۔

''حالانکہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے لیکن یہاں تو سب کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ خیر' آپ اپنا کام جاری رکھیے۔'' وہ تاسف کے انداز میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

''ہم کتنے بے حس ہو چکے ہیں۔ ایک دن میں پندرہ مر جائیں یا بیس' ہمیں اَب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' مرنے والوں کی لاشیں روز اخبار کے سینے کو سرخ کر رہی ہوتی ہیں تو ہر گھنٹے بعد میک اپ و آرائش سے مزین ایک حسن کی دیوی نیوز بلیٹن کے ذریعے ہمارے کانوں میں ان خبروں کے حوالے سے دھماکے کر رہی ہوتی ہے۔ آج مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے جب کراچی لاشوں کا نہیں بلکہ روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا۔ اگر خدانخواستہ کوئی شخص قتل کر دیا جاتا تو ہفتوں اُس کی شبیہ نظروں میں گھوما کرتی اور ایک نامعلوم خوف وجدان میں چکراتا پھرتا مگر اَب تو بے حسی کا یہ عالم ہے کہ نوجوانوں کی ٹارگٹ کلنگ عام ہوگئی ہے اور اُن کے غم میں اگر اُن کے ماں باپ گزر جائیں تو تدفین کے وقت یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ''جوان اولاد کا غم پل پل مارتا اس سے بہتر ہے' ایک ہی دفعہ مر جانا......'' آہ...... عجیب نفسا نفسی کا دور ہے' غربت و افلاس سے مرتے لوگوں کی قسمت میں رِزق نہیں بلکہ گولیاں ہیں جو جسموں کے ساتھ ساتھ روحوں کو بھی چھلنی کر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے' پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے رِزق چاہیے اور رِزق کے حصول کے لیے کمائی کا ذریعہ ہونا چاہیے اور اگر کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے تو جرائم میں خودبخود ہی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔

میرے اجداد نے قربانیوں سے جو ملک بنایا تھا' وہ کیوں آج قبرستان بنتا چلا جا رہا ہے؟ ایک تو میں لفظ کیوں سے سخت چڑنے لگی ہوں' یہ لفظ ہمیشہ ہی میری بے ربط سوچوں کے آگے بند باندھ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

''آپی' جلدی سے آئیے' ٹی وی پر بریکنگ نیوز آ رہی ہے' ایک سیاسی کارکن کا قتل ہو گیا ہے۔ آپ انہی کی شخصیت پر کہانی لکھ دیجیے۔'' بہن کی آواز میری سماعت کو جھنجھوڑ گئی۔

''سچ کہوں' میں اپنے ملک کی سیاست سے بھی سخت نالاں ہوں' جتنی پارٹیاں بن گئی ہیں' اتنا ہی قتل و غارت گری میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔''

''آپی' جلدی آ جائیے!'' بہن کی آواز نے پھر مجھے پہلو بدلنے پر مجبور کیا۔



''نہیں' میں نہیں آ رہی۔'' میری آواز جھنجھلائی ہوئی تھی۔ شاید میری کہانیاں بھی سیاست کا شکار ہوگئی ہیں کیونکہ میرے دماغ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا فیصلہ دینے میں۔ میرے شہر میں قتل و خونریزی بڑھتی جا رہی ہے اور دہشت گردی کی جو وبا پھوٹی ہے' کیا اُس کا کوئی سدباب نہیں؟''

لیکن میں یہ سوال ہی کیوں کر رہی ہوں؟ کیا میں نے تاریخ نہیں پڑھی؟ وہ تاریخ جو ہزاروں برس سے طاقتور کے ہاتھوں کمزور کو دہشت گرد قرار دیتی ہے۔ نہیں' شاید میں غلطی پر ہوں۔ تاریخ نے کمزور کو دہشت گرد خود سے نہیں کہا۔ وہ تو اپنے اوراق میں طاقتور کا کمزور کے خلاف فیصلہ درج کرتی آئی ہے اور یہ مقدمہ آج بھی جاری ہے۔ تاریخ کی عدالت انصاف نے اس مقدمے کی سماعت آج تک کبھی بند ہی نہیں کی۔

اس وقت میرے سامنے موجود اخبار کے اَپر ہاف پیج پر ایک معصوم سی چودہ سالہ لڑکی عارفہ کی تصویر ہے۔ یہ تصویر میرے ذہن کے کینوس سے یوں چپک کر رہ گئی ہے جیسے چھپکلی دیوار سے چمٹی رہتی ہے۔ بارہا میں نے یہ اخبار اپنے سامنے سے ہٹایا۔ میری پوری کوشش تھی کہ میں کسی اور واقعے کو قلم بند کروں مگر جانے کیوں یہ تصویر مجھے ایک کرب میں مبتلا کر چکی ہے۔ میرا ذہن قبول نہیں کر رہا کہ اتنی معصوم سی پیاری لڑکی کو پوری طرح کھلنے اور گلشنِ حیات کو اپنی عطر جیسی خوشبو سے مہکانے سے پہلے ہی اس سے اس کی معصومیت کیوں چھین لی گئی؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ظلم و ستم کا نشانہ بننے والی چودہ سالہ عارفہ کی زندگی اُس کی سگی خالہ خیرالنساء نے اُجاڑ دی۔ عارفہ کی آنکھوں میں بے پناہ خوف اور حسرت نمایاں ہے۔ اُس کے کرب زدہ چہرے پر ایک ہی سوال رقم ہے کہ اُس کا آخر قصور کیا تھا؟

میں نے پڑھا ہے اور آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہی ہوں کہ ظلم کا چہرہ بدلتا رہتا ہے لیکن خصلت نہیں بدلتی' وہ چاہے فرعون ہو' نمرود ہو یا پھر عیسیٰ کو صلیب پر مصلوب کرنے کا حکم دینے والا پونٹیس پیلیٹ ہو' سب کی فطرت میں' ان میں سے ہر ایک کی جبلت میں وہ ظلم' وہ مکر اور وہ نخوت ہے جس نے ابلیس کو قیامت تک کے لیے بارگاہِ عدل و نور سے راندۂ درگاہ کروایا تھا۔ ظلم کا انداز' اُس کا وار' اُس کے وار کی کاٹ جدا ہو سکتی ہے لیکن اُس کا نشانہ ہمیشہ مظلوم ہوتا ہے۔

عارفہ کی بدقسمتی یہ تھی کہ اُس کے والد عارف کو ایک مقدمے میں جیل ہوگئی' عارفہ کی ماں نسرین بی بی بلوچ اپنے آشنا سے محبت کے عہد و پیماں کر کے گھر سے ڈھائی لاکھ اور چھوٹے بیٹے کو لے کر فرار ہوگئی۔ اس گھر کی تباہی کا قصہ یہیں ختم نہیں ہوا' عارفہ کی خالہ خیرالنساء' عارفہ کو اپنے گھر لے آئی اور پھر اُس عورت نے کم عمر عارفہ کی محرومیت کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ اس نے عارفہ سے منشیات فروخت کروانی شروع کر دی تھیں۔ وہ عارفہ کو لڑکوں کو پھنسانے کی ترغیب دیتی اور کہتی کہ تم جوان اور خوبصورت ہو' اپنی جوانی سے فائدہ اٹھاؤ اور اس عمر میں دولت کماؤ جو زندگی بھر کام آئے گی مگر عارفہ ہر بار انکار کرتی' روتی اور واسطے دیتی مگر اس کے جواب میں خیرالنساء' عارفہ کو مارتی پیٹتی اور مختلف طریقوں سے ایذا پہنچاتی' کبھی جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتی تو کبھی فروخت کرنے کی بات کرتی تھی۔

اخبار میں عارفہ کی تصویر کی دید' میری آنکھوں کی مجبوری ہے' یقیناً قلم کا حق ادا کرنے کے لیے عارفہ کی مظلومی کی داستان اور ظلم و جور کے روزنامے کو قرطاس پر منتقل کرنا ایک مشکل امر ہے ورنہ میں تو

عارفہ کی تصویر سے نگاہیں چرا چکی تھی۔ معصوم عارفہ کا انکار جب شدت اختیار کرگیا تو اُس کی خالہ نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر اُسے پلادی اور پھر اُسے درندوں کے حوالے کردیا۔ عارفہ جب ہوش میں آئی تو وہ برباد ہوچکی تھی' لٹ چکی تھی اور اُس کی دہشت اور وحشت ناک آنکھوں میں سوائے آنسوؤں کے کچھ بھی نہیں تھا' لفظ گنگ ہوچکے تھے اور اس مرحلے پر بھی خیرالنساء' عارفہ کو زبردستی اسی کام یعنی جسم فروشی پر اکسارہی تھی کیونکہ وہ عارفہ کی ویڈیو بنا چکی تھی جس کے ذریعے وہ اب اُسے بلیک میل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

ایک عورت وہ بھی جو خالہ والے رشتے کی حامل ہو' بھلا اپنی فرشتوں کی طرح معصوم بھانجی کے ساتھ ایسا سلوک کیسے کرسکتی ہے؟ یہ سچ دیکھنے اور پڑھنے کے بعد بھی میرا دل اس سچائی کو تسلیم نہیں کرتا مگر سچ تو یہی ہے کہ زمانۂ قدیم سے اپنے ہوں یا پرائے' خواتین اور کم عمر لڑکیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے آئے ہیں' کہیں حوا کی بیٹی کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے تو کہیں حوا کی بیٹی کو اپنے مفادات کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے اور کہیں سسرال میں حوا کی بیٹی پر تیل چھڑک کر آگ لگادی جاتی ہے اور پھر مجرم پکڑے بھی جاتے ہیں' مقدمات بھی درج ہوتے ہیں لیکن ہمارے ملک کا قانون اتنی سست روی سے ان مقدمات کی سماعت کرتا ہے کہ ملزمان ناکافی ثبوت وشواہد کا فائدہ اٹھا کر سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

خیرالنساء کا اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی بھانجی عارفہ پر ظلم وستم جاری تھا کہ وہ کسی نہ کسی صورت فرار ہوکر اپنی جان اور عزت بچانے کی خاطر اپنے چچا کے گھر پہنچ گئی تھی۔ عارفہ کے چچا نذیر نے اپنی بھتیجی کی مدد کے لیے قانون کا ہر دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کسی نے اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ عارفہ کی خالہ خیرالنساء کے خلاف نہ تو کوئی ایف آئی آر درج کی گئی اور نہ ہی اَب تک کوئی قانونی چارہ جوئی کی گئی ہے۔ اس حوالے سے عارفہ کا کہنا ہے کہ اُس کی خالہ کے گھر کئی پولیس اہلکار بھتہ لینے آتے ہیں' شاید اسی لیے وہ خیرالنساء خالہ کو کچھ نہیں کہتے۔

ہمارے ملک میں جہاں آزاد عدلیہ' پارلیمنٹ کی بالادستی ہے' قانون کا بول بالا ہے' وہاں آج بھی جمہوریت کے دور میں قانون کی مدد کے حصول اور انصاف کی فراہمی کے لیے کمزور لوگوں کو دربدر کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ عارفہ کو انصاف ملے گا یا نہیں؟ عارفہ کا مستقبل کیسا ہوگا؟ عارفہ کے ساتھ ساتھ عزیز نگر اورنگی ٹاؤن کی صبا بھی مجھے نہیں بھولتی جب سے میں صبا سے مل کر آئی ہوں' سچ کہوں' بہت مضطرب ہوں۔ میرا تو اب رونے کا دل بھی نہیں چاہتا کیونکہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب آنسو بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ سترہ سالہ صبا نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ہفتے پہلے تک بہت خوش تھی کیونکہ اگلے مہینے اُس کی شادی ہورہی تھی۔

''میں نے پوچھا' ہورہی تھی' سے تمہاری مراد کیا ہے؟'' تو وہ رونے لگی۔ میں اُس کے رونے کی وجہ جانتی ہوں اس لیے میں نے اُسے دلاسہ دینے کی ناممکن کوشش کی۔

''آپ کو پتا ہے' ہم غریب لوگوں کی سب سے بڑی مجبوری جہیز ہے' میں سات بہن بھائیوں میں پہلے نمبر پر ہوں۔ جوں ہی میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا' میرے ماں باپ کو میرے لیے جہیز جمع کرنے کی فکر ستانے لگی لیکن جو باپ اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی نہیں کھلا سکے' سوچیے' اُس کے لیے جہیز جمع کرنا کتنا تکلیف دہ امر ہوگا؟'' صبا نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا تھا۔ ''ایک دن مجھ سے میرے بابا نے پوچھا کہ تمہیں جہیز میں کون سی ایسی چیز ہے جو ہر قیمت پر چاہیے؟ تو میں نے کہا۔ ''ڈنر سیٹ۔''

''کیا ڈنر سیٹ؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

''جی ہاں' ڈنر سیٹ۔ اپنے گھر میں اسٹیل کے برتن دیکھ دیکھ کر مجھے شدید چڑ محسوس ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ یہی سوچتی ہوں کہ میرے گھر میں کانچ کے برتن کیوں نہیں ہیں؟ خوش رنگ پھولوں والی پلیٹوں میں' میں کیوں نہیں کھانا کھاسکتی؟ اسی لیے میں نے اپنے بابا سے فرمائش کی کہ مجھے کچھ دیں یا نہ دیں مگر ایک اچھا سا ڈنر سیٹ ضرور دیجیے گا۔''

''اچھا......'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''اور آپ جانتی ہیں' میری اس فرمائش پر بابا کی آنکھیں تک مسکرانے لگیں' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا اور اسے اس کی پسند کا ڈنر سیٹ دلا کر لاؤں گا۔''

''ہوں......'' میں نے اسی پر اکتفا کیا۔

''جس کڑے سے میرا بیاہ ہورہا تھا' اس کے ماں باپ بہت لالچی تھے' وہ آئے دن میرے بابا کے کان بھرتے رہتے' میری امی کو پریشان کرتے رہتے' نت نئی فرمائشیں تھیں ان کی' جہیز میں یہ چاہیے' جہیز میں وہ چاہیے۔ میں چھپ چھپ کے سنتی رہتی لیکن میں کچھ کہہ نہیں پاتی۔ میں جانتی ہوں' والدین مجبور ہیں' پہلی مجبوری تو یہ کہ کم آمدنی کی وجہ سے میرے لیے جہیز اکٹھا کرنا اُن کے لیے کسی بار سے کم نہیں جبکہ دوسری مجبوری یہ کہ آج کے دور میں کماؤ پوت ملتا کہاں ہے اور میری یہ خوش قسمتی تھی کہ میرا ہونے والا شوہر کماتا تھا۔'' صبا نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو دوپٹے کے کونے

# غزل

مرے کردار کو سوچو ذرا تمثیل سے پہلے
ادھورا کررہے ہو کیوں مجھے تکمیل سے پہلے

تمہارے حکم پر کیسے سرِ تسلیم خم کردوں
مجھے ساری وضاحت چاہیے تعمیل سے پہلے

اندھیرے کو مٹانے کے بھی کچھ دستور ہوتے ہیں
اُجالا مانگ کر لاؤ کسی قندیل سے پہلے

بڑا انسانیت سے اور کیا درجہ یہاں ہوگا
کبھی سوچا ہے یہ انسان کی تذلیل سے پہلے

نظر آتے ہیں خط پہ نام کے نیچے کئی آنسو
بہت حیران قاصد ہوگیا ترسیل سے پہلے

ارم کرتی نہیں اِس دل کا سودا زر کی چاہت میں
وہ نیت دیکھ لیتی ہے تری زنبیل سے پہلے



اِرم زہرا

میں جذب کیا۔

”ایسے نہیں کہتے‘ تمہاری اَب بھی شادی اُسی انداز میں ہوگی جیسے تم چاہتی ہو۔“ اُس کی ذہنی کیفیت اِس وقت میری سمجھ سے باہر تھی اس لیے مجھ سے جو بن پڑا‘ میں نے کہہ دیا لیکن میرے جواب پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی‘ یقیناً اُس کی آنکھوں میں اپنے بابا کا چہرہ گھوم گیا ہوگا جو اپنے تیرہ سالہ بیٹے محمد ذیشان کو بلانے گھر سے نکلے تھے۔ ذیشان قریبی دکان تک گیا تھا اور گھر میں دستر خوان پر سب اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ باپ سے صبر نہیں ہوا تو وہ خود بیٹے کو بلانے کے لیے گلی کے نکڑ تک ہی آیا تھا کہ طاغوت اور جبروت کی خودکار رائفلوں سے بارش کی طرح سے آتی ہوئی گولیوں نے محمد اعظم کا سینہ چھلنی کر دیا تھا اور پھر دہشت گرد اپنی بولی بولتے موٹر سائیکلوں پر سوار آناً فاناً غائب ہو گئے مگر صبا اور اُس کے گھر والوں پر قیامت گزر گئی تھی۔

”یقیناً بابا کے جانے کے بعد زندگی مشکل ترین ہو گئی ہوگی لیکن صبر سے کام لو۔ انشاء اللہ‘ سب اچھا ہو جائے گا۔“ میرا لہجہ سپاٹ تھا اور چہرہ احساسات سے عاری‘ شاید میرا ضمیر ایک پل کے لیے مردہ ہو گیا تھا۔

”سب اچھا ہو جائے گا؟“ صبا زیرِ لب بڑبڑائی تھی۔ ”جس وقت میرے باپ کا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا‘ اُس وقت میری ہونے والی ساس نے میری ماں کو سہارا دینے کے بجائے اُن کا ہاتھ آہستگی سے دباتے ہوئے کہا تھا کہ اب یہ رشتہ ہماری طرف سے تم ختم سمجھو۔“ صبا کی آنکھوں سے جھرنا پھوٹا تھا اور لب کرب سے لرز رہے تھے۔

میں خود بھی ایک لڑکی ہوں‘ اُس وقت صبا کا چہرہ پڑھتے ہوئے میرے اوسان بھی خطا ہو چکے تھے۔ میں مرے ہوئے قدموں سے پلٹ آئی تھی۔

’جہیز ایک لعنت ہے تو پھر ہم اس پر لعنت کیوں نہیں بھیج دیتے؟‘ میرے اپنے لفظوں کی بازگشت میرے کانوں میں دھماکے کر رہی تھی۔

”اوہ خدایا! صرف اس وجہ سے شادی سے انکار کر دیا گیا کہ اب اُن کو جہیز ملنے کی امید نہیں تھی۔ جہیز تو دور کی بات‘ صبا اور اُس کے گھر والوں سے اُن کا سایہ ہی چھین لیا گیا۔ کوئی قصور نہیں‘ کوئی دشمنی نہیں‘ نامعلوم افراد جانے کس کے نام کی گولیاں محمد اعظم کے سینے میں اتار گئے؟ دہشت گردوں کی کھلی آزادی اور روزانہ کی ٹارگٹ کلنگ آخر کب تھمے گی؟ آخر کیوں حکومت اور قانون نافذ کرنے والے ادارے وسیع اختیارات کے باوجود مصلحتاً کمزور اور دہشت گرد طاقتور نظر آتے ہیں؟

سال کے بارہ مہینے قتل و غارت گری اور خون ریزی کا بازار گرم رہتا ہے اسی لیے اب شہر کراچی کو دنیا کی ایسے دس خطرناک شہروں میں شمار کیا جانے لگا ہے جہاں کسی کی جان و مال محفوظ نہیں۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ آج مارنے والا بھی یہ نہیں جانتا کہ وہ کسے اور کیوں مار رہا ہے؟ کرائے کے قاتل کیسے اس کمائی سے جانے کیسے نوالے اپنے حلق سے اتارتے ہیں؟ کیا ان کی نظروں میں وہ معصوم گھرانے نہیں گھومتے جن کے وارث کو مار کر ان کے منہ سے نوالے چھین لیے جاتے ہیں۔ کاش کوئی ان کے بارے میں سوچے تو سہی‘ آخر ان کا قصور کیا ہے؟

شاید میں ناسمجھ ہوں جبھی ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہوں کہ قصور کس کا ہے؟ زمین کا‘ تاریخ کا کہ اس انسانی جبلت کا جس کے متعلق فرشتوں نے آدمِ خاکی کی تخلیق کے وقت ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا!!





مسعود جاوید



# پاکستان کا مسافر

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

**ہندوستان کی سرزمین سے جڑی ایک معروف صحافی کی سفر کہانی۔ آخری حصہ**

یہ تمام چیزیں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا مگر پہلے میری آنکھوں میں شوق اور تجسس تھا جبکہ اب ایک عجیب سا خوف‘ اپنے گرد ایک نادیدہ حصار اور پابندیاں محسوس ہو رہی تھیں اور اس کی وجہ اٹاری سے جے پور تک کے سفر کے دوران پولیس والوں کا جارحانہ رویہ تھا جس کی وجہ سے سارے سفر میں ایک بےزاری‘ کوفت اور گھٹن محسوس ہوتی رہی تھی اور یہ کیفیت کافی عرصے تک مجھ پر طاری رہی تھی لیکن پھر کچھ دیکھنے اور سیکھنے کی فطرت نے مجھے یہاں کے لوگوں کی زندگی کی طرف متوجہ کر دیا اور میں نے دیکھا کہ راجستھان کا مسلمان معاشرتی اور معاشی لحاظ سے دوسرے اور تیسرے درجے کا انسان ہے‘ چھوٹے گھر‘ بڑے کنبے‘ محدود وسائل اور لامحدود خواہشیں اور یہ سب کچھ دیکھ کر یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ اپنی اس کمتری کا ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ بذاتِ خود یہاں کا مسلمان ہے کہ اس کی اپنی کاہلی نے‘ سستی نے‘ جہالت نے اور کنوئیں کی دیواروں میں مگن رہنے کی عادت نے اسے وقت سے بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ عام طور پر گھروں میں بچے کو چھ‘ سات سال کی عمر میں ہاتھ میں کتابیں دینے کی بجائے نگینوں کی گھسائی کے لیے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اسکول کا راستہ دکھانے کی بجائے نگینے کے کسی کارخانے کے دروازے پر لا کھڑا کیا جاتا ہے اور وہاں کا نوجوان بیس‘ پچیس روپے کما کر اپنے آپ کو ایتابھ بچن سمجھنے لگتا ہے۔ میں نے وہاں درجنوں ایسے نوجوان دیکھے جو صبح ۱۰ بجے کارخانے گئے اور بارہ بجے تک بیس‘ پچیس روپے کی روزی کما کر بارہ بجے دن سے رات کے دس‘ گیارہ بجے تک چائے کے کیبن پر بیٹھ کر وقت ضائع کرتے ہیں اور کمال بات یہ تھی کہ نہ تو خود انہیں وقت کے ضیاع کا احساس تھا اور نہ ہی انہیں یہ احساس دلانے والا کوئی تھا حتیٰ کہ خود

ان کے بزرگ بھی۔ ہاں البتہ میں نے مذہب اور پاکستان سے متعلق ان کے دلوں میں اندھی محبت اور عقیدت ضرور دیکھی۔ مجھے ایک صاحب نے بتایا کہ شارجہ کپ اور پھر ورلڈ کپ میں پاکستان کی فتح کا جشن اس طرح منایا گیا تھا جیسے وہ لوگ بھارت میں نہیں' پاکستان میں رہتے ہیں اور مسلمانوں کے اس اجتماعی رویئے اور اندازِ فکر ہی کی وجہ ہے کہ وہاں کا ہر صاحبِ اختیار ہندو' مسلمانوں سے بدلہ لینے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور چونکہ مسلمانوں کی نئی نسل کی اکثریت تعلیم سے ناآشنا ہے لہٰذا وہ قانون کے جال میں پھنستی چلی جاتی ہے۔

یہ حقیقت بھی ہے کہ وہاں کا مسلمان ہم سے زیادہ مذہبی ہے لیکن مذہب کی بنیادی چیز یعنی ''علم حاصل کرو۔'' سے ناآشنا ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی میں محرومی' اندھیرا اور سناٹا نظر آتا ہے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا' محسوس کرتا رہا' کڑھتا رہا اور پھر ایک دن جے پور سے احمد آباد اور پھر احمد آباد سے بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔

خوبصورت نقاشی' ماہرانہ طرزِ تعمیر اور قابلِ دید عمارتوں اور مسجدوں کا شہر احمد آباد' بھارتی صوبہ گجرات کا ایک اہم تجارتی مرکز ہے جہاں گجراتی ثقافت بہت بھرپور انداز میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہاں میرا ہم سفر اور ساتھی تنویر تھا جو مجھے جے پور میں اتفاقاً ہی سندھی کیمپ کے بس اسٹینڈ پر مل گیا تھا اور پھر ہم حیدر آباد کی ریشم گلی یاد کرتے ہوئے بمبئی کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے اور اس سفر کا پہلا پڑاؤ احمد آباد تھا جسے آئے دن ہونے والے ہندو مسلم فسادات کے ڈر سے جلدی جلدی دیکھ کر ہم شام چھ بجے ٹرین میں بیٹھ کر بمبئی کے لیے چل دیئے تھے اور پھر دوسرے دن صبح تقریباً ساڑھے چھ بجے ہم بمبئی کی بلند و بالا عمارتیں اور ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ آباد کچی بستیاں جنہیں وہاں کی زبان میں ''جھونپڑپٹی'' کہا جاتا ہے' دیکھتے ہوئے بمبئی کی حدود میں داخل ہوچکے تھے۔ انڈین آرٹ فلموں میں بارہا دیکھے ہوئے مناظر آج سچ مچ ہمارے سامنے تھے۔ ٹین کی چادروں سے ڈھکی چھتیں ایک دوسرے میں گھسے ہوئے چھوٹے چھوٹے ادھ کچرے سے مکانات' مکانات کے درمیان پتلی پتلی گندی گلیاں' گندی نالیاں' کیچڑ میں دھنسے ٹیڑے میڑھے پگڈنڈی نما راستے۔ ٹرین آہستہ روی سے کھسکتی رہی۔ میں اور تنویر کھڑکی سے منہ نکالے اشتیاق اور تجسس سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک کچے سے مکان کے ٹوٹے ہوئے دروازے میں کھڑی ایک سانولی سی مگر جوان عورت نے ہماری طرف دیکھا اور اپنی ایک آنکھ دبادی۔ میں نے تنویر کی طرف اور تنویر نے میری طرف دیکھا اور ہنس دیئے۔ ٹرین کھسکتی رہی اور پھر بمبئی سینٹرل کے ایک پلیٹ فارم پر رک گئی۔

بمبئی شہر کا مرکزی ریلوے اسٹیشن یہ بمبئی سینٹرل تھا۔ میں نے اور تنویر نے اپنا اپنا بیگ کندھے سے لٹکایا اور ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر آگئے اور باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھائے تھے کہ ہماری نظر چند پولیس والوں پر پڑی جو چند مسافروں کو گھیرے ان کے سامان کی تلاشی لے رہے تھے' یہاں سے جانے والے کھیپیوں کی وجہ سے اور کچھ سیاسی حالات کی وجہ سے ان دنوں وہاں کی پولیس تلاشی کو حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے عام مسافروں کو بھی اپنی پولیس کی طرح کمائی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مسافر کراچی کی مخصوص کھیپی زبان میں اپنی وضاحت پیش کررہے تھے جبکہ پولیس والے مرہٹی میں اپنی بولی بول رہے تھے۔ میں کچھ دیر رک کر یہ صورتِ حال دیکھنا چاہ رہا تھا مگر تنویر نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچتے ہوئے باہر کی طرف چل دیا جہاں سے ہم ہوٹل کی طرف چل دیئے۔





عموماً کہا جاتا ہے کہ انڈیا کا بمبئی اور پاکستان کا کراچی تقریباً ایک جیسے شہر ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں شہروں میں صرف یہ ہی مماثلت ہے کہ یہ دونوں شہر ساحلِ سمندر پر واقع ہیں یا پھر آبادی کے لحاظ سے انسانوں کا جنگل ہیں ورنہ بباطن ایک دوسرے سے بہت مختلف اور متضاد ہیں۔ کراچی کی عام زندگی میں خواتین کا احترام ہماری معاشرتی زندگی کا ایک اہم اور عام رویہ ہے جبکہ بمبئی میں سینما ہال ہو یا بسیں' ہوٹل ہوں یا عام سڑکیں' خواتین کی برابری کی بنیاد پر راستہ حاصل کرنے کے لیے اپنی ہی کہنیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کراچی میں معاشرتی زندگی تین درجوں یعنی نچلے' درمیانے اور بالائی درجے میں بٹی دکھائی دیتی ہے جبکہ بمبئی میں صرف دو طبقے نظر آتے ہیں یعنی نچلا طبقہ یا پھر بلند طبقہ اور یہ ہی وجہ ہے کہ بمبئی میں ایک درمیانہ درجے کے فلیٹ کی قیمت تیس سے چالیس لاکھ تک ہے۔ میں اور تنویر 'بم بم بم بمبئی' ہم کو جم گئی بمبئی' گنگناتے ہوئے گھومتے رہے۔

پاکستان سے آنے والے یہاں زیادہ تر بھنڈی بازار اور محمد علی روڈ میں واقع ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں اور اسی علاقہ کو بادی النظر میں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ہم کراچی کے کھارادر یا حیدر آباد کی چھوٹی گٹی یا لاہور کی پرانی انارکلی یا نیلا گنبد کے علاقے میں گھوم رہے ہوں۔ لوگوں کی چہل پہل' اُردو میں اچھلتے جملے' عام لوگوں کا رویہ' اس علاقہ کو دہلی کی جامع مسجد اور چاندنی چوک کے علاقہ کی طرح ''منی پاکستان'' بنا کر پیش کرتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ پاکستان سے آنے والے زیادہ تر فارس روڈ' فاکلینڈ روڈ یا پیلا ہاؤس کے علاقے میں سر اٹھائے مختلف نمبروں والی کھڑکیوں کی طرف دیکھتے اور زینہ چڑھتے اور کچھ دیر بعد ہانپتے کانپتے اترتے نظر آتے ہیں یا پھر گیٹ وے آف انڈیا کے عقب میں مال روڈ کی طرف جانے والے راستے پر واقع نائٹ کلبس ہیں یا پھر باندرہ' سانتا کروز اور پالی ہل میں واقع فلمی اداکاروں کے گھروں کے اطراف میں چکر لگاتے دکھائی دیتے ہیں۔

چونکہ ہم بھی اصلی تے وڈے پاکستانی ہیں لہٰذا اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے بھی کراچی کے صحافی دوستوں سے حاصل کیے گئے پتوں کو کھنگالا تو پتہ چلا کہ سلمان خان' روینہ ٹنڈن' گلشن گروور وغیرہ آؤٹ ڈور شوٹنگ پر اوٹی گئے ہوئے ہیں جبکہ جیتندر' ریکھا' سری دیوی' انیل کپور' متھن چکرورتی' وغیرہ سے محبوب اسٹوڈیوز اور ایسل آؤٹ ڈور لوکیشن اسٹوڈیو میں ملاقات ہوگئی۔ ایسل اسٹوڈیو بمبئی سے تقریباً ستر کلومیٹر دور ایک علیحدہ اسٹیٹ میں واقع ہے جہاں باقاعدہ فلورز کی بجائے قدرتی مناظر دیکھنے میں آئے۔ پہاڑیاں' برساتی نالے' پل' گھاٹیاں' جنگل' غرض یہ کہ ایسل اسٹوڈیو قدرتی مناظر کی شوٹنگ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جسے دیکھ کر احساس ہوا کہ بھارت میں فن کو ایک صنعت کا درجہ بلاوجہ ہی نہیں مل گیا ہے۔

میناکشی سے اس کے اپارٹمنٹ میں ملاقات رہی اور اس ملاقات میں وہ شروع سے آخر تک ایک عام سی لڑکی کی حیثیت سے ہمارے ساتھ رہی۔ انداز میں سادگی' گفتگو میں بے تکلفی' پاکستان میں اپنی فلموں اور اداکاری سے متعلق ناظرین کی رائے جاننے کے بارے میں تجسس اور شوق۔ میں نے اس کی اداکاری سے متعلق تنقید بھی کی اور مجھے خوشی ہوئی جب اس نے نہ صرف اپنی خامیوں کو تسلیم کیا بلکہ تنقید

کے صلے میں اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کافی کیک اور کافی کا حلوہ کھلایا۔ دو ڈھائی گھنٹہ کی اس ملاقات کے اختتام پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ فلمی ہیروئن نہیں بلکہ میری گرل فرینڈ ہے اور ہم اس سے ملاقات پر نہیں ڈیٹنگ پر آئے ہوئے ہیں اور ایسا ہی اپنائیت بھرا تاثر جیکی شیروف سے مل کر ہوا۔ بے تکلفانہ اور اپنائیت بھرے انداز میں ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ فرش پر بٹھا لینا' اپنے بیٹے کو گود میں بٹھا کر اس کی 'بدمعاشی' کے قصے سنانا اور پھر کھانے کے وقت اپنی بیوی آئشہ کو زور زور سے آواز دے کر بلانا اور ہماری مظلومیت کی فرضی منظر کشی کر کے کھانے کے لیے درخواست کرنا اور رخصت ہوتے وقت میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے پھر آنے کا پیار بھرا حکم دینا' مجھے اپنے یہاں کے فلمی اداکار یاد آ گئے' اکڑی ہوئی گردنیں' تنے ہوئے جسم' چھچھوری' سطحی باتیں اور بازاری انداز۔ شام ہو چکی تھی' ہم باندرہ سے چوپاٹی کی طرف چل دیئے۔

چوپاٹی پہنچ کر پتہ چلا کہ ساحلِ سمندر کی تفریح کسے کہتے ہیں حالانکہ یوں تو گزشتہ دو روز میں ہم نے تفریح کے بہت سے انداز بہت ہی سستی قیمت میں دیکھ لیے تھے لیکن یہاں پہنچ کر ہمیں ایسا لگا جیسے ہم ایشیا کے کسی ملک میں نہیں بلکہ یورپ کی کسی ساحلی تفریح گاہ پر نکل آئے ہوں' بینچوں پر' ساحلی ریت پر' دال پوری کے ٹھیلوں کے پاس' نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آس پاس کے ماحول سے بے پرواہ' ایک دوسرے سے 'تفریح' حاصل کرنے میں مصروف تھے اور ہم بمبئی کے ساحل پر میامی بیچ کے مزے لوٹتے ہوئے آوارہ گردی کرتے رہے اور پھر نہ جانے کب رات نے اپنی آمد کا احساس دلایا اور ہم نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ چوپاٹی کے نزدیک ہی حاجی ملنگ باباؒ کا مزار سمندر کے درمیان واقع ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے فجر کی نماز کے بعد سمندر کے پانی میں خشکی کا ایک پگڈنڈی نما راستہ ابھر آتا ہے اور پھر مغرب کی اذان کے ساتھ ہی یہ راستہ سمندر کے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ لوگ اس مزار اور راستے کو باباؒ کا معجزہ قرار دیتے ہیں اور چونکہ رات ہو چکی تھی لہٰذا ہم شہر کی طرف چل دیئے۔

چوپاٹی ہی کے نزدیک یہاں کا معروف فشرمین نائٹ کلب ہے جہاں مردوں کے لیے داخلہ فیس مبلغ سو روپے اور خواتین کے لیے مبلغ پچاس روپے ہے گو کہ اس کلب میں بظاہر ڈسکو ڈانس ہوتا ہے مگر یہاں آنے والے ڈسکو سے زیادہ 'شکار' کرنے اور 'شکار ہونے' میں دلچسپی لیتے ہیں کہ یہ کلب بمبئی میں 'تفریح' حاصل کرنے کے لیے آنے والوں کی پسندیدہ ترین 'شکارگاہ' ہے حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ سارا شہر ہی شکارگاہ لگتا ہے جہاں بسوں میں' بس اسٹاپ پر' فٹ پاتھ پر' سنیما کی قطار میں' کماٹھی پورا کے مکانوں میں' فاکلینڈ روڈ کی کھڑکیوں میں' پیلا ہاؤس کے زینوں پر' بڑی بڑی دکانوں کی شوروموں کے آس پاس' جگہ جگہ بنے ہوئے بار کے کاؤنٹرز پر' ریستورانز کی مختلف میزوں پر' راہ چلتے کسی فٹ پاتھ پر کوئی بھی 'شکار' کر سکتا ہے' کوئی بھی 'شکار' ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے یہ شہر' کراچی سے بہت بلند' بہت عظیم لگا کیونکہ یہاں لوگوں کی تفریح کے لیے' صحت کے لیے' جگہ جگہ باغات اور پارکس موجود ہیں جن کے سبزہ زار تختوں پر ننگے پیر دوڑتے ہوئے مجھے عجیب سا لطف آ رہا تھا اور دوڑتے دوڑتے میں سوچ رہا تھا کہ انسان کے قدموں تلے موجود یہ سبزہ قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے جسے دولت کی ہوس میں ہم نے خود اپنے ہاتھوں گنوا کر بڑی بڑی بلڈنگیں تو کھڑی کر لی ہیں لیکن ان کے بدلے لاتعداد ذہنی اور جسمانی بیماریاں خرید لی ہیں۔ سبزے کو بھول کر ہم نے سیمنٹ اور ریتی میں پناہ لے لی ہے جبکہ بمبئی جیسے انسانوں کے جنگل میں اب بھی قدرت کی اس نعمت کو سنبھال کر رکھا جا رہا ہے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے بمبئی کے خوش نصیب لوگوں کو دیکھا اور تصور میں کراچی کے مظلوم لوگوں سے ان کا موازنہ کرنے لگا۔ 'ابے یار' تو گھومنے' کچھ دیکھنے' کچھ سیکھنے آیا ہے' اپنا کام کر کیوں خواہ مخواہ افلاطون بننے کی کوشش کر رہا ہے؟' میں نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی گدی پر زور سے ہاتھ مارا اور حقیقت کی دنیا میں واپس پہنچ کر بمبئی دیکھنے لگا۔

بمبئی اپنے مزاج' رہن سہن اور چال ڈھال کے حساب سے ایک عجیب ہی شہر ہے جہاں رنگ' نسل' زبان یا قومیت کی بجائے 'کام' دیکھا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں ہندو' مسلم' عیسائی یا یہودی کی بجائے صرف 'بمبئیا' دیکھا جاتا ہے۔ نام کے بجائے 'فن' دیکھا جاتا ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ متعصب ہندوؤں کی موجودگی کے باوجود نہ صرف فلمی صنعت میں بلکہ عام کاروباری دنیا میں بھی مسلمان چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہ خاصیت دیکھ کر مجھے اس شہر پر پیار آنے لگا اور اس سے پہلے کہ میں پیار کے بعد عشق میں ڈوبتا' تنویر نے مجھے یاد دلایا کہ آج ہمیں راج دھانی کے ذریعہ دہلی پہنچنا ہے۔ تنویر کے یاد دلانے پر مجھے احساس ہوا کہ اپنے بھاگ سے بمبئی کی بھیل پوری اور جل پانی کا ٹیم خلاص ہو گیا ہے لہٰذا ہم نے اپنے اپنے بیگ کندھوں سے لٹکائے' بمبئی کو دھنی واد کہا اور ٹرین میں سوار ہو گئے۔

*......*......*......*

دہلی اسٹیشن کا پرہجوم ماحول ایک مرتبہ پھر نظروں کے سامنے تھا۔ ٹرین سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا' اس مرتبہ ہم پلیٹ فارم نمبر چھبیس پر اترے تھے۔ بھانت بھانت کے لوگ' طرح طرح کے لباس' مختلف بولیاں' جینز میں' ٹراؤزر میں اور اسکرٹس میں ملبوس لڑکیاں' ساڑھیوں میں اور شلوار قمیصوں میں ملبوس عورتیں اور پتلونیں پہنے مرد پلیٹ فارم پر اِدھر سے اُدھر آ رہے تھے' جا رہے تھے اور ان ہی کے درمیان پینٹ شرٹ میں ملبوس اسمارٹ سے سکھ نظر آ رہے تھے۔ انڈیا میں جب بھی سکھوں پر نظر پڑتی ہے تو ذہن میں خود بخود اسمارٹ اور ہینڈسم کے الفاظ ابھر آتے ہیں اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہاں کے ڈھیلے ڈھالے' مجہول اور سست سے ماحول میں سکھوں کے لباس' چال ڈھال اور حرکات و سکنات میں ایک عجیب سی پھرتی اور زندگی نظر آتی ہے۔ میں اور تنویر ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے اپنی یادداشت کے سہارے باہر نکلنے کے راستے پر چلتے رہے اور بالآخر شیشے کے بڑے دروازے کو پار کرتے ہوئے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔ اسٹیشن کے احاطے سے نکل کر ہم کھڑے ہوئے۔ تنویر سائیکل رکشہ کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا اور میں سڑک کے اُس پار لوگوں کے ہجوم کی طرف دیکھنے لگا۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی دلی' مغل شہنشاہوں کی زبان سے نکلے لفظوں کو ہندوستان بھر میں قانون کا درجہ دینے والی دلی اور غالب کی شاعری سے گونجنے والی دلی ایک مرتبہ پھر میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں لوگوں کے ہجوم پر نظریں جمائے تصور میں اپنے پرکھوں کا جاہ و جلال اور نازک جذبوں کو لفظوں میں ڈھل کر شاعری کی صورت اختیار کرتے دیکھ رہا تھا کہ اسی دوران تنویر نے سائیکل رکشہ والے سے بھاؤ تاؤ کرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر رکشہ میں چڑھنے کا اشارہ کیا اور میں خالی

الذہنی کی کیفیت میں رکشہ میں بیٹھ گیا۔ رکشہ والے نے سائیکل کے پیڈل پر زور سے پاؤں چلایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی پنڈلی پر موٹی موٹی نسیں ابھر آئی تھیں۔ رکشہ نے رینگنا شروع کیا لیکن تھوڑی دور گئے تھے کہ ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے رکنا پڑ گیا۔ یہاں دلی میں بھی ہمارے کراچی کی طرح ٹریفک جام ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے آس پاس سائیکل رکشاؤں، موٹر رکشاؤں، اسکوٹروں اور کاروں کا ہجوم لگ گیا تھا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد ہمارے رکشہ نے دوبارہ رینگنا شروع کیا۔ سامنے ایک چھوٹا سا چوراہا تھا جہاں کھڑے ہوئے ٹریفک پولیس والے نے سیدھے ہاتھ کے ٹریفک کو روک کر ہماری طرف کلیئرنس دیا تھا لیکن اس کے باوجود ایک بس نے آگے نکلنے کی کوشش میں آدھی سڑک بلاک کر دی تھی جہاں سے بالآخر ہمارا رکشہ نکل آیا اور پھر بمشکل آٹھ منٹ کی مسافت کے بعد ہم چاندنی چوک سے ہوتے ہوئے جامع مسجد کے عقب میں چتلی قبر کو جانے والی چڑھائی کے پاس پہنچ گئے۔ میرا دیکھا بھالا، جانا پہچانا ماحول ایک مرتبہ پھر میرے سامنے تھا۔

جامع مسجد کے اردگرد کا یہ علاقہ ''منی پاکستان'' کہلاتا ہے کیونکہ سارے ہندوستان میں یہ واحد علاقہ ہے جہاں انگریزی یا ہندی کی بجائے چاروں طرف اُردو ہی اُردو نظر آتی ہے۔ دکانوں کے سائن بورڈوں پر، بک اسٹالوں پر رکھی کتابوں میں، لوگوں کی بات چیت میں جنہیں دیکھ کر، پڑھ کر اور سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بھارت میں نہیں بلکہ پاکستان کے کسی شہر میں گھوم رہے ہیں۔ جامع مسجد کے سیدھے ہاتھ پر ایک قطار میں کتابوں کی دکانیں ہیں جہاں دنیا کے ہر موضوع پر کتابیں مل جاتی ہیں۔ مجھے ہندوستانیوں کی قسمت پر رشک آنے لگا تھا جو کم از کم کتابوں کے معاملہ میں ہم سے لاکھوں درجے خوش نصیب ہیں کہ وہاں کتابیں بہت سستی ہیں۔ ہمارے یہاں جو کتاب دو ڈھائی سو روپے کی ملتی ہے، وہاں تیس بتیس روپے میں باآسانی مل جاتی ہے لیکن اس علاقہ کے لوگ ظلم کی حد تک چالاک اور کاروباری ہیں، ان کی نظر میں پاکستانی ''مرغے'' ہوتے ہیں جنہیں کاٹنا اور کاٹ کر کھا جانا ان کا پیدائشی حق ہے۔ دہلی پہنچ کر اور خاص طور پر مسلمانوں کے علاقہ میں پہنچ کر ہمارا خیال تھا کہ ''مسلمان'' ہونے کے ناتے ہم ''اپنوں'' کے درمیان رہ کر زیادہ محفوظ اور مطمئن ہوں گے لیکن تجربات نے ثابت کر دیا کہ اس علاقہ کے لوگوں کی نظر میں ہمارا مسلمان ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ان کے رویئے میں، انداز میں اور طرزِ عمل میں صرف اور صرف کاروباری عیاری اور خود غرضی جھلک رہی تھی۔ تنویر جو پہلے بھی اس علاقہ میں آتا رہا تھا، وہاں کے لوگوں کے رویئے کا عادی ہو گیا تھا اور جواباً ان ہی کے انداز میں گفتگو کر رہا تھا مگر مجھے شدت سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی اور اسی لیے میں نے ہوٹل کے کاؤنٹر پر آمد کے سو روپے دیتے ہوئے روانگی کے پچاس روپے بھی جمع کرا دیئے کہ یہاں کے مسلمانوں کے ہوٹلوں میں دہلی کے پولیس والے بذاتِ خود آ کر آمد و روانگی ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے کر دیتے تھے جس کے صلہ میں آمد کی فیس سو روپے اور روانگی کی فیس پچاس روپے مقرر کر دی گئی تھی۔ تنویر نے مجھے دو چار روز دہلی کی سیر کے لیے روکنا چاہا مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے دوسرے دن کی روانگی لے لی جس کے ساتھ ہی مجھے ایک اطمینان اور سکون سا محسوس ہونے لگا۔ اب میرے پاس دہلی میں گزارنے کے لیے بتیس گھنٹے تھے۔ میں تنویر کے ساتھ دہلی دیکھنے نکل کھڑا ہوا۔



دہلی کی مضافاتی بستی شانتی نگر میں ہندوؤں اور سکھوں کی ملی جلی آبادی میں پیدل گھومتے، کچوری اور بٹورے کھاتے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم لاہور کے دھرم پورہ یا حیدرآباد کے پریٹ آباد یا کراچی کے ملیر اور لانڈھی کے علاقے میں گھوم رہے ہوں۔ ویسے ہی لوگ، ویسے ہی رویئے، بس فرق تھا تو لباس کا لیکن یہ فرق بھی دلی جیسے شہر میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ہم نے آٹو رکشہ پکڑی اور نئی دہلی کے لیے چل پڑے اور نئی دہلی میں گھومتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کراچی کے ایم اے جناح روڈ پر گھوم رہے ہوں۔ ویسی ہی چوڑی، طویل سڑک، ویسے ہی بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں کا ہجوم، ویسی ہی تیز رفتار زندگی۔ گھومتے گھومتے پتہ چلا کہ پاکستان سے آنے والے کھیپیوں نے اپنے اس بڑے مرکز کو بھی عام پاکستانیوں کے لیے ایک مشکل جگہ بنا دی ہے۔ بس اسٹاپوں پر، ریلوے اسٹیشن پر وہاں کی پولیس چیکنگ کی آڑ میں جس پاکستانی کو چاہتی ہے، پکڑ لیتی ہے اور اپنے روایتی حربوں کے ذریعہ بلاوجہ تنگ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے جی پی روڈ پر پاکستانیوں کا وہ ہجوم نظر آیا جو بمبئی کے پیلا ہاؤس یا فاکلینڈ روڈ پر نظر آیا تھا۔ دہلی میں ہم نے کراچی کے علاوہ سرحد سے آئے ہوئے کھیپیوں کی ایک بہت بڑی تعداد دیکھی جو اپنے مخصوص لباس اور حلیے کی وجہ سے سب سے علیحدہ اور نمایاں نظر آ رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ یہ کھیپی کراچی والوں سے قطع نظر، کپڑے یا اسی قسم کے دوسرے سامان کی بجائے ذرا مختلف قسم کے سامان کی کھیپ لاتے ہیں۔

پھر دوسرے دن ساڑھے سات بجے شام میں سمجھوتہ ایکسپریس میں بیٹھا پلیٹ فارم پر کھڑے تنویر کو الوداع کہتا ہوا اپنے پاکستان کے لیے واپسی کا سفر کر رہا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا، ٹرین نے آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑا۔ کھڑکی میں بیٹھ کر دہلی کی دور ہوتی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ لال قلعہ کی عظیم الشان دیواریں آہستہ آہستہ نظروں سے دور ہوتی چلی گئیں اور میں نے کھڑکی میں سے آخری مرتبہ دہلی کو دیکھتے ہوئے اپنا سر اندر کر لیا۔ ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔

سمجھوتہ ایکسپریس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ریزرویشن کرائے بغیر بھی مسافر کو سیٹ ہی نہیں بلکہ برتھ بھی آرام سے مل جاتی ہے کیونکہ یہ ٹرین پاکستان اور بھارت کے درمیان سفر کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے اور اسی لیے میں بھی کھڑکی سے ٹیک لگا کر برتھ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا تھا مگر چند منٹ بعد ہی بیس، پچیس نوجوان ہمارے ڈبے میں آ گئے اور میری سیٹ کے آس پاس کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ وہ لوگ حلیے سے اور آپس کی گفتگو سے پڑھے لکھے لگ رہے تھے۔ سیٹوں پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے مجھ سے کمبل مانگا۔ آمنے سامنے بیٹھ کر اپنے اپنے گھٹنوں پر کمبل بچھایا اور تاش کھیلنے لگے۔ ان کی گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ دہلی میں ملازمت کرتے ہیں اور اب اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ ٹکٹ چیکر کے آنے پر انہوں نے اپنے اپنے ماہانہ ریلوے پاس دکھائے اور تاش کے کھیل میں مگن ہو گئے۔

ٹرین کو روانہ ہوئے آدھا گھنٹہ ہوا ہو گا جب ہمارے ڈبے میں دو پولیس والے آ گئے اور آتے ہی مسافروں سے بیس بیس روپے لینا شروع کر دیئے۔ یہ بھارتی ریلوے پولیس کا 'بھتہ' تھا۔ یہ بھتہ سکھ پولیس والے مسافروں سے درخواست کرتے ہوئے التجائیہ انداز میں مانگتے ہیں جبکہ ہندو پولیس والے تحکمانہ بلکہ کسی قدر جارحانہ انداز میں وصول کرتے ہیں۔ میں نے بیس روپے دیئے

اور دہلی ریلوے اسٹیشن کا وہ منظر یاد کرنے لگا جب کھڑکی نمبر 54 پر میں نے دہلی سے حیدر آباد تک کے ٹکٹ کے لیے سوسو کے دو نوٹ نکال کر بکنگ کلرک کو دیئے تھے اور اس نے میری نظروں ہی کے سامنے سو کا ایک نوٹ اپنی دراز میں ڈال کر دس روپے نکالتے ہوئے ایک سو دس روپے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ تو ایک سو دس روپے ہیں اور پیسے دو۔''

اور میں نے دلی کے اس ٹھگ کی یہ ساری حرکت دیکھنے کے باوجود فوراً مزید پیسے دے کر ٹکٹ لے لیا تھا کیونکہ دہلی کے لوگوں سے میں جلد دور ہو جانا چاہتا تھا۔ یہ منظر یاد آتے ہی مجھے لاہور اسٹیشن کے قلی یاد آ گئے اور میں نے دونوں کو درجنوں کے حساب سے گالیاں دیتے ہوئے' کھڑکی میں سے باہر اندھیرے میں دیکھنا شروع کر دیا۔ ٹرین چلتی رہی پھر پانی پت کا اسٹیشن آ گیا جہاں دہلی سے چڑھنے والے نوجوانوں کا ٹولہ اتر گیا۔ ڈبے میں خاموشی چھا گئی اور میں برتھ پر پھیل کر لیٹ گیا۔ ٹرین چلتی رہی' میں جاگتا رہا اور پھر صبح کے ساڑھے پانچ بجے ٹرین رکی تو ہم ایک مرتبہ پھر اٹاری کے خوبصورت پلیٹ فارم پر تھے۔ ماحول میں ٹھٹھرا دینے والی سردی تھی لہٰذا میں نے اپنی جیکٹ کی زپ گردن تک چڑھا کر کمبل اوڑھا اور کبھی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اور کبھی ٹہلتے ہوئے وقت گزارنے لگا۔

تقریباً ساڑھے نو بجے جب پلیٹ فارم پر کسٹم اور امیگریشن کا عملہ دکھائی دیا اور دس بجے کے قریب کارروائی شروع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ بھارت والے بوڑھوں' خواتین اور معذوروں کا بہت زیادہ خیال رکھ رہے تھے اور بعض بوڑھوں کو انہوں نے چیکنگ کے بغیر ہی کلیئرنس دے دیا تھا۔ بھارتیوں کی یہ ادا مجھے بہت اچھی لگی۔ ضروری کارروائی سے فارغ ہو کر ہم لوہے کے جنگلے کی دوسری طرف کھڑی اسپیشل ٹرین میں سوار ہو گئے اور تقریباً دو بجے کے قریب ٹرین نے پاکستان کی جانب سفر شروع کیا۔

میں کھڑکی میں بیٹھا باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ واہگہ کے نزدیک گھوڑسوار دستہ ہماری ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا اور پھر پاک بھارت سرحد پر بھارتی حصہ میں مچان پر بیٹھے بھارتی فوجی نظر آئے اور پھر خاردار تاروں کی باڑھ نے سرحد کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ ہم پاکستانی سرحد میں اپنی زمین پر' اپنے ملک میں سانس لے رہے تھے۔ اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے آس پاس کی ہواؤں میں آزادی کی خوشبو پھیل گئی ہو۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکال کر دو تین گہرے گہرے سانس لیے۔ ٹرین چلتی رہی اور پھر کھیتوں کے درمیان رک گئی۔ یہ واہگہ چیک پوسٹ تھی جہاں امیگریشن ہونا تھا۔ ہم سب ٹرین سے اتر کر قطار میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے دیکھا' یہاں دو قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک قطار پاکستانی پاسپورٹ والوں کی اور دوسری بھارتی پاسپورٹ والوں کی۔ میرا نمبر آنے میں دیر تھی لہٰذا میں بھارتی پاسپورٹ والی قطار کی طرف دیکھنے لگا جہاں کھڑے مردوں اور عورتوں کے ہاتھوں میں پاسپورٹ کے ساتھ ساتھ پچاس پچاس روپے کے نوٹ بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ انٹری فیس تھی جو بھارتی مسافروں سے پاکستانی امیگریشن والے وصول کر رہے تھے۔ مجھے بھارتی حکام کی فیس یاد آ گئی کہ وہ پاکستانی عمل کا ردعمل تھا ورنہ دو سال پہلے اٹاری کے اسٹیشن پر یہ صورتِ حال نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ فیس وصول کرتے ہوئے پاکستانی امیگریشن کے لوگوں کے چہروں پر تحکم اور جارحانہ تاثرات تھے جبکہ بھارتی حکام کے چہروں پر نرمی اور



خجالت بلکہ کسی قدر شرمندگی سی ہوتی تھی۔

امیگریشن کے بعد ہم ٹرین میں بیٹھے اور کچھ دیر بعد ٹرین نے لاہور کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ لاہور اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ میں نے بیگ کندھے سے لٹکایا اور ہاتھ میں اٹیچی پکڑ کر پلیٹ فارم پر اتر پڑا۔ اترتے ہی میں نے دیکھا کہ کسٹم کی وردی میں ملبوس ایک شخص بیٹری سے چلنے والا مائیک ہاتھ میں تھامے مسافروں سے مخاطب ہو کر اعلان کر رہا تھا کہ گرین چینل ہونے کی وجہ سے مسافر کسٹم کرائے بغیر باہر جا سکتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ پھر وزیراعظم نواز شریف اور وزیر خزانہ سرتاج عزیز کو دُعائیں دیں اور کال کوٹھری نما شیڈ میں سے ہوتا ہوا باہر نکل ہی رہا تھا کہ سفید شلوار قمیص میں ملبوس ایک شخص میرے قریب آیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

''صاحب! بولو تو میں کسٹم کرائے بغیر آپ کا سامان باہر نکال دوں؟''

''کیا؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا اور اس نے بدستور سرگوشیانہ انداز میں اپنی بات دہرائی اور مجھے نہ جانے کیوں بڑی شدت سے تاؤ آ گیا' میرے منہ سے بے ساختہ دو تگڑی قسم کی گالیاں نکل گئیں اور اس سے پہلے کہ گالیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا' وہ تیزی سے مجھ سے دور ہوتا ہوا مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ میں اپنا سامان سنبھالے جنگلے سے باہر پلیٹ فارم پر آ گیا اور نظر دوڑائی تو سامنے ہی پلیٹ فارم نمبر چار پر کراچی ایکسپریس کھڑی نظر آئی۔ میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر کھڑے قلی' بھارت سے آنے والے مسافروں کو کراچی تک کے ٹکٹ کے بھاؤ بتا رہے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اکانومی کلاس کا ٹکٹ جو ایک سو پینتیس روپے کا تھا' یہاں بلیک میں ۲۸۰ روپے کا مل رہا ہے۔

لاہور پہنچ کر مجھے پتہ چلا کہ میں نے دہلی سے براہِ راست حیدر آباد کے لیے تھرڈ کلاس کا جو ٹکٹ لیا تھا' وہ ناکارہ ہو چکا ہے کیونکہ ہمارے یہاں تھرڈ کی بجائے اکانومی کلاس تھی اور اس کلاس کے ٹکٹ کا بندوبست دہلی اسٹیشن سے تاحال نہیں کیا گیا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میں نے سوچا کہ ایک دو روز لاہور کے دوستوں کے ساتھ رہ لوں پھر حیدر آباد چلا جاؤں گا لیکن یہاں کا ماحول دیکھ کر ایک مرتبہ پھر مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے ہی ملک میں' اپنے ہی لوگوں سے بلیک کے ٹکٹ کے لیے حامی بھری اور قلی نے میرا سامان سنبھالتے ہوئے کراچی ایکسپریس کی طرف تیزی سے قدم بڑھا دیئے۔

قلی نے ۲۸۰ روپے لے کر میرا سامان ایک ڈبے کے باتھ روم کے سامنے رکھا اور اندر کی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ٹرین نے روانگی کی وسل (whistle) دے دی تھی۔ میں قلی کی اشارہ کردہ سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک آدمی نے قریب آ کر مجھے بتایا کہ وہ اس کی ریزرو سیٹ ہے۔ میں سیٹ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا مگر ٹرین نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا' قلی نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ لاہور ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم ہے جہاں حکومتِ پاکستان کا نہیں بلکہ قلیوں اور ان کے سرپرستوں کا قانون چلتا ہے جس میں خاص طور پر بھارت جانے اور آنے والے سندھ کے مسافروں کے لیے صرف ایک لفظ لکھا ہے یعنی ''مرغا'' جسے جس طرح چاہیں' کاٹ سکتے ہیں' کھا سکتے ہیں۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی اور باتھ روم کے سامنے فرش پر ''مرغے'' کی طرح پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہ بہرحال یہ ٹرین مجھے

میرے گھر تک پہنچا دے گی۔

بابری مسجد کے بعد ہندوؤں کا دوسرا نشانہ متھرا کی عیدگاہ

متھرا شہر کے مرکزی بازار کے اختتام پر سامنے دور ایک بلند پہاڑی پر دو ڈھائی فٹ اونچے احاطے کے درمیان ایک وسیع و عریض مسجد بڑی تمکنت اور شان سے آسمان کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ متھرا کی عیدگاہ ہے جہاں متھرا کے مسلمان عید اور بقرعید کے علاوہ جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لیے بہت ذوق و شوق اور اہتمام کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ متھرا کی عیدگاہ کی پہاڑی کی چڑھائی پر اور دامن پر مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے جو معاشی اور معاشرتی لحاظ سے نچلے اور درمیانہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ عیدگاہ سے ذرا فاصلہ پر پہاڑی سے نیچے متھرا کا مندر واقع ہے' گو کہ یہ مندر پہاڑی سے کافی نیچے واقع ہے لیکن تعمیراتی لحاظ سے مندر کے کلس' عیدگاہ کے گنبد سے کہیں اونچے تعمیر کیے گئے ہیں۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق یہاں ان کے کرشن بھگوان نے جنم لیا تھا جس کی یادگار کے طور پر یہ مندر وجود میں آیا ہے' اس مندر میں یاترا کے لیے نہ صرف تین بڑے سرمایہ داروں یعنی برلا' ٹاٹا اور ڈالمیا نے اس مندر کی تعمیر میں کروڑوں روپیہ خرچ کیا ہے اور ان اخراجات اور مندر کی تعمیر دیکھ کر قدیم رومن بادشاہوں کے پرشکوہ اور عظیم الشان محلات یاد آجاتے ہیں۔ بڑے بڑے وسیع و عریض دالان' مندر میں داخل ہونے کے لیے پتلی پتلی سینکڑوں سیڑھیوں کے زینے' آسمان سے باتیں کرتے ستون' یہ ہے متھرا میں کرشن بھگوان کی جنم بھومی لیکن پچھلے چند سالوں سے انتہا پسند ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف ایک نیا شوشہ چھوڑ دیا ہے' ان کا کہنا ہے کہ کرشن بھگوان نے جس جگہ جنم لیا تھا' اس جگہ مسلمانوں نے مسجد تعمیر کر لی تھی لہٰذا اب مسجد کی جگہ کرشن کی جنم بھومی تعمیر کی جانی چاہیے اور اس طرح اجودھیا کی بابری مسجد کے بعد ہندوؤں کا دوسرا نشانہ متھرا کی عیدگاہ ہے۔

ہندوستان کی بدنصیبی تاج محل

برصغیر میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں محبت کی علامت تاج محل آج ہندوستان کے انتہاپسند ہندوؤں کے جاہلانہ اور وحشیانہ ارادوں کا نشانہ بنا ہوا ہے حالانکہ یہ وہی تاج محل ہے جس کی تعمیر ہی میں نہیں بلکہ وجود کے روم روم میں صرف اور صرف محبت ہی محبت ہے' پیار ہی پیار ہے' سکون ہی سکون ہے' ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہے اور اس کا ثبوت دنیا بھر سے آنے والے وہ سیاح ہیں جو گندگی اور غلاظت کے باوجود آگرہ شہر میں صرف تاج محل دیکھنے آتے ہیں لیکن محبت کی علامت تاج محل آج انتہا پسند اور جنونی ہندوؤں کی نفرت کا نشانہ بنا ہوا ہے اور یہ بدنصیبی تاج محل کی نہیں' ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ آج ان کے دیس میں 'محبت' سے بھی نفرت کی جا رہی ہے۔

دیکھو مجھے جو......

ہندوستان بھر میں دین الٰہی اکبر شاہی کا فرمان جاری کرنے والا شہنشاہ اکبر کہ جس کی جنبشِ ابرو بھی ہندوستان کا قانون بن جایا کرتی تھی جس کی زبان سے نکلے الفاظ ہندوستان کے باسیوں کی تقدیر ہوا کرتے تھے' آج آگرہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر سکندرا کے مقام پر محل نما عمارت کے ایک اندھیرے میں ڈوبے تہہ خانے میں خاموش لیٹا ہوا ہے۔ روح کے بعد جسم نے بھی مٹی میں مل کر مٹی کی شکل اختیار کر لی ہے' بس چند پتھروں اور چونے گارے کی زمین سے ابھری ایک نشانی ہے جو سکندرا آنے والوں سے خاموش زبان میں ہندوستان کے ایک عظیم الشان شہنشاہ کے یہاں دفن ہونے اور مٹی میں گم ہو جانے کی کہانی سناتی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ دیکھو مجھے جو......

ایک سوال......؟

یہ علی گڑھ کی جامع مسجد کے صحن کا فوارہ اور اس کے قریب کھڑے ہو کر ایک اجنبی کے ساتھ فوٹو کھنچوانے کے شوقین ہندوستان کے مسلمان بچے ہیں۔ آج کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے والے معصوم چہرے نہیں جانتے کہ آنے والی کل جب وہ ہندوستان کے بالغ شہری کہلائیں گے' تب ان سے اچھوتوں کا سا سلوک ہوگا' ان سے نفرت کی جائے گی' انہیں اپنے بزرگوں کا مذہب چھوڑنے' مذہب کی علامتیں توڑنے کی شرط پر زندگی ایک بھیک کی طرح دی جائے گی یا پھر آج ہی۔ ان پر آنے والی کل کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ مسکراتے ہوئے چہروں پر موت کے خوف کا سایہ ڈال دیا جائے گا۔ یہ سوال بچوں کے ذہن میں نہیں' میرے ذہن میں ابھرا تھا اور جواب کی تلاش میں' میں خود سوال بن گیا ہوں۔

جے پور

غلطہ کی پہاڑی پر چڑھتے ہوئے پہلے موڑ سے نظر آنے والی آبادی مہاراجہ جے سنگھ کے بسائے شہر جے پور کا ایک منظر جسے دیکھ کر اس وقت کی بے رحمی اور روایت شکنی کا احساس ہوتا ہے کہ گلابی رنگت کی وجہ سے 'پنک سٹی' کہلانے والا جے پور اب اپنے مخصوص گلابی رنگ کی انفرادیت کھو بیٹھا ہے اور یہاں کے مکانوں پر اب سفید' نیلا' پیلا رنگ وقت کی گردش میں چھپی بے رحمی اور روایت کی علامت کے طور پر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔

آمیر کے قلعہ کے مرکزی دروازے پر اپنے وقت کے فنکاروں کی سچائی اور محبت لیے یہ نقش و نگار وقت کے بے رحم تھپیڑوں کے سامنے اب بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ جسے دیکھنے والوں سے داد و تحسین حاصل کرتے ہوئے شاید کہہ رہے ہیں کہ ہم آج بھی قائم ہیں اس لیے کہ......

☆ہماری تخلیق میں فنکار کی سچائی ہے۔

☆ہمیں ڈھانے کے لیے نہیں' قائم رہنے کے کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔

☆ہمیں مٹانے کے لیے نہیں' جلانے کے لیے بنایا گیا تھا۔

☆ہمیں نفرت کے لیے نہیں' محبت کے لیے ابھارا گیا تھا۔

☆ہاں' ہم محبت کے دور کی یادگار ہیں۔

☆ہم زندہ ہیں' زندہ رہیں گے کہ محبت زندگی ہے۔

بابری مسجد کی شہادت سے پہلے اور بعد کے ہندوستان میں جو فرق آیا ہے' وہ ایک خلیج کی مانند ہے اور اس خلیج کو عبور کر کے اب پاکستانی سیاحوں کا ہندوستان جانا بہت دشوار ہو گیا ہے۔

اگرچہ ہندوستان کے معاشرے میں مذہبی کشمکش سالہا سال سے جاری ہے لیکن تحریکِ آزادی کے وقت پاکستان کی ٹھوس حقیقت کو سامنے پاکر ہندوؤں نے اس کشمکش کو ایک نیا رخ دیا اور ۱۹۴۷ء سے بات بے بات ہندو انتہا پسندوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا مرنا ایک نہ ختم ہونے والا کھیل بن گیا لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں مسلمان ہر دور میں اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ ان کی مجبور آوازوں کا رشتہ اس دھرتی کی تاریخ سے جڑا ہوا ہے کیونکہ وہ حکمران تھے مگر اب حکمرانی اور آزادی کے لیے نہیں' جان و آبرو اور عزتِ نفس کے لیے سرگرداں ہیں اور کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود حقیر اقلیت کی طرح جی رہے ہیں خصوصاً بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہندوستان میں مذہبی

جنونیت نے مسلمان خون سے جو ہولی کھیلی ہے' اس نے ہندوستان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے' تاہم ممتاز عالمِ دین مولانا وحیدالدین خان نے بابری مسجد کی شہادت کے بعد امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اُن کا تبصرہ اس طرح سے ہے۔

''مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر نے اپنی کتاب کے آخری باب میں یہ دکھایا ہے کہ ناتھورام گاڈسے نے گاندھی جی کو کیوں قتل کیا؟ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ گاڈسے اور ان کے ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی کو اپنے راستے سے ہٹا کر وہ مسلمانوں کو ایسی حالت میں کردیں گے کہ اُن کا کوئی بچاؤ کرنے والا نہ ہوگا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ گاندھی کا قتل الٹا نتیجہ پیدا کرے گا کیونکہ یہ واقعہ ملک کو بتائے گا کہ اینٹی مسلم تحریک کتنی زیادہ خطرناک ہے اور وہ کہاں تک جاسکتی ہے۔ عملاً ایسا ہی پیش آیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا تو اس کے ساتھ ہی ملک میں زبردست مسلم دشمنی کی لہر آ گئی۔ مسلمانوں کے خلاف مجنونانہ انداز میں خون آشام کارروائی شروع ہوگئی مگر جب اس کا یہ انتہائی نتیجہ سامنے آیا کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو اس نے خود ملک کے باپو مہاتما گاندھی کو پستول کی گولی سے ہلاک کردیا تو پورا ملک سناٹے میں آ گیا۔ مہاتما گاندھی کے خون نے مسلم دشمنی کی آگ کو اچانک بجھادیا اور پھر چالیس سال کے لیے تاریخ کے رخ کو دوسری طرف موڑ دیا۔''

ٹھیک اسی قسم کا واقعہ دوبارہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں پیش آیا ہے۔ بعض اسباب نے ہندوانتہا پسندی کو دوبارہ موقع دیا' وہ از سرِ نو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بار اس انتہا پسندانہ تحریک کا مرکز اجودھیا تھا اور عام طور پر اس نے بابری مسجد' رام جنم بھومی کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

یہ تحریک ابتداً ۱۹۸۶ء میں شروع ہوئی۔ جذباتی ہنگاموں کے درمیان وہ بڑھتی رہی یہاں تک کہ وہ اپنے شدید ترین مرحلے تک پہنچ گئی۔ اس کا آخری نکتہ عروج ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء تھا جبکہ بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشوا ہندو پریشد کی قیادت میں ایک لاکھ سے زیادہ ہندوانتہا پسند اجودھیا میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے ۴۶۵ سالہ بابری مسجد پر یلغار کردی اور چند گھنٹوں کے اندر اس کو ڈھا کر زمین کے برابر کردیا۔

یہ بلاشبہ جدید ہندوستانی تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ تھا۔ عبادت خانہ کسی سماج میں آخری قابلِ احترام چیز سمجھا جاتا ہے۔ عبادت خانہ کو گرانا گویا تمام انسانی قدروں کو ڈھا دینا ہے۔

یہ فعل پارلیمنٹ کے فیصلے کے خلاف تھا۔ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کی خلاف تھا۔ وہ نیشنل انٹگریشن کی تجاویز کے خلاف تھا۔ وہ انڈیا کی تمام بہترین روایات کے خلاف تھا۔ وہ عالمی رائے عامہ کے خلاف تھا۔ وہ اقوامِ متحدہ کے حقوقِ انسانی کے چارٹر کے خلاف تھا حتیٰ کہ وہ خود متعلقہ انتہا پسند ہندو لیڈروں کے اپنے بیان کے خلاف تھا' غرض کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی اصول نہیں جس کی تائید اس اقدام کو حاصل ہو۔

تمام سنجیدہ طبقوں نے بجا طور پر اس واقعہ کو ملک کے لیے انتہائی افسوس ناک اور سیاہ واقعہ قرار دیا ہے۔ بلاشبہ یہ اتنا زیادہ المناک واقعہ ہے کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے' کم ہے مگر دوسرے تمام حادثات کی طرح اس حادثے میں بھی یقیناً ایک مثبت پہلو موجود ہے۔ اس تاریکی میں بھی روشنی کا ایک امکان جھلک رہا ہے۔

یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ یہاں امکانات کی مقدار ہمیشہ مسائل سے زیادہ رہتی ہے۔ ظلم کا کوئی بھی واقعہ اس پر قادر نہیں کہ وہ تمام امکانات کو مٹا



دے۔ کسی بھی تاریکی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ امید کے تمام چراغوں کو بے نور کردے۔

فطرت کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ یہاں ظلم اپنی آخری انتہا پر پہنچ کر ندامت بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں انتہا پسندی کی تحریک صرف ایک بار اٹھتی ہے اور ایک بار جب وہ اپنے آخری انجام تک پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کو دہرانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد فاشزم اٹلی میں دہرائی نہ جاسکی اور اسی طرح نازی ازم کو دوبارہ جرمنی میں فروغ حاصل نہ ہوا۔

بابری مسجد کا اس طرح ظالمانہ طور پر ڈھایا جانا ہندوانتہا پسندی کے آخری انجام کا ظاہر ہونا ہے۔ بابری مسجد کا انہدام دراصل ہندوانتہا پسندی کا انہدام ہے۔ اب انشاءاللہ' اس ملک میں نیا احساس جاگے گا اور کم از کم دو نسل تک اس طرح کے کسی منفی واقعہ کو دہرانا ممکن نہ ہوگا۔

بابری مسجد کے انہدام نے تخریب پسند طاقتوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اب یقینی ہے کہ اس ملک میں سنجیدہ ذہن کے لوگوں کا غلبہ ہوگا۔ زندگی کی تعمیر کے مواقع کھل جائیں گے جو انتہا پسندوں کی منفی کارروائیوں کی وجہ سے بند ہو گئے تھے۔ ۱۹۹۲ء کا خاتمہ اس ملک میں مذہبی تشدد پسندی کا خاتمہ ہے اور اسی کے ساتھ امن اور رواداری اور باہمی احترام کے نئے دور کا آغاز بھی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کے واقعہ کے بعد ہندو صاحبان کی طرف سے جو ردعمل سامنے آیا ہے' وہ بہت امید افزا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت نے کھل کر مسجد کو ڈھانے کی مذمت کی ہے۔ اس کے بارے میں اخبارات کی رپورٹیں' ان کے ادارتی نوٹ اور ان میں چھپنے والے خطوط بتاتے ہیں کہ ہندو ذہن کو اس واقعہ سے بہت سخت جھٹکا لگا ہے۔ اخباروں میں عام طور پر اس قسم کے الفاظ ۶ دسمبر کے بارے میں دیکھنے میں آئے ہیں۔

"A dark day, A black day, A day of shame"

بظاہر حالات سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ ہندوانتہا پسندی کی سخت حوصلہ شکنی ہوگی اور ایک عرصے تک کے لیے وہ خود ہندوؤں کے درمیان بے زمین ہو کر رہ جائے گی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے' اُن کے لیے اَب بہترین روش یہ ہے کہ وہ ماضی کی طرف نہ دیکھیں۔ وہ صرف مستقبل کی طرف دیکھیں۔ ۶ دسمبر کے بعد پیش آنے والی صورتِ حال کو وہ اپنے لیے تعمیر واستحکام کے وقفہ کی طور پر استعمال کریں۔''

مولانا وحیدالدین ہر لحاظ سے قابلِ احترام ہیں اور اُن کے دلائل میں وزن ہے مگر یہ حقیقت بھی تو ہے کہ مستقبل کو ماضی سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا' ماضی کے رویئے اور سانحات مستقبل پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔

آیئے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ حال کے تناظر میں مولانا وحیدالدین نے مسلمانوں کے ماضی کا تذکرہ کس طرح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اولاً ہندوستان میں وہ مسلمان آئے جو عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے اعلیٰ اوصاف کی بنا پر ہندوستان میں اُن کا استقبال کیا گیا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں لکھا ہے کہ یہ عرب جب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ شاندار کلچر لائے۔

بعد کے دور میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ حکمران اگرچہ قدیم عربوں جیسی اعلیٰ صفات کے حامل نہ تھے' تاہم ان سے بھی ہندوستان کو امن وانصاف کا تحفہ ملا۔ اسلامی انقلاب

کا سیلاب اتنا طاقتور تھا کہ سیکڑوں سال بعد بھی اس کے اثرات مسلم نسلوں کے ذہن پر باقی تھے مثلاً مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانۂ حکومت میں اس کی ملکہ نور جہاں نے ایک راہ گیر کو تمنچہ مار کر ہلاک کر دیا۔ مقدمہ جہانگیر کے دربار میں پیش ہوا تو شبلی نعمانیؒ کے الفاظ میں۔

''مفتی شرع نے بے خوف و خطر صاف کہا۔ ''شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑادو گردن......''

جہانگیر اور اس کی ملکہ کو یہ ہمت نہ ہو سکی کہ وہ مفتی کے اس فتوے کا انکار کر دیں۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ میں انگلینڈ میں جیمز فرسٹ کی حکومت تھی جو جہانگیر کا ہم عصر تھا۔ جسٹس کوک نے ایک مالی مقدمے میں ایک تاجر کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہ فیصلہ جیمز فرسٹ کو اپنے خلاف معلوم ہوا' اس پر وہ جسٹس کوک سے خفا ہو گیا اور جسٹس کی حیثیت سے اس کا عہدہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد وہ دور آیا جبکہ ہندوستان میں انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ انہوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب ملک میں آزادی کی تحریک اٹھی۔ اس تحریک میں مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے لیے جان و مال کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اس میں اپنے آپ کو فنا کرنا تھا۔ اس میں مسلمانوں نے عملی حصہ لیا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کے یہاں جہاد کا تصور تھا جبکہ ہندو بھائیوں کے یہاں اس قسم کا کوئی سرفروشی کا تصور موجود نہ تھا۔ مسلمانوں نے آزادی کی تحریک میں جہاد کا تصور شامل کر کے اس کو نہایت جاندار بنا دیا۔

وطنی آزادی کی تحریک کے لیے جہادِ آزادی' مجاہدِ آزادی' شہیدِ آزادی جیسے ولولہ انگیز الفاظ مسلمانوں ہی نے دیئے اور بلاشبہ یہ تحریکِ آزادی میں مسلمانوں کا ایک تخلیقی عطیہ ہے جس کے بغیر تحریکِ آزادی مکمل نہ ہوتی۔

۱۹۴۷ء کے بعد وہ دور آیا جبکہ ملک آزاد ہو گیا مگر اس نئے دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو بروقت صحیح رہنمائی نہ مل سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حالات کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ اس ملک میں دینے والے گروہ کی حیثیت رکھتے تھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد وہ اس ملک میں لینے والے گروہ کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یہی جدید ہندوستان میں مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے ہر دور میں مسلمانوں کو عزت و احترام کا درجہ حاصل تھا مگر ۱۹۴۷ء کے بعد آنے والے دور میں انہیں عزت و احترام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ کوئی سازش یا تعصب نہیں ہے' اس کی وجہ خود مسلمانوں کی یہ داخلی کمزوری ہے کہ انہوں نے جدید دور میں پہنچ کر تخلیقیت کھو دی۔ وہ اہلِ ملک کے لیے دوبارہ نفع بخش ثابت نہ ہو سکے جبکہ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اس دنیا میں اُسی کو ثبات اور استحکام حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخشی کا ثبوت دے۔ (سورۃ رعد۔۱۷)

نئے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اس نفع بخشی کا موقع مزید اضافے کے ساتھ موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان مواقع کو سمجھا جائے اور ضروری تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے انہیں استعمال کیا جائے۔ یہاں اس معاملے کی وضاحت کے لیے میں دو مثالیں دوں گا۔

آزادی سے پہلے اس ملک کے مفکرین یہ سوچتے رہتے تھے کہ جب آزادی آئے گی تو اس کا نقشہ کیا ہوگا اور آزاد ہندوستان کی تعمیر کس طرح کی جائے گی۔ اس سلسلے میں غالباً پہلا قابلِ ذکر نام سوامی دیویکانند ہے۔ انہوں نے ۱۸۹۸ء میں ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ ہماری مادرِ وطن کے لیے دو عظیم نظاموں' اسلام اور ہندوازم کا ملاپ واحد امید ہے۔ میں اپنے دماغ کی آنکھ سے دیکھتا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندوستان انتشار اور خرابیوں سے باعظمت اور ناقابلِ تسخیر بن کر اٹھ رہا ہے اور یہ ویدانت برین اور اسلام باڈی کے ذریعہ ہو رہا ہے۔

دوسری مثال مہاتما گاندھی کی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مختلف صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں بنیں۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن (۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء) میں کانگریسی وزیروں کو سادہ زندگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے لکھا کہ اس سلسلے میں عملی نمونے کے لیے میں رام اور کرشن کا نام نہیں لے سکتا کیونکہ وہ تاریخی شخصیتیں نہ تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ دورِ اول کے اسلامی خلفاء کا حوالہ دوں کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے مگر انہوں نے فقیروں جیسی زندگی گزاری۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی کے نمونے کی پیروی کرنا چاہیے۔

سوامی دیویکانند اور مہاتما گاندھی کے مذکورہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک عظیم کردار ادا کرنے کا موقع تھا حتیٰ کہ خود ملک اس بات کا منتظر تھا کہ مسلمان آگے بڑھیں اور یہ کردار ادا کر کے ملک میں اپنے لیے باعزت جگہ حاصل کریں مگر مسلمان اس ملک کی ان امیدوں کو پورا نہ کر سکے اور ساتھ ہی ملک کے مستقبل کی تعمیر بھی واقعہ نہ بن سکی۔

آزادی کے بعد ملک کی نئی تعمیر کے لیے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک اقتدار اور دوسرے اس اقتدار کے حق میں عملی نمونہ مثلاً ایک قدر یہ ہے کہ حکمراں افراد کو بھی عام لوگوں کی طرح معمولی زندگی گزارنا چاہیے تا کہ انہیں عام انسان کی ضرورتوں کا احساس رہے۔ ایک قدر یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی کو بھی اسی طرح قانون کا ماتحت ہونا چاہیے جس طرح ایک چھوٹا آدمی۔ ایک قدر یہ ہے کہ ہر انسان کو سماج میں برابر کا حصہ ملنا چاہیے خواہ وہ ایک نسل سے تعلق رکھتا ہو یا دوسری نسل سے۔ ایک قدر یہ ہے کہ عہدہ اور منصب لیاقت کی بنیاد پر ملنا چاہیے نہ کہ ذاتی شرف کی بنیاد پر وغیرہ وغیرہ۔

سوامی دیویکانند اور مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندوستانی مفکرین کا خیال تھا کہ ان اقدار کا تصور تو ہمارے پاس موجود ہے مگر ان اقدار کے حق میں عملی اور تاریخی نمونہ ہمارے یہاں موجود نہیں۔ یہ عملی نمونہ تمام مذاہب میں صرف اسلام میں پایا جاتا ہے اس لیے ملک کی نئی تشکیل کے لیے اسلام سے مدد لینا ضروری ہے۔

یہ نہایت صحیح اور مثبت سوچ تھی مگر اس سوچ کو واقعہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو بھی اس ملک میں ایک کردار ادا کرنا تھا۔ مسلمان بدقسمتی سے یہ کردار ادا نہ کر سکے اس لیے یہ سوچ بھی واقعہ بننے سے رہ گئی۔ آزادی کے بعد ہمارا ملک بھٹک کر دوسرے راستے پر چل پڑا۔

نام نہاد مسلم دانشور اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس میں قصور مسلمانوں کا نہیں ہے بلکہ خود ہندوؤں کا ہے۔ تقسیم کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کو مسلسل تعصب اور زیادتی کا سامنا پیش آیا۔ اس بنا پر مسلمان تحفظ اور دفاع کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے اور جو لوگ تحفظ اور دفاع کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں' وہ کوئی تخلیقی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

مگر یہ جواب درست نہیں' مسلمانوں کو جس بات کی شکایت ہے' وہ تو دراصل وہ قیمت تھی جو

مسلمانوں کو اس ملک میں ادا کرنی تھی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو امامِ ہدایت بناتا ہے جو صبر کا ثبوت دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر ہی قیادت و امامت کی لازمی قیمت ہے۔ کسی ملک یا قوم میں قیادت و امامت کی ذمہ داری ادا کرنے کی ناگزیر شرط یہ ہے کہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو یکطرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ اس صبرو برداشت کے بغیر کسی کو امامتِ عالم کا مقام نہیں ملتا۔ یہ اللہ کا ایک محکم قانون ہے۔ اس میں کسی کا بھی کوئی استثنار/استثنیٰ نہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کو جو کام کرنا تھا' وہ یہ تھا کہ برادرانِ وطن کی طرف سے اگر کوئی اشتعال انگیز بات کی جائے تو اس کو نظر انداز کریں۔ سروسوں میں اگر تعصب برتا جائے تو برداشت کر لیں حتیٰ کہ عملی زیادتی کے واقعات پیش آئیں' تب بھی اس پر صبر کر لیں۔ ہر حال میں وہ یکطرفہ اعراض کی پالیسی اختیار کریں۔"

ہمارے خیال میں عملی صورت مولانا وحید الدین کی دونوں باتوں کی تائید نہیں کرتی۔ اولاً یہ کہ مسلمانوں نے سوامی ویویکانند اور مہاتما گاندھی کی توقع کے مطابق ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا نہیں کیا۔ مسلمانوں نے تمام تر رکاوٹوں کے باوجود اپنا یہ کردار ادا کیا جس کی مثال ابوالکلام آزادؒ اور ذاکر حسین ہی نہیں بہت سے چوٹی کے مسلمان ہیں اور ہر قسم کے جبر اور ظلم کے مقابلے میں بے پناہ صبر کا مظاہرہ بھی کر کے دکھایا لیکن جیسا کہ خود مولانا وحید الدین نے ناقدین کی زبان سے اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ مسلمان مسلسل تعصب اور زیادتی کے سبب تحفظ اور دفاع کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے اور کوئی تخلیقی کردار ادا کرنے کے قابل نہ رہے۔ دوم کمزور سے کمزور انسان اور حقیر سے حقیر اقلیت بھی صبر اور اعراض کی پالیسی کو ایک حد تک اختیار کر سکتی ہے' زیادہ سے زیادہ چند برس یا ایک دو عشرے مگر اب تو نصف صدی گزر چکی اور ہندو جارح اکثریت جو روپ دہلی' بمبئی' سورت' احمد آباد اور میرٹھ میں آج دکھا رہی ہے' وہ کروڑوں مسلمانوں کی "اقلیت" کو جس کے پاس جہاد کا اعلیٰ ترین دینی تصور بھی موجود ہو' آخر کب تک برداشت ہو گا؟ برابری کی بنیاد پر حکومت نہ سہی' برابری کی بنیاد پر روزگار' تعلیم اور ذرائع معاش کی فراہمی نہ سہی لیکن ہر معاشرے میں' ہر شخص کو برابری کی بنیاد پر جان' مال' آبرو اور اپنی دینی اقدار کے تحفظ کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان تحفظ اور دفاع کی نفسیات کا شکار ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ وہ اس حق سے بھی جابجا محروم تھے۔ اب ہندوستان نے پاکستان کے مسافروں کو بھی ایک انجانے خوف اور ایک اجنبیت سے دوچار کر کے ان کے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے تقسیمِ ہند کو "آگ کا دریا" سے تعبیر کیا مگر یہ "آگ کا دریا" تو عبور کر لیا گیا اور آیندہ بھی کیا جا سکتا ہے جبکہ پیروں میں ڈالی گئی زنجیر تو نسلوں کو ساکت کر دے گی۔ قدم ٹھہر گئے تو نہ کوئی "آگ کا دریا" عبور کرے گا نہ آگ بجھے گی' یہ آگ اسی طرح جلتی اور جلاتی رہے گی......

(ختم شد)






مریم شاہ

# زندگی لکھ رہی ہوں میں

حامد علی سید کا خیال

زبان رکھتے ہیں پتھر بھی چٹانیں بولتی ہیں
جو چہروں پر لکھی ہیں داستانیں بولتی ہیں

**ہماری نئی لکھاری کی بھرپور زندگی کی دلچسپ کہانی**

میرا نام مریم شاہ ہے۔ میں شاہینوں کے شہر سرگودھا میں ایک چھوٹے سے گاؤں 103 شمالی سلانوالی روڈ میں 18 جولائی کو پیدا ہوئی۔ میرے ساتھ میری جڑواں بہن ماریہ بھی اِس دنیا میں آئی لیکن سال بھر دنیا میں رہنے کے بعد وہ واپس چلی گئی' شاید اُسے یہ دنیا راس نہیں آئی۔ اماں کہتی ہیں کہ وہ بہت صحت مند تھی جبکہ تم بہت کمزور اور بیمار رہتی تھیں۔ مجھے اس کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی تمہاری تھی۔ مجھے تو بس تمہاری طرف سے یہ دھڑ کا لگا رہتا تھا کہ تم اب گئیں کہ اَب! میں نے تمہارے علاج کے لیے سرگودھا شہر کا کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا تھا۔ صبح جاتی اور شام کو لوٹتی۔ اس دوران میں' میں ماریہ کو تمہاری خالہ (جو کہ میری تائی بھی ہیں۔) کے حوالے کر جاتی تھی۔ خیر' ہونا تو وہی ہوتا ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے!!

جب میں نے ذرا ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد لاچاری' دکھ' اذیت' محرومی' ڈر اور خوف کو ڈیرے ڈالے پایا۔ میری اِن آنکھوں نے چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ انسانوں کو شیطانوں کا روپ بدلتے دیکھا' تنکا تنکا جوڑ کر بنائے گئے آشیانے کو 'انا' غرور' خود غرضی اور تکبر کی تیز و تند ہواؤں سے بکھرتے دیکھا ہے' محبت کی جگہ نفرت' خوشی کو غم اور غم کو خوشی میں بدلتے دیکھا ہے' عزت و احترام کے لائق شخصیتوں کو اپنے رتبے اور مقام سے گرتے دیکھا ہے' شفقتوں' محبتوں اور جذبوں کو پامال ہوتے دیکھا ہے' اپنوں کو روپ بدلتے' سانپ بن کر ڈستے اور غیروں کو تماشائی بنتے دیکھا ہے' اعتبار اور احساسات کا خون ہوتے دیکھا ہے۔ میرا بچپن' بچپن کب رہا؟ خوف و وحشت کی نذر ہو گیا۔ وقت اور حالات نے سب کچھ بدل ڈالا......آہ......قسمت!!

قابلِ دید یہ آنکھیں ہیں کہ ان آنکھوں سے
خود ہی پامال ہوئے' خود ہی تماشہ دیکھا

بہت سے خواب تھے جو ٹوٹ کر بکھر گئے' ریزہ ریزہ ہوئے' بہت سی معصوم خواہشیں' بچپنا' اپنوں کی لگائی آگ میں جل بجھے۔ یہ مجھ اکیلی کا نوحہ نہیں بلکہ

میرے چار بھائیوں اور بہن کا مشترکہ دکھ ہے' ایسا زخم ہے جو کبھی مندمل نہیں ہو سکتا' ایسا درد ہے جس کی دوا نہیں' اپنوں کے حسد اور خود غرضی نے ہم سے شفقت بھرا سائبان چھین لیا' نہ سر پر آسمان تھا اور نہ پیروں تلے زمین' ٹھوکروں پر رکھ لیے گئے' بہت اذیت اور درد ہی درد ہے۔ اَب تو رو رو کر آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو گئے۔ گھر بکھرنے کا دکھ' شفقت سے محرومی کا دکھ' اپنے مستقبل کے تباہ ہونے کا دکھ' ماں کا دکھ اور بہت سے دکھ ہماری روحوں پر لگے زخم بہت کاری بہت گہرے ہیں جن کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا۔

آج گیارہ برس گزر جانے کے بعد ماضی میں جھانکتی ہوں تو سوائے کرب اور درد انگیز پچھتاووں کے کچھ نہیں ملتا۔ اپنوں پر اعتبار کر کے پچھتانا ہی پڑا ناں' پتہ نہیں' ہمیں مزید کتنی آزمائشوں اور جگ ہنسائیوں کا سامنا کرنا پڑتا کہ میرے رَب نے ہمارے حال اور حالات پر اپنا کرم کیا۔ رَب کے بعد ہمارا واحد سہارا اور آسرا ''ماں'' ہی تو تھی جس نے بس صبر کو اپنایا تھا' ہمیں حوصلہ دیا تھا' ہمیں اپنی شفقت بھری گود میں پناہ دی تھی' ہمارے آنسو پونچھے تھے' ہمت بندھائی تھی' جہدِ مسلسل کا دَرس دیا تھا' محنت اور محنت کا کہا تھا۔

آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں' وہ سب ہماری ماں کی دُعاؤں' محنت اور ہمارے رَب کی نوازش کا نتیجہ ہے۔ اپنے گھر کی خواہش نے ہماری رگوں میں جوش بھر دیا تھا۔ بھائی جہدِ مسلسل سے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ روکھی سوکھی کھائی' بھوک اور فاقے کاٹ کر ہماری ماں نے ہمیں سر چھپانے کے لیے چھت مہیا کی۔ بھائیوں کی محدود آمدنی سے روپیہ روپیہ جوڑ کر اسی گاؤں میں رہ کر حاسدوں کو اپنا گھر بنا کر دکھایا۔ دو بھائیوں کی شادیاں خود اپنے ہاتھوں سے کی۔ گھر کی چاردیواری میں رہ کر اپنی عزت بحال کی اور اپنے بچوں کے جھکے ہوئے سر فخر سے بلند کیے۔ کسی کے گھر جا کر برتن مانجھے۔ کسی کے آگے جا کر دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ اَب معاشرے میں ہمارا مقام بھی ہے اور عزت بھی۔ حاسد ہمیں ناکام و نامراد دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہمارے رَب نے ہمیں ہر جگہ کامیاب و کامران کیا' ہماری لاج رکھی۔ آج الحمدللہ' ہمارے پاس اتنا کچھ ہے کہ ہمیں کسی سے مانگنا نہ پڑے۔ خدا کے گھر میں دیر ہے' اندھیر نہیں۔ ماشاء اللہ' سے ہمارے گھر کی مزید رونق بڑھانے ہمارا تین سالہ بھتیجا اور چھ ماہ کی بھتیجی بھی تشریف لا چکے ہیں۔ اُن کی معصوم باتوں اور کلکاریوں سے ہمارے گھر کا آنگن آباد ہے۔ انہیں دیکھ کر ہم ہر دکھ اور تکلیف بھول جاتے ہیں۔ خدا کرے' یہ ہر دَم ہنستے اور مسکراتے رہیں۔ ہر بری نظر اور حاسد سے محفوظ رہیں۔ (آمین!)

میں اپنی ذات کے متعلق کیا لکھوں؟ اپنے بارے میں کہنے کو کچھ بھی نہیں۔ اپنی خوبیاں خود کیسے بیان کروں؟ یہ تو کوئی دوسرا ہی بتا سکتا ہے لیکن بہرحال حساس ہوں' چھوٹی سی چھوٹی تکلیف دہ بات بہت اذیت دیتی ہے اور مزے کی بات یہ کہ میں اپنی تکلیف کسی سے شیئر نہیں کرتی' کوئی مجھے برا بھلا کہے جو مرضی کہے لیکن کبھی کسی کو برا کہا نہیں' کسی کا برا سوچا نہیں۔ لوگ مجھے بے حس سمجھتے ہیں جو کسی کا احساس نہیں کرتی مگر یہ غلط ہے' میں بے حس نہیں۔ مجھ میں بس اعتماد کی کمی ہے' مجھے اپنا مدعا بیان کرنا بہت مشکل لگتا ہے۔ اپنے جذبوں کو اسی کمی کی وجہ سے مار کر دل میں دفن کر دیا ہے' احساسات مردہ ہو گئے ہیں' اپنے آنسوؤں کو دوسروں کے سامنے بہانا اچھا نہیں لگتا۔ تنہائی پسند ہوں' دوستیاں بہت کم کرتی ہوں' میری بہترین دوست خدیجہ آفتاب ہے جس کے سامنے میں کچھ بھی چھپا نہیں سکتی۔ وہ مجھے بہت



عزیز ہے۔ مجھ میں خوبیاں کم اور برائیاں زیادہ ہیں۔ اس کی گواہی تو ہر ایک شخص فوراً دے گا۔ جانے انجانے میں مجھ سے بہت بڑی غلطیاں بھی ہوئیں جن پر مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ خود سے گھر والوں سے اور...... لیکن کیا کروں' مجھے اظہار کرنا نہیں آتا۔ میں اُن سب کو بتانا چاہتی ہوں' میری زندگی میں اُن لوگوں کی کتنی اہمیت ہے؟ اُن سب کے بغیر میں اور میری ذات ادھوری ہے۔ خدارا' مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معلوم ہے' میں نے سب کا دل دکھایا ہے لیکن پلیز' اپنے دلوں میں تھوڑی سی جگہ دے دیں۔ میں بہت تنہا ہوں' سدھرنا چاہتی ہوں' خود کو سنوارنا چاہتی ہوں مگر کوئی رہنما نہیں ملتا جو محبت سے' توجہ سے مجھے سنبھال لے' سنوار دے' کوئی راستہ دکھا دے' منزل پہ پہنچا دے' میرے اردگرد ایک مضبوط حفاظتی حصار کھینچ دے کہ میری ذات تک کوئی غلط شئے پہنچ ہی نہ سکے۔ ان بھیڑیوں سے بچا لے جو انسانی روپ میں ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ زندگی میں ہر شئے مکمل ہے' موجود ہے' بس کمی ہے تو محبت کی' تحفظ کی' کسی ہمدرد کی جو میری ذات کے سارے گنجل سلجھا دے' میرے جذبات و احساسات کا احترام کرے' میرے ذہن میں کلبلاتے سوالوں کے جواب دے۔

وہ ایک لڑکی!<br>
جو ہر دم ہنستی رہتی تھی'<br>
خوابوں کے جزیرے پہ رہتی تھی'<br>
تتلیوں سے کھیلتی تھی'<br>
ساون رُت میں وہ اکثر بھیگا کرتی تھی<br>
اور<br>
گیت خوشی کے گاتی تھی'<br>
ندیا کنارے گیلی ریت پر<br>
اپنائیت و چاہت سے

"محبت" نام وہ لکھتی تھی'
آج وہی لڑکی!
تنہائیوں کے آسیب میں جکڑی'
تتلیوں سے روٹھی روٹھی'
پت جھڑ کے موسم میں'
برستی آنکھوں سے'
درد بھرے گیت گاتی ہے'
ندیا کنارے
پہروں وہ "محبت" کھوجتی ہے'
پہروں......وہ "محبت" کھوجتی ہے!!

میری زندگی میں کوئی ربط ہے نہ ٹھہراؤ' بس گزر رہی ہے' اچھی یا بری' زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں مثلاً اچھی لکھاری بننا چاہتی ہوں جو لفظوں سے ہی نہ کھیلے بلکہ اپنی تحریر سے صرف سچائی سامنے لائے۔ دو غلے لوگوں کو سامنے لائے' حقیقت سے پردہ اٹھائے۔ اگر ادارہ "سچی کہانیاں" اور انکل ناصر رضا ساتھ دیں تو شاید میں کچھ بن سکوں۔ مینا تاج اور عُکاشہ سحر ایمان سے بہت متاثر ہوں۔ شاعروں میں وصی شاہ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ عمیرہ احمد کا ناول "پیرِ کامل" اور "سلطان صلاح الدین ایوبی" خان آصف کی تصنیف نے بہت متاثر کیا ہے۔

مجھے اپنے وطن سے اور گاؤں کی ہر چیز سے محبت ہے۔ مجھے اُن لوگوں سے سخت چڑ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس وطن نے ہمیں کیا دیا ہے؟ وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم نے اس وطن کو کیا دیا ہے؟ جو بوؤ گے' وہی کاٹو گے۔ سخت ترین نفرت ہے اُن لوگوں سے جو اپنے ایمان اور ضمیر کا سودا کر لیتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگوں کا شمار انسانوں میں ہونا ہی نہیں چاہیے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش مدینۂ منورہ میں حاضری دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ موت سے پہلے پہلے اپنے اور اپنے حبیبؐ کے دَر کی حاضری نصیب فرمائے۔ (آمین!)

ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے اِن صفحات و تحریر کے ذریعے میں ایک شخص سے معافی مانگنا چاہتی ہوں کہ خدارا' مجھے غلط مت سمجھیں۔ اگر جانے انجانے میں' میں نے آپ کا دل دکھایا ہو تو معذرت چاہتی ہوں۔ آپ کی خوشی مجھے اپنی خوشی سے زیادہ عزیز ہے۔ ہاں' میں خدا سے اتنی دُعا ضرور کرتی ہوں کہ مجھے اتنی مہلت ضرور دے کہ میں اپنے جذبوں اور احساسات کی سچائی آپ پر واضح کر سکوں۔ کاش' میں آپ سے وہ سب کہہ سکتی جو میرے دل میں ہے جو میں نے آج تک کسی سے نہیں کہا۔ میری ان باتوں اور لفظوں میں کوئی جھوٹ نہیں ہے' کھوٹ نہیں ہے۔ کاش......کاش......میں آپ کو بتا سکتی' سمجھا سکتی۔ جہاں رہیں' خوش رہیں!

آخر میں' میں اپنی ماں سے صرف اتنا کہنا چاہوں گی۔ "مما جی! مجھے آپ سے بہت پیار ہے۔ آپ کو کھونے کے خیال سے بہت ڈر لگتا ہے۔ شاید آپ یقین نہ کریں۔ اکثر راتوں کو اٹھ کر آپ کو دیکھا ہے' انجانے خدشے کے تحت آپ کو ڈر کر آوازیں بھی دی ہیں۔ پتہ نہیں' کیوں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں صرف ایک رات کی طلبگار ہوں جس میں' میں آپ کی گود میں سر رکھ کر سارے آنسو اور درد بہا دوں۔ میں بہت بری ہوں نا' بہت نافرمان لیکن میرا خدا جانتا ہے' اِس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ پتہ نہیں' مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ ماں! مجھے معاف کر دینا۔ مجھے بد دعاؤں سے بہت خوف آتا ہے۔ مجھے کبھی خود سے الگ مت کرنا۔ میں مر گئی ہوں اور مت مارنا۔ مجھے صرف آپ کی محبت اور توجہ چاہیے۔ مجھے صرف ایک رات کے لیے میری ماں واپس چاہیے جو صرف میری ہو' صرف میری۔ آئی لو یو مما!

ارے' آپ لوگ بور ہو رہے ہیں ناں؟ اچھا' اچھا' ناراض مت ہوں' جا رہی ہوں' بس اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ نگہبان!!



سلسلے وار کہانی/ ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی' جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے

شازلی سعید مغل

# تاشون

حزیںؔ صدیقی کا خیال

عالمِ رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے بہت خاص سلسلے کی تیسویں کڑی



"تاشون"......ایک پاکستانی نژاد مصری ہے۔اُس کے ماں باپ اُس کی پیدائش پر مصر چلے گئے تھے۔وہ صرف ایک ماہر ستارہ شناس یا پراسرار علوم کا مالک ہی نہیں ہے بلکہ رُوحانیت کی منازل طے کرتا روشنی کا ایک استعارہ ہے۔اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتی ہیں اور زمین پر معجزہ بن کر واپس آتی ہیں۔ذوالفقار صہبائی عرف زلفی' تاشون کا جگری یار ہے جس کی بیوی رانیہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔تاشون اپنے دوست زلفی کے بلانے پر پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔رانیہ کی کیفیت واقعی خراب ہوتی ہے۔وہ اکثر راتوں کو محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر گھر سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی تو واپس رانیہ کے جسم میں آ جاتی ہے۔صورتِ حال نہایت گمبھیر ہوتی جا رہی تھی' ایسے حملے بار بار ہو رہے تھے۔چنانچہ تاشون اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے پاکستان چلا آتا ہے اور یہاں آ کر رانیہ کا پیدائشی زائچہ بناتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانیہ ساڑھ ستی کے زیرِ اثر ہے اور ستاروں کی کچھ خاص پوزیشنز لے کر پیدا ہوئی ہے۔اس کی پیدائش کے وقت سورج گرہن تھا جو کہ شیطانی قوتوں کے لیے نہایت سعد وقت ہوتا ہے۔شیطانی قوتیں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن کی پیدائش کے وقت سورج یا چاند گرہن لگا ہو۔رانیہ کے پیچھے بھی سیل شیا نامی ایک منظم طاغوتی تنظیم کی رکن لگی ہوئی ہے جسے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھانے اور اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے رانیہ کی روح درکار ہے۔اس کے مذموم مقاصد میں سب سے اہم مقصد اس کے شیطان صفت شوہر مہانیل کی واپسی سرِفہرست ہے۔مہانیل وہ عفریت ہے جو کہ ایک صدی سے موت کی نیند سو رہا ہے۔اپنے اس مذموم مقصد میں کامیابی کے لیے سیل شیا ہر حد سے گزرنا جانتی ہے' چنانچہ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک صحرائی دیہاتی چندوا کے مرنے کے بعد اس کے ہم زاد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے' جس کے ذریعے وہ فراعنہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہے۔سیل شیا نہایت کڑی تپسیا کے بعد ایک مرتبہ رانیہ کی روح کو اس کے جسم سے نکالنے میں کامیاب بھی ہوگئی تھی مگر تاشون نے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رحمت کے طفیل روح کو اس کے جسم میں واپس بلا لیا تھا۔اس وجہ سے سیل شیا کی طاقتیں اس وقت کمزور پڑ گئی تھیں جب اس کا اتنا کاری وار خالی گیا تھا اور رانیہ کی روح جسم سے نکلنے کے باوجود تاشون کے علم اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واپس رانیہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔اپنی اس ناکامی پر سیل شیا پاگل ہوا ٹھی تھی' اسے اپنے آقا شیطان کو منانے کے لیے کافی جتن کرنے پڑے' تب کہیں جا کر اسے ایک بار پھر یہ اجازت ملی کہ وہ کچھ عرصے بعد یہ عمل دوبارہ کر سکتی ہے۔اِدھر تاشون' زلفی کے دوست شہباز سولنگی کے گھر آئے مہمان کے جسم سے چار ہزار سال عمر رسیدہ جن کو نکالتا ہے۔زلفی بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دوست اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے کام بھی آ رہا ہے۔

راحت چچا نے سیل شیا سے ایک نوجوان کامران کی ملاقات کروائی ہے جس کی بہن رقیہ کے گھر عجیب و غریب خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔سیل شیا کا کہنا ہے کہ وہ مکان اس کے بتائے ہوئے شخص کو فروخت کر دیا جائے ورنہ انہیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

تاشون سے ملنے اس کے والد صاحب کے زمانے کے ایک بزرگ شاکر علی صاحب آتے ہیں جو سنگاپور میں اپنے مکان میں رہنے والے دوسرے خاندان کا ذکر کرتے ہیں جو کوئی ڈاکٹر ہیمسن کا آسیب تھا۔زلفی کے گھر پر وہ اپنے سنگاپور والے مکان اور مادے اور جوہر کے ان کے والد اور ان کے نظریات کی بابت ذکر کرتے ہیں۔

تاشون نے ایک نہایت دلکش سے مضافاتی مقام پر ایک نہایت خوبصورت فارم ہاؤس بنایا ہے جہاں دوستوں کو دعوت پر مدعو کیا ہے۔یہاں اسے سیل شیا کی جانب سے ایک تحفہ موصول ہوتا ہے۔

تاشون نے اُس تحفے کے حوالے سے بتایا تھا کہ سیل شیا بدلے کے لیے ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہے اور اُس رات کو ہی فارم ہاؤس پر تاشون کے ڈرائیور ہیرل خان کے ایک مہمان مکھن خان کی چیخیں سنائی دی تھیں جس نے ایک روح سندونی پر قبضہ جمانے کا چکر چلایا تھا لیکن ناکام ہو گیا تھا۔اسے تاشون نے نجات دلائی تھی۔ان لوگوں کی زلفی کے گھر واپسی ہوئی تھی جہاں ایک فقیر کی آمد ہوئی تھی جو کہہ رہا تھا۔"دولت کی دولاتیں' سب دھری رہتی ہیں باتیں" پھر اس فقیر نے اپنی کہانی سنائی تھی۔

رانیہ کے گھر میں اوپر کسی روح کی آمد ہوتی ہے۔یہ ایک بے بس لڑکی شمائلہ کی روح ہے جو اپنے بھائی کو ڈھونڈنے نکلی اور خود موت کے چکر میں پھنس گئی۔تاشون نے اسے بتایا کہ وہ مر چکی ہے اور پھر اسے اور اس کے بھائی کو انصاف دلوایا۔اسی دوران میں تاشون دوسری مخلوق کے محبت کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے ایک اور واقعہ بتاتا ہے۔صنوبر کے جنگل میں ایک لڑکی عاشی پر جن زادی سوار ہوگئی تھی' وہ جن زادی اپنے محبوب کی قبر پر آئی تھی اور عاشی نے اس کا پیر دبایا تھا۔چنانچہ تاشون' عاشی کا علاج کرنے آتا ہے لیکن وہ جن زادی کسی انسان کی محبت میں گرفتار ہے جو مر چکا ہے۔اس کی روداد سن کر تاشون رنجیدہ ہو جاتا ہے۔

عاشی کو جن زادی سنہرا سے نجات دلانے کی داستان سن کر سب لوگ متحیر تھے۔اچانک ایک دن زلفی رات گئے گھر سے باہر تھا تو تاشون کو اپنے علم کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ وہ بیماریوں کے قافلے کی زد میں آ سکتا ہے' چنانچہ وہ اس کے جوتے میں جلتا ہوا انگارہ ڈال کر اس کو سڑک کے ایک طرف کر دیتا ہے اور پھر وہ بیماریوں اور وباؤں کی شکلوں' ان کے حلیوں اور نقصانات کے بارے میں بتاتا ہے۔اُدھر سیل شیا اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے نئے سرے سے ہتھیار بند ہو رہی ہے اور ایک مرتبہ پھر مقابلہ خیر و شر ہونے کو ہے۔

عاشی کو جن زادی سنہرا سے نجات دلانے کی داستان سن کر سب لوگ متحیر تھے۔اچانک ایک دن زلفی رات گئے گھر سے باہر تھا تو تاشون کو اپنے علم کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ وہ بیماریوں کے قافلے کی زد میں آ سکتا ہے' چنانچہ وہ اس کے جوتے میں جلتا ہوا انگارہ ڈال کر اس کو سڑک کے ایک طرف کر دیتا ہے اور پھر وہ بیماریوں اور وباؤں کی شکلوں' ان کے حلیوں اور نقصانات کے بارے میں بتاتا ہے۔اُدھر سیل شیا اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے نئے سرے سے ہتھیار بند ہو رہی ہے اور ایک مرتبہ پھر مقابلہ خیر و شر ہونے کو ہے۔

سیل شیا کو اپنے جس مطلوبہ وقت کا انتظار تھا' وہ وقت قریب تھا اور اس کی نشاندہی کر دی گئی تھی۔اِدھر رانیہ کی بیٹی ربیعہ کو خسرہ ہو گئی تھی' وباؤں' بیماریوں کی اشکال کے بارے میں تو اس نے سنا تھا لیکن یوں کسی دن اس کے اپنے گھر میں اس کی ملاقات بچوں کی بیماری خسرہ کی ظاہری شکل سے ہوگی' یہ اس کے سان و گمان میں نہ تھا۔

سیل شیا اپنے کام میں لگ گئی تھی۔اسے اگلے چاند گرہن سے پہلے چند "رماد" تیار کرنے تھے۔یہ اس کی جنگ میں استعمال ہونے والے پراسرار طلسم تھے لیکن یہاں تقدیر کھڑی سیل شیا پر ہنس رہی تھی کہ اسی کے گھر میں اس کی بیٹی لینا اسی کے تیار کردہ رماد سے اُسی کے خلاف استعمال ہونے والے مزید طلسم تیار کر رہی تھی۔یوں سیل شیا کے گھر میں اس کے خلاف ایک خفیہ دشمن جو اس کا اپنا خون تھا' تیار ہو رہا تھا۔دوسری طرف تاشون کو اس کے باپ کے روحانی تصرف کی وجہ سے ایک بزرگ ملے تھے جو قومِ اجنہ سے تعلق رکھتے تھے اور قومِ اجنہ میں انہیں نمایاں مقام حاصل تھا۔وہ اس جنگ میں اس کی مدد کو آئے تھے لیکن انہوں نے سب سے پہلے راشانیہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ تاشون اسے اس کی ابدی منزل تک پہنچائے کیونکہ وہ راستہ بھٹک چکی ہے۔

تاشون' راشانیہ کو اس کی منزلوں تک پہنچانے کو تیار تھا۔اُس رات کے پچھلے پہر اُسے لگا کہ کوئی اُسے پکار رہا ہے اور جب اُس نے اس پکار پر توجہ کی تو پتہ چلا کہ وہ گل بکاؤلی تھی' گل بکاؤلی ایک عظیم پراسرار کردار۔وہ تاشون کو نیچے زلفی کے باغ میں بلا کر خود گل بکاؤلی کے پھولوں کے جھنڈ میں تبدیل ہو گئی تھی۔

(اب آپ آگے پڑھیے۔)

•......•......•......•

رانیہ بہت خوش تھی' اس کے لان میں واقعی بہترین پھول پودے موجود تھے مگر گل بکاؤلی کی طرف اس کا خیال ہی نہ گیا۔اب جب اس کی خواہش کے برعکس گل بکاؤلی اس کے باغ میں بہار دکھا رہی تھی تو رانیہ بھی

پھولے نہیں سمارہی تھی۔

تاشون نے زلفی اور رانیہ کو تو مطمئن کر دیا تھا لیکن بکاؤلی کو مطمئن کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس وقت بھی جب تاشون نیچے سے فارغ ہو کر اوپر کمرے میں واپس آیا تو وہ ایک اندازِ دلربائی کے ساتھ مشرقی دریچے کے ساتھ لگے کاؤچ پر نیم دراز تھی۔ تاشون کو دیکھ کر وہ شوخی سے مسکرائی اور اٹھ بیٹھی۔ اس کی پائل کا نغمہ تاشون کے کمرے کی فضا میں گنگنانے لگا۔ اُس نے بڑے ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے بالوں میں لگا زرد رنگ کا دلکش پھول نکالا اور تاشون کی خدمت میں پیش کر دیا اور تاشون نے وہ پھول اُس سے لے لیا۔

''تمہیں اس طرح ظاہر نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' تاشون بولا۔

''کیا کروں، آپ سے ملنے اور دیکھنے کا دل چاہا تھا اور پھر اُس کی رخصتی کے وقت میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ میں چلی جاؤں گی، پریشانی نہیں ہوگی آپ کو۔'' گل بکاؤلی نے وعدہ کیا۔

''پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تمہیں یوں نہیں آنا چاہیے تھا!''

''کیا، اجازت کے ساتھ بھی نہیں؟'' گل بکاؤلی نے پوچھا۔

''کیا مطلب اجازت؟ کس کی اجازت؟ تم کس کی اجازت کے ساتھ آئی ہو؟''

''میری اجازت کے ساتھ!'' اُسی وقت تاشون کے کمرے میں ایک گونجدار آواز گونجی، وہ آواز ملک اعظم کی تھی۔ اب تاشون کے لیے گل بکاؤلی سے اور کچھ پوچھ گچھ کرنا مناسب نہ تھا۔

•......•......•......•

''آخر کار ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم سب کو تمہارا پورا بدلہ تو بس قیامت ہی کے روز ملے گا۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں، دوزخ کی آگ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا کی زندگی تو یہ کچھ بھی نہیں، صرف دھوکے کا سودا ہے۔ (اگر کوئی شخص دنیا میں رونما ہونے والے نتائج کو آخری سمجھتا ہے تو درحقیقت وہ سخت دھوکے میں مبتلا ہے۔ آدمی کو اصل اعتبار اُن نتائج کا ہونا چاہیے جو حیاتِ ابدی کے مرحلے میں پیش آنے والے ہیں۔) (سورۃ آلِ عمران۔ ۳۔ ترجمہ آیت ۱۸۵)

دنیا کی محبت انسان کو بے حد بزدل بنا دیتی ہے اور وہ موت جیسی ایک حقیقت جو زندگی کی سب حقیقتوں سے بڑی اور سچی حقیقت ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ انسان کی زندگی کی صرف اور صرف دو ہی حقیقتیں ہیں،

اس کا پیدا ہونا اور پھر موت سے ہمکنار ہونا، باقی جو اُس کے بیچ ہے، وہ ڈھونگ ہے، گورکھ دھندہ ہے، بہکاوا ہے اور کچھ نہیں ہے لیکن انسان کی بدنصیبی ہے کہ وہ اس بہکاوے، گورکھ دھندے اور ڈھونگ میں مست ہو جاتا ہے اور خود کو اپنی حقیقت سے روشناس نہیں کراتا، نتیجتاً وہ تیاری نہیں کر پاتا جس کے سبب وہ اپنی زندگی کی دوسری اور آخری حقیقت یعنی موت سے سکون و راحت اور اطمینانِ قلب کے ساتھ ہمکنار ہو سکے اور اِس جہاں سے کامیابی کے ساتھ اُس جہاں میں منتقل ہو سکے جہاں کے لیے اُس سے وعدہ کیا گیا تھا حیاتِ ابدی کا اور اس کے ثمرات کا، اس کے انعامات کا!!

•......•......•......•

وہ پورے چاند کی حسین رات تھی جب رات نے چاندنی میں نہا کر روپہلی سنگھار کیا تھا۔ اس کی سیاہ ناگن



☆ برٹرینڈ رسل ریاضی اور فلسفے میں اپنے اعلیٰ کارناموں کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھا۔ اس کی تصنیف ''اصول ریاضی'' کو ریاضی کی منطق کے موضوع پر کلاسیک کا درجہ حاصل ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ 1950ء میں جب اسے نوبل انعام دیا گیا تو یہ ''ادب'' پر تھا۔

☆ میکسم گورکی کو اشتراکی ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ اس نے اشتراکی ادب کا نمایاں ترین ناول ''ماں'' دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار ملک امریکا کی ریاست نیویارک میں الزبتھ ٹاؤن میں بیٹھ کر لکھا تھا۔

☆ انگریزی کے مشہور شاعر جان ملٹن کا خیال تھا کہ شاعری سے سیاسی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ اسی خیال سے وہ شاعری کرتا رہا لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ یہ ناممکن ہے تو وہ نثر میں انقلابی منشور لکھنے لگا اور کئی سال تک وہ یہی کام کرتا رہا۔ بعد میں جب یہ مشغلہ بھی بیکار ثابت ہوا تو وہ دوبارہ شاعری کی طرف رجوع ہوا اور ''جنت گم گشتہ'' تخلیق کی۔

فیصل دین پوری۔ خان پور

ایسی بکھری زلفوں نے کائنات کے ذرے ذرے کو اپنے فسوں میں جکڑا ہوا تھا، اس کے حسن و جمال کی شعاعیں سارے عالم میں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ رات کسی الہڑ دوشیزہ کی طرح اپنے ہی حسن و جمال کی روشنی میں دھیرے دھیرے بھیگتی چلی جا رہی تھی...... وہ تاشون کے ساتھ اُس کے کمرے کے دریچے میں کھڑی ماہِ کامل کے تابندہ چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی تو پھر بدرِ کامل نے بھی ٹھٹھک کر اُس حسینۂ عالم کو ایک لمحے کے لیے دیکھا اور پھر اس کے حسن کی تاب نہ لا کر بدلی میں چھپ گیا۔ اَب وُہ بدلی کی اوٹ سے اُس دلسوز حسن کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

آج کی رات مکمل سحر و اسرار کی روپہلی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ آدھی رات سے زیادہ رات گزر گئی تھی۔ اُس نے چاند سے نظریں ہٹائیں اور پھر خود بھی دریچے سے ہٹ گئی۔ اس کا پورا وجود فراعنۂ مصر کے قدیم زیورات سے سجا ہوا تھا۔ آج کی رات عشق کی مہک کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔

تاشون نے اس کے وجود کی اُس مخصوص خوشبو کے ساتھ اپنی زندگی کے کئی سال گزار دیئے تھے۔ آج کے بعد یہ خوشبو ہمیشہ کے لیے آسماں کی وسعتوں میں چھپ جانے والی تھی۔ اس کے دریچے سے ہٹ جانے کے بعد تاشون بھی ہٹ گیا۔ آج ایک عجیب سی گہری اداسی نے تاشون کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا، زمردی تسبیح اس کے ہاتھ میں تھی اور لبوں پر اپنے اللہ کا ذکر تھا۔ آنکھوں میں ایک انجانی، اَن چاہی نمی تھی کہ آخر انسان تھا اور انسان بھی وہ جسے ہزارہا سال سے ایک محبت گزیدہ روح نے تڑپتے سسکتے ہوئے اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ وہ ہزارہا سال سے تاشون کے لیے بھٹک رہی تھی اور جو وہ یہ کہتی تھی کہ تاشون اس کا ہزارہا سال سے محبوب ہے، اُس کے اِس عقیدے کو تو تاشون نے یکسر جھٹلایا تھا لیکن تسلسل کے ساتھ اس کی محبت کا اظہار اور اس کے خلوص سے وہ ضرور متاثر تھا۔

محبت کا وار تو ہوتا ہی اتنا سخت ہے کہ اس کی برداشت شاذ ہی کوئی رکھ پاتا ہو۔ محبت کی نگاہیں، اُف، کیا سحر ہوتا ہے اُن میں کہ عابد و زاہد بھی آناً فاناً اپنے دل ٹٹولنے لگتے ہیں کہ آیا ان کے دلوں نے اُن کے سینوں میں بغاوت تو نہیں کر دی اور دلوں کے چور دروازے چوپٹ کھلے دیکھ کر عابد و زاہد بھی اپنی سدھ بدھ بھولنے سی لگتے ہیں۔ محبت کی ظالم نگاہوں سے تو دانش وروں کی عقل بھی شکست کھا جاتی ہے بلکہ محبت فاتح عالم کے سامنے فلاسفروں، دانش مندوں کی عقلِ کُل پانی بھرنے لگتی ہے۔ شاعر ہوں، ادیب ہوں یا بڑے بڑے کوئی نام، سب

کے سب کبھی نہ کبھی اس محبت کی نگاہوں کے اسیر ہو جاتے ہیں پھر وصل ملے یا ہجر یار! دیوانوں کو اپنی دیوانگی اور فرزانوں کو اپنی فرزانگی پر ناز ہوتا ہے۔

آج تاشون کا دل بھی راشانیہ کی دیوانگی' اس کی فرزانگی پر سرنگوں تھا۔ اتنا حق تو اُس محبت بلکہ عشق گزیدہ کا بنتا تھا کہ اُسے اِس جہاں سے جاتے جاتے یہ سکون تو مل جائے کہ اس کی محبت رائیگاں نہیں گئی اور اس سے زیادہ تاشون اسے دے بھی نہیں سکتا تھا مگر یہ سکون راشانیہ کی امانت تھا جو اُس کی آگے کی منزلوں کو خوشی سے ہمکنار کر سکتا تھا اور تاشون اس کی ابدی منزل کے اس سفر کو پر سکون بنانا چاہتا تھا۔

تاشون نے راشانیہ کے سامنے اپنا مضبوط ہاتھ پھیلا دیا۔ راشانیہ نے اپنی سرگیں نگاہیں دھیرے سے اٹھائیں اور اپنا ہاتھ تاشون کے ہاتھ میں دے دیا۔ راشانیہ پر گویا شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ تاشون کے اردگرد راشانیہ کی مخصوص خوشبو نے گھیرا تنگ کر دیا۔ اُس کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ ابھری اور پھر معدوم ہوگئی۔ وہ اَب راشانیہ کو لے کر کھلے آسمان کے نیچے گل بکاؤلی کے جھنڈ کے پاس کھڑا تھا۔

''تم تیار ہو راشانیہ!'' تاشون نے نہایت آہستگی سے دریافت کیا۔

راشانیہ جو تنویمی کیفیت سے نکل آئی تھی' جواب میں اس کے لبوں پر جو مسکراہٹ آئی' اُسے دیکھ کر تاشون ششدر رہ گیا۔ اُس نے آج تک اس بدنصیب روح کو روتے تڑپتے ہی دیکھا تھا مگر آج پہلی مرتبہ اس کو مسکراتے دیکھا تھا۔ بے شک وہ دنیا کی سب سے خوبصورت مسکراہٹ تھی' راشانیہ کا ہاتھ اب بھی تاشون کے ہاتھ میں تھا۔ تاشون اب زیرلب کچھ پڑھنے لگا تھا اور پھر جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا' ویسے ویسے ایک عجیب سی روشنی راشانیہ کے گرد پھیلتی چلی گئی اور پھر تاشون رک گیا۔

''راشانیہ!'' اُس نے پکارا۔

''میرے محبوب!'' راشانیہ نے مؤدب انداز میں سر کو جھکا کر کہا۔

''تم اب ابدی منزلوں کی طرف جا رہی ہو' بے قراریوں کے سمندر کی وہ بے رحم موجیں جو تمہیں تمنا کے ساحل پر لا لا کر پٹخ رہی تھیں۔ وہ خدا کے فضل و کرم سے سکون پا گئی ہیں۔ تمہاری تمنا پوری ہوئی۔'' تاشون کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔

''میرے محبوب! بس اس سے آگے اور کچھ نہیں' بس!'' راشانیہ نے اپنا دوسرا ہاتھ اٹھا کر بے چینی سے تاشون کی طرف بڑھایا۔ ''بس میں اور کچھ نہیں چاہتی میرے محبوب' اگر مجھے پتہ ہوتا کہ میری مرادیوں پوری ہوگی تو خدائے کائنات کی قسم! میں بہت بہت پہلے اس جہاں کو تیاگ دیتی میرے محبوب! آپ کے منہ سے یہ لفظ ہی تو سننے کے لیے راشانیہ صدیوں سے بھٹک رہی تھی۔ اب میرا گوہرِ مراد اس آخری سفر میں میرا ہمدم ہوگا' مجھے یہی ابدی سکون چاہیے تھا میرے محبوب!'' راشانیہ سسک اٹھی' اس کی آنکھوں سے اشک موتیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔

تاشون نے ایک ہاتھ سے راشانیہ کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ میں زمردی تسبیح تیزی سے دانے گرا رہی تھی۔ راشانیہ کے گرد روشنیوں کا ایک ہجوم امڈ آیا تھا۔ گل بکاؤلی کے پھول اچانک ہی راشانیہ پر برسنے



لگے۔ تاشون نے اپنی پڑھائی تیز کر دی۔ راشانیہ کے اردگرد روشنیوں کا رقص جاری تھا کہ اسی اثناء میں اچانک ایک روشنی کا جھماکہ ہوا اور پھر چشمِ حیراں نے دیکھا کہ آسماں سے زمین تک ایک تیز روشنی کی لکیر بن گئی ہو۔ جیسے ہی راشانیہ نے اپنی آنکھوں سے اشک صاف کیے' تاشون نے پڑھائی روک دی۔ راشانیہ نے ایک نظر تاشون کی طرف دیکھا اور پھر عرش سے فرش تک بنی روشنی کی لکیر کو دیکھا' وہ لکیر اب اس کے قدموں پر آ کر رک گئی تھی۔ راشانیہ نے پہلے اپنے رَب کو پکارا۔ پھر اس کے لبوں سے جیسے ہی ''لبیک!'' کی صدائیں بلند ہوئیں' آسمان سے آتی روشنی نے ایک جھٹکے سے اُس کو اپنے نور میں ڈھانپ لیا۔ اَب وہ اس روشنی کی لکیر میں مدغم ہو کر اوپر اٹھتی جا رہی تھی۔ گل بکاؤلی کے ساتھ اَب گلاب بھی برس رہے تھے اور پھر راشانیہ کا حیاتِ جاوداں کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی تاشون کے گرد گھیرا تنگ کیے خوشبو ایک سسکی کے ساتھ روشنی کے اُس سفر میں راشانیہ کے ہمراہ روانہ ہوگئی اور ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں روشنی کی لامحدود لکیر کائنات کی وسعتوں میں گم ہوگئی۔

فضا اَب ساکت تھی' کائنات کی ہر شئے اپنی جگہ پر تھی' گل بکاؤلی کے جھنڈ کے پاس کائنات کا حسین راز اپنے ابدی سفر کی جانب کب اور کیسے روانہ ہوا' کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ ماہِ کامل بھی بدلی کی اوٹ میں اب تک اس طرح منہ چھپائے ہوئے تھا کہ کہیں اُسے اس حسین راز کی گواہی نہ دینی پڑ جائے...... وہ تو جا چکی تھی لیکن تاشون پتھر کے بت کی طرح آسماں کی جانب منہ اٹھائے ایستادہ تھا۔ اس کی یہ کیفیت نجانے اور کتنی دیر تک برقرار رہی لیکن اس کے کاندھے کو چھوتی ہوئی کوئی چیز نیچے اس کے قدموں میں آ پڑی۔ وہ چونک پڑا۔ یہ گل بکاؤلی کا وہ نسبتاً بڑا پھول تھا جو راشانیہ نے تاشون کے کمرے سے اٹھایا تھا...... تاشون جیسے ایک گہری سانس لے کر نیند سے بیدار ہوا تھا۔

''الوداع اے شہزادی...... ! الوداع۔'' تاشون کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اس نے اب بڑی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا اور پھر وہ گھر کے اندر جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ وہ زمین سے اٹھ کر پائل چھنکاتی تاشون کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

''تم؟'' تاشون نے اپنی بھیگی نظروں سے اُسے دیکھا۔

''جی' میں!'' گل بکاؤلی نے ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا اور پھر بغیر سوال و جواب کیے تاشون کے پیچھے مؤدبانہ انداز میں چلتے ہوئے اس کے ساتھ کمرے میں آ گئی...... تاشون آہستگی سے چلتے ہوئے دریچے میں آ کھڑا ہوا۔ وہ اور بدرِ کامل کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر وہ یکلخت دریچے سے ہٹا اور کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ گل بکاؤلی نے فوراً ہی ایک نہایت حسین بلوریں گلاس تاشون کی خدمت میں پیش کیا جس میں زردی مائل مشروب تھا۔

''تاشون! انکار نہ کرنا...... پی لو بیٹے!'' یہ ملک اعظم کی آواز تھی۔ اب انکار کی گنجائش نہ تھی۔ تاشون نے فوراً ہی گل بکاؤلی کا پیش کردہ مشروب اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر مشروب پیتے ہی اس کے اندر کے اضطراب کو جیسے سکون آ گیا اور پھر بکاؤلی بھی چلی گئی تھی۔ تاشون بستر پر دراز ہو گیا' ذرا دیر میں ہی نیند کی مہربان دیوی نے اُسے اپنے آنچل میں چھپا لیا تھا۔

صبح فجر کی اذان کے ساتھ تاشون کی آنکھ کھل گئی تھی حالانکہ اُسے سوئے ہوئے صرف دو گھنٹے ہی ہوئے

تھے۔ آنکھ کھلتے ہی اُس نے خود کو بہت فریش محسوس کیا۔ نماز اور اس کے بعد کے معمولات سے فارغ ہو کر وہ نیچے لاؤنج میں آ گیا تھا۔ مکیا جو حسبِ معمول کچن میں ناشتے کی تیاری کر رہی تھی' تاشون کو دیکھ کر وہ مستعدی سے ہاتھ چلانے لگی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ تاشون ناشتے سے پہلے ایک کپ چائے پینے کا عادی ہے اور پھر ذرا دیر میں ہی وہ بھاپ اڑاتی خوشبودار چائے لے کر آ گئی تھی۔ تاشون نے طشتری میں رکھا کپ اٹھالیا اور چائے کے خوشبودار گھونٹوں سے لطف اندوز ہونے لگا۔ چھٹی کا دن تھا' زلفی اور رانیہ دو دن پہلے شہر سے باہر عمر سومرو کے گاؤں ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ آج ان کی واپسی بھی متوقع تھی۔ ابھی تاشون اُن دونوں کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ باہر زلفی کی گاڑی کا ہارن بجا۔ مکیا جلدی سے کچن سے نکلی اور گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔ زلفی اور رانیہ ذرا دیر بعد آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

''ارے' آپ بھائی صاحب! اتنی جلدی اٹھ گئے؟'' رانیہ نے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

''ہاں' بس کچھ ضروری کام نبٹانے تھے۔'' تاشون نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اف' میں تو بہت تھک گیا ہوں۔'' زلفی نے صوفے پر تقریباً گرتے ہوئے کہا اس لیے میں تو عمر سے جلدی جان چھڑا کر صبح صبح ہی آ گیا۔ اب میں پورا دن آرام کروں گا۔'' زلفی نے اپنا پروگرام سیٹ کیا۔

''ناشتہ کیا آپ نے؟'' رانیہ نے تاشون سے پوچھا۔

''نہیں' ابھی تو نہیں کیا۔''

''ناشتہ تیار ہے! لگا دوں؟'' اس سے پہلے رانیہ کچھ کہتی' مکیا نے آ کر اطلاع دی۔

''تم لوگ ناشتہ کرو گے؟'' تاشون نے پوچھا۔

''مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' زلفی نے کہا۔

''چلیں تو پھر آ جایئے!'' رانیہ نے کچن سے گرم گرم پراٹھے لاتے ہوئے کہا اور پھر وہ تینوں ناشتے کے ساتھ انصاف کرنے لگے۔

''مجھے افسوس ہے' میں تمہارے ساتھ عمر کے کزن کی شادی میں نہ جا پایا' یقیناً عمر نے میرے کام کی نوعیت جانتے ہوئے زیادہ مائنڈ نہیں کیا ہوگا۔ مونگا بھی نہیں ہے یہاں ورنہ وہ بھی چلی جاتی۔''

''ہاں' یہ بات تو ہے۔'' زلفی نے تاشون کی بات سے اتفاق کیا۔ ''کمی تو اُس نے تمہاری محسوس کی مگر وہ سمجھتا ہے کہ تمہارے کام کی نوعیت ہی ایسی ہے۔''

''ویسے بھی مجھے تو اس شادی میں جا کر زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔'' رانیہ نے قدرے اداسی کے ساتھ کہا۔

''ارے! وہ کیوں بھابھی؟'' تاشون نے چونکتے ہوئے کہا۔

''ارے یار! تم تو جانتے ہی ہو' وہ ہی پرانی روایتی کہانی' لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ یورپ سے آیا ہوا اور لڑکی بچپن کی منگ یعنی منگیتر ہے' نہ تعلیم نہ صورت' اُن کا کوئی جوڑ نہیں' عمروں میں بھی فرق ہے' لڑکی عمر کے کزن سے بڑی ہے لیکن یہ شادی لازمی ہونی تھی' چاہے اَب وہ خوش رہیں یا نہ رہیں۔'' زلفی نے تاسف کے ساتھ کہا۔

''تو اِس میں کون سی ایسی نئی بات ہے' یہ تو اِن لوگوں کی روایات ہیں جو صدیوں سے چلی آ رہی ہیں۔''



تاشون نے کہا۔

''کیا؟ کیا مطلب؟ شادی میں محبت' پسندیدگی کچھ معنی نہیں رکھتی' وہ عمر کا کزن' میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ مستقبل میں دوسری شادی ضرور کرے گا۔'' زلفی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''ارے' میرے بھائی...... ! پوری بات تو سنو!'' تاشون نے کہا۔ ''بالکل ہے' محبت اور پسندیدگی کی اہمیت بلکہ علمِ نجوم نے تو شادی' محبت' پسندیدگی کے بارے میں ایسے ایسے راز فاش کیے ہیں کہ تم دنگ رہ جاؤ گے۔''

رانیہ جو کہ کچن کی طرف جا رہی تھی' تاشون کی بات سن کر وہیں بیٹھ گئی کیونکہ اب اسے علمِ نجوم سے ایک خاص انٹرسٹ ہو چکا تھا' اب وہ ان علوم پر مبنی کتابیں خاص طور پہ تاشون سے لے کر پڑھتی تھی۔

''علمِ نجوم بھی محبت اور پسندیدگی کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور ایسے ایسے اصول وضع کرتا ہے کہ اپنا بہترین ساتھی پہچاننے میں مدد بھی ملتی ہے۔'' تاشون نے بات آگے بڑھائی۔ ''سب سے پہلے تو یہ کہ عاشق' معشوق کو علمِ نجوم میں 'روحانی ساتھی' کی اصطلاح سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور اس کی رو سے یہ 'روحانی ساتھی' وہ ہوتے ہیں جن کی جذباتی' دماغی' جسمانی سرگرمیاں' مشاغل وغیرہ ایک جیسے ہوں' دوست اور ملنے جلنے والوں کا حلقہ ایک ہی ہو یا ایک جیسا ہو لیکن ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس بات میں بھی ابہام پایا جاتا ہے کہ ایک جیسے دو فرد جن کی پسند ہر لحاظ سے ایک ہو' دوستی یا شادی کے رشتے میں بندھنے کے بعد خوش رہ سکیں گے؟ دراصل ان روحانی ساتھیوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں' ایک تو وہ جو مددگار ہوتے ہیں' خوشی دیتے ہیں اور ترقی کے سلسلے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں جبکہ دوسرے روحانی ساتھی وہ ہوتے ہیں جو ابتری' انتشار اور تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ ہماری تاریخ اور ادب دوسری قسم کے افراد کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے مثلاً رومیو جیولیٹ' ایک دوسرے سے بے انتہا کشش رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے روحانی ساتھی تھے یعنی عاشق و معشوق تھے مگر ان کو ایک دوسرے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا' ہیر رانجھا' سسی پنوں' لیلیٰ مجنوں' انتھونی' قلوپطرہ بھی ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور روحانی ساتھی تھے مگر ان کا انجام بھی دنیا والوں کے سامنے ہے۔ نجوم کی رو سے کشش کا یہ عنصر سیاروں کے باہمی اثر سے وجود میں آتا ہے۔ سیاروں کے اثر سے جو تحریک پیدا ہوتی ہے' وہ بہت طاقتور ہوتی ہے' خواہ وہ اچھی ہو یا بری' اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی بچا جا سکتا ہے۔ ہاں' یہ ضرور پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ غیر فائدہ مند کشش کے دائرے میں ہیں یا فائدہ مند کشش کا شکار ہوئے ہیں...... اچھے لوگوں کی کشش فائدہ لاتی ہے جبکہ برے لوگوں کی کشش آپ کو نقصان سے دوچار کرتی ہے۔ نجوم کی رو سے اگر دو افراد کے درمیان کشش فائدہ مند ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ایسی عورت کے زائچے میں شمس اور مریخ اور مرد کے زائچے میں قمر اور زہرہ سے سعد نظرات کے تحت ہوں گے اور اگر غیر فائدہ مند کشش کے دائرے میں آ گئے تو اس کی پہچان یہ ہے کہ دوستی کے ابتدائی مراحل میں آپ کا دوست یا محبوب مذہب' سیاست' کھیل یا کسی بھی چیز کے معاملے میں بہت جوش اور سرگرمی کا اظہار کرتا ہے تو یہاں آپ کو احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ کسی بھی چیز کے متعلق سرگرمی انتہا درجے کی خودغرضی کو ظاہر کرتی ہے' یہاں یہ واضح ہوگا کہ آپ کا محبوب یا دوست آپ کو اپنے کھیل' اپنی کسی پسندیدہ ہابی یا ایسے ہی دوسری چیزیں زیادہ بیان کرے گا

حتیٰ کہ اپنی تفریحات کو بھی ترجیح دے گا بہ نسبت آپ کے تو یہ آپ کے لیے خطرے کی گھنٹی کی علامت ہے۔ اگر آپ اپنی موجودہ دوستی یا محبت کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانا چاہتے ہیں تو نجوم میں ایسے سادہ اصول ہیں جن کو اپنی کامیاب محبت کے لیے ذہن میں رکھنا ضروری ہے' وہ یہ کہ محبت یا دوستی کے ابتدائی مراحل میں اپنے محبوب یا دوست کو اپنی جنس کے دوستوں سے ہرگز ہرگز نہ ملائیں کیونکہ علمِ نجوم کی رو سے وہ گھر house جو ان دونوں کی نشاندہی کرتا ہے' ایک دوسرے کے مخالف ہے پھر آپ دوست یا محبوب نہ رہیں گے بلکہ رقیب بن جائیں گے حتیٰ کہ اپنی ہم جنس یا مخالف جنس کی غائبانہ تعریف یا تذکرے بھی محبت کی نوزائیدہ زندگی کو ختم کر دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ دو افراد پہلی مرتبہ کسی زینے پر ملیں تو محبت کے معاملات میں پریشانی آ سکتی ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ بتانا مشکل ہے' تاہم یہ بات حقیقت پر مبنی ہے' اسی طرح پہلی ملاقات اگر کسی ہسپتال' اسکول یا کسی اہم ادارے میں ہو تو محبت اور شادی میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ فطری زائچے میں یہ تمام ادارے بارہویں گھر کے تحت آتے ہیں۔ اگر آپ اپنے محبوب کو تحفے میں دستانے دیں گے تو یہ علیحدگی کی علامت ہے۔ اسی طرح کسی کا دستانہ اگر گر گیا ہو تو آپ ہرگز نہ اٹھائیں' یہ اچھی علامت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ علم نجوم یہ چیلنج کرتا ہے اور ایک زندہ حقیقت ہے کہ اگر آپ کسی سے علیحدگی چاہتے ہیں اور ناپسندیدہ شخصیت کو اپنی زندگی سے نکالنا چاہتے ہیں تو اسے دستانوں کا ایک جوڑا تحفے میں دے ڈالیں' وہ آپ کی زندگی سے نکل جائے گا...... نئے دوست یا محبوب سے پہلی مرتبہ جمعرات' جمعہ یا اتوار کو ملنا خوش قسمتی کا باعث ہوتا ہے اور اسی سے شادی ہو جاتی ہے۔''

''یہ تو بہت ہی زیادہ دلچسپ باتیں ہیں اور شادی' محبت' دوستی کے بارے میں نجوم کی رو سے کس قدر پراسراریت کی حامل ہیں۔'' رانیہ نے بہت حیرت سے کہا تھا۔

''بھابھی! آپ اور بھی حیرت انگیز باتیں سننا چاہیں گی؟'' تاشون نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بالکل کیونکہ ان پراسرار دنیاؤں کے رازوں میں سے ایک راز محبت ہے' اس کے راز و نیاز جاننا کون نہیں چاہے گا۔'' رانیہ نے کہا تھا۔

''تو پھر سنیے! باہمی دوستی' کشش یا محبت کے متعلق ایک راز یہ ہے کہ اگر محبت یا دوستی' دو' چھ یا آٹھ ماہ بعد ختم ہو جائے تو ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب محبت یا دوستی کا انحصار دوسرے فریق کے بجائے آپ پر زیادہ ہو یعنی دوسرے فریق کے مقابلے میں آپ اس میں زیادہ دلچسپی لیتے ہوں اور اس کی طرف زیادہ مائل ہوں اور جو محبت یا دوستی ایک سال سے زیادہ عرصے قائم رہتی ہے' اس کے لیے بھی دوسرا' چھٹا اور آٹھواں سال نازک وقت ہوتا ہے اور ساتھ ہی آپ اگر کوئی قابل قدر تعلق برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو خیال رکھیے کہ دوستی یا محبت شروع ہونے کے دوسرے' آٹھویں' چھٹے مہینے یا سال غلط فہمیاں نہ پیدا ہوں اور خاص طور پر ایک بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ دوسرے اور آٹھویں سال کا دوسرا اور آٹھواں مہینہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان پر قمر (ناپائیداری اور متلون مزاجی) اور زحل (اختتام) کی حکومت ہوتی ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تعلق جس میں ایک سال سے زیادہ عرصہ تک کوئی تبدیلی نہ آئے تو اسے رومان نہیں' دوستی کہیں گے اور اگر اس تعلق کے ایک سال کے خاتمے پر ان دونوں میں سے کوئی بھی



مستقبل کے منصوبوں سے متعلق کوئی گفتگو نہ کرے تو اس دوستی کا انجام شاید ہی شاذ و نادر شادی پر ہو...... اسی طرح علمِ نجوم کی رو سے شریکِ زندگی' دوست یا محبوب کا آپ سے ٹھیک سات سال یا آٹھ سال بڑا ہونا آپ کے لیے خوش قسمتی کا باعث نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف شریکِ زندگی' محبوب' دوست کی عمر میں تین' چھ' دس یا بارہ سال کا فرق ہونا بہت ہی زیادہ موافق اور محبت کی کامیابی کے لیے مبارک ثابت ہوتا ہے خصوصاً بارہ سال یا اس سے زیادہ کا فرق رکھنے والے حیرت انگیز طور پر خوش و خرم زندگی گزارتے ہیں کیونکہ یہ بات پراسرار یا حیرت انگیز جو کچھ بھی سمجھیں کہ بارہ سال یا اس سے زیادہ فرق رکھنے والے شریکِ زندگی' دوست یا محبوب بہت سی دلچسپیاں اور عادات ایک جیسی ہوتی ہیں اور یہی چیز ان کو منسلک رکھتی ہے اور عمر کا فرق اس کے آگے کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

''زندگی کے اس پہلو پر علمِ نجوم میں کیا کیا چھپا ہے' میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' رانیہ نے تاشون کی بات ختم ہونے پر کہا۔

''صرف اس پر ہی نہیں بھابھی' ہر ہر پہلوئے زندگی کے لیے علمِ نجوم قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہے اور اس کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے کیونکہ نجوم ایک سائنس' کائناتی سائنس ہے۔ یہ غیب کا علم نہیں ہے اور اسے غیب کا علم کہنے والے' اس علم کی توہین کرتے ہیں۔''

''ٹھیک کہتے ہیں بھائی صاحب' علم نجوم کو غیب کا علم ہی سمجھا جاتا ہے اور لوگ اسی لیے اس سے بچنا چاہتے ہیں جبکہ یہ لوگوں کی بدقسمتی ہے کہ کائناتی سائنس کو اس طرح آج تک سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور نقصان اٹھاتے ہیں لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم علم نجوم کے بارے میں لوگوں کو ٹھیک اور صحیح معلومات فراہم کریں تاکہ وہ اس کو غیب کا علم بتانے والوں اور غیب کا علم سمجھنے والوں کی غلط فہمی دور کر سکیں؟'' رانیہ اس وقت اس کائناتی سائنس کے بارے میں بہت سیریس نظر آ رہی تھی۔

''جی بھابھی! میں اس سلسلے میں کچھ کام کر تو رہا ہوں' میں لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہماری اس کائنات کے راز' اس کائنات کی تسخیر جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ وہ ہمارے لیے تسخیر کی جا چکی ہے' ہم اشرف المخلوقات ہیں' چنانچہ اس کائنات اور اس کے اندر کی ہر شئے ہمارے لیے ایسا راز ہے جس کا سرا علم نجوم کے پہلے سبق میں چھپا ہوا ہے۔ علم نجوم کے عظیم معمار کلاڈیس ٹولمی کی تخلیق "Tetrabiblos" علم نجوم پر لکھی جانے والی ایک سائنٹفک کتاب ہے' اس نے قدرتی سائنس کی حیثیت سے علم نجوم کے قوانین ترتیب دیئے ہیں' اس کتاب میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ہماری کائنات میں ہر چیز کے لیے لازم ہے کہ وہ خلاء' وقت اور سبب و علت کے طبعی قوانین کی پابندی کرے اور وہ سائنسی علوم جن کی بنیاد ان تین اصولوں پر ہے' وہ (قدرتی سائنس) کہلاتے ہیں اور جن علوم کی بنیاد ان تین اصولوں پر نہیں ہوتی' وہ ''مابعد الطبیعات'' کہلاتے ہیں لیکن کلاڈیس ٹولمی نے علم نجوم کو قدرتی یا کائناتی سائنس کی حیثیت سے ثابت کیا ہے۔''

حیرت' اسرار' تجسس اور علم و آگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آیندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

# مسئلہ یہ ہے

## خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کرگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحبِ استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپردِ ڈاک ہوجائیں گے جو کسی مجبوری کی بنا پر ڈاک خانے تک نہیں جاسکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر نہیں کر سکتیں۔ یہ ایسی نیکی ہوگی جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے از خود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپردِ ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو برائے کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے اُن کے جوابات حسبِ سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرمالیں۔

(۱) براہِ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے' دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصلی نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اُسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی پتوں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کریں تو نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوراً جواب کے لیے اپنی ڈاک اِس پتے پر روانہ کریں۔

**ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔**





# ماہِ مُحَرّمُ الحرام

**عزیزو......!**

خداوندِ کریم نے قرآنِ المجید میں چار مہینوں کو حُرمت والا قرار دیا ہے۔ مُحَرّمُ الحرام' رجبؔ ذُوالقعدہ اور ذُوالحجہ۔ ایامِ جہالت میں بھی اِن مہینوں میں لڑائی کا آغاز نہیں کیا جاتا تھا۔ سیّدنا رضا ؓ سے روایت ہے حضورِ اکرم ﷺ محرم الحرام کی یکم تاریخ کو دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور جب نماز سے فارغ ہوتے تو ہاتھ اٹھا کر یہ دُعا تین بار پڑھتے تھے۔ (دُعا) ماہِ محرم الحرام کی دسویں کو سیّدنا حضرت اِمام حسین ؓ شہید ہوئے۔ اِس روز بہت کچھ پڑھنے کی تاکید ہے جسے یہاں لکھنے سے بات طویل ہوجائے گی۔ اِس روز کی عبادت ہرگز ترک نہ کریں۔ روزہ بھی رکھیں۔ اِس دن کی عبادت سوسال کی عبادت کے برابر ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَنتَ اِلا لہُ القَدِیمُ وَھٰذِہٖ سَنَتہ" جَدِیدَۃ" فَاَسئَلُکَ فِیھَا العِصمَۃَ مِنَ الشَّیطٰنِ وَالقُوَّۃَ عَلیٰ ھٰذِہِ النَّفسِ الاَمَّارَۃِ بِالسُّوٓءِ وَالاِشتِعَالَ بِمَایُقَرِّ بُنِی اِلَیکَ یَاکَرِیمُ یَاذَاالجَلَالِ وَالاِکرَامِ یَاعِمَادَ مَن لَّا عِمَادَ لَہ یَاذُخرَمَن لَاذُخرَلَہ یَاحِرزَمَن لَا حِرزَلَہ یَاغِیَاثَ مَن لَّاغِیَاثَ لَہ یَاسَنَدَ مَن لَّا سَنَدَ لَہ یَا کَنزَ مَن لَا کَنزَ لَہ یَاحَسَنَ البَلَاءِ یَاعَظِیمَ الرَّجَاءِ یَاعِزَّ الضُّعَفَآءِ یَامُنقِذَالغَرقیٰ یَامُنجِیَ الھَلکیٰ یَامُنعِمُ یَامُجمِلُ یَامُفضِلُ یَا مُحسِنُ اَنتَ الَّذِی سَجَدَ لَکَ سَوَادُاللَّیلِ وَنُورُالنَّھَارِ وَضَوءُ القَمَرِوَشُعَاعُ الشَّمسِ وَدَوِیُّ المَآءِ وَحَفِیفُ الشَّجَرِ یَااَللّٰہُ لَاشَرِیکَ لَکَ اَللّٰھُمَّ اجعَلنَا خَیرًامِّمَّایَظُنُّونَ وَاغفِرلَنَا مَالَایَعلَمُونَ وَلَا تُؤَاخِذنَابِمَا یَقُولُونَ حَسبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّاھُوَعَلَیہِ تَوَکَّلتُ وَھُوَرَبُّ العَرشِ العَظِیمِ اٰمَنَّا بِہٖ کُلّ" مِّن عِندَ رَبِّنَاوَمَایَذَّ کَّرُاِلَّا اُولُوالاَلبَابِ رَبَّنَا لَاتُزِغ قُلُوبَنَا بَعدَ اِذھَدَیتَنَا وَھَب لَنَا مِن لَّدُنکَ رَحمَتہً اِنَّکَ اَنتَ الوَھَّاب

□ زبیدہ خان' پشاور۔

☆ بیٹی! تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو اور اگر سچے دل سے معافی کی طلبگار رہو تو اللہ ضرور معاف فرمائے گا۔ یہ عہد کرلو کہ آیندہ ایسا کوئی عمل نہیں کرو گی جو اسلامی قوانین کے خلاف ہوگا۔ نماز کی پابندی کرو اور نمازِ فجر کے بعد 11 تسبیح توبہ استغفار کی پڑھو اور دُعا کرو۔ یہ وِرد نہایت پابندی کے ساتھ 3 ماہ کرو پھر مجھے حالات سے مطلع کرو۔

□ فہیم احمد' کراچی۔

o بابا جی! میرا بھانجا جس کا نام فیضان ہے' اس کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں' اسے کانٹریکٹ پر رکھا ہوا ہے' مستقل نہیں کرتے۔ اس نے ایسوسی ایٹ انجینئرنگ کا کورس کیا ہے اور وہ آفیسر پوسٹ پر ہے مگر اسے مستقل نہیں کیا جارہا جس کی وجہ سے بڑی پریشانی ہے۔ آپ فیضان کے لیے کوئی وظیفہ بتایئے کہ اس کی سروس کمپنی میں مستقل ہوجائے اور اس کے افسران اسے تنگ نہ کریں۔

☆ بیٹے فہیم! اللہ تمہارے بھانجے کو کامیابی عطا فرمائے۔ نمازِ فجر کے بعد 41 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ حسبِ استطاعت صدقہ' خیرات ضرور کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ صفیہ' چکوال۔

☆ بیٹی! یہ تمہارا پہلا خط ہے جو مجھے ملا ہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد بکثرت یَااَوَلُ پڑھو' تعداد کی قید نہیں' جس قدر پڑھ سکو پھر حاجت بیان کرو۔ حسبِ استطاعت صدقہ' خیرات ضرور کرو۔ یہ وہ عمل ہے جس سے بہت سے مسائل حل ہوجاتے ہیں۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ زرینہ' جھنگ۔

☆ بیٹی زرینہ! تمہارے حالات کی سنگینی کا مجھے اندازہ ہے لہٰذا اب میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ مجھ سے تعویذ منگوالو۔ اس کے لیے تمہیں مجھے براہ راست خط لکھنا ہوگا' خط کے ہمراہ جوابی لفافہ ضرور رکھنا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

□ پروین سکندر' کراچی۔

o پیارے بابا جان! السلام علیکم! اللہ آپ کو خوش رکھے۔ کچھ عرصے پہلے میں نے آپ کو اپنا مسئلہ لکھا تھا کہ لوگوں کے پاس ہمارے پیسے پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ نے فجر کی نماز میں سورۃ رحمٰن پڑھنے کے لیے کہی تھی اور 21 دن بعد بتانے کے کہا تھا۔ وظیفہ کیا' بیچ میں مجبوری کے دن آ گئے۔ وہ اور دو تین نماز بھی قضا ہوگئی تھیں۔ انہیں بھی شمار کرکے پورے 21 دن میں وظیفہ پورا کرلیا مگر ابھی تک ہمارے پیسے ملنے کی امید نہیں جبکہ ہمیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ بابا جان! اب بتائیں میں کیا کروں؟ میرے شوہر نے سپر اسٹور کھولا ہے' کچھ پیسے لگائے ہیں اور مزید پیسوں کی ضرورت ہے۔ زیور وغیرہ بیچ کر بھی پیسے پورے نہیں ہورہے۔ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے پیسے ہمیں واپس دلادے۔

☆ بیٹی پروین! ہمت اور استقامت کے ساتھ وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔ وظیفہ کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وظیفہ مکمل آداب کے ساتھ کیا جائے۔ نماز کی پابندی اولین شرط ہے۔ مشکل وقت اللہ کی طرف سے آزمائش ہے' جو لوگ صبر سے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہوجاتے ہیں۔

□ محمود' فیصل آباد۔

☆ بیٹے محمود! اللہ تمہیں اولاد جیسی نعمت جلد عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور اللہ سے دُعا کرتے رہو۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ فجر پڑھ کر اپنے اور بیوی کے اوپر دَم کرو اور نیک اور صحت مند اولاد کی دُعا کرو۔ یہ عمل لگاتار 21 روز کرو۔ بیوی سے کہو' وہ نمازِ عصر کے بعد دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر 7 بار سورۃ قدر پڑھے اور دُعا کرے۔ انشاء اللہ' جلد کرم ہوگا۔ اس وظیفہ کی اُن تمام افراد کو اجازت ہے جو اولاد چاہتے ہیں۔

□ جاوید خان' اٹک۔

☆ بیٹے! نماز کی پابندی کرو تاکہ الٹے سیدھے خیالات ذہن میں نہ آئیں۔ زندگی اللہ کی امانت ہے جو اس میں خیانت کا سوچتا ہے پھر اس کے تمام کام رکتے چلے جاتے ہیں۔ پہلے تو اپنی سوچ بدلو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد تم دونوں 7-7 تسبیح پڑھو یَاحجتہ القائم اول وآخر دُرود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 33 دن ہے۔ اس دوران نماز بالکل قضا نہ ہو۔

□ قربان' سرمک بلتستان۔

o قابلِ احترام بابا جی! میں کافی عرصہ سے سچی کہانیاں پڑھ رہا ہوں۔ آپ کا کالم مسئلہ یہ ہے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ کے جذبۂ خدمتِ خلق کو دیکھتے ہوئے اتنی دور سے یعنی پاکستان کے شمالی علاقہ جات اسکردو بلتستان مقام سرمک سے خط لکھ رہا ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی کو تقریباً 12 سال ہوچکے ہیں لیکن ابھی تک اولاد سے محروم ہوں۔ بیوی کا علاج چل رہا ہے۔ میرا اپنا بھی چیک اپ ہوا ہے' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دو تین دفعہ سوچا' بیوی کو طلاق دے دوں اور دوسری شادی کرلوں مگر کسی کا دل دکھانا بھی گناہ ہے۔ بیوی کا دل دکھانا نہیں چاہتا اور میں اللہ تعالیٰ سے ناامید بھی نہیں ہوں۔ میرا دوسرا مسئلہ بے روزگاری کا ہے۔ میں پانچ وقت باجماعت نماز کا پابند ہوں۔ ایف اے پاس ہوں۔ ہر جگہ درخواست دیتا ہوں مگر مایوسی ہوتی ہے۔

☆ بیٹے قربان! اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس مت ہونا۔ ہر لمحے اللہ کو یاد کرتے رہو' آپس میں میاں بیوی محبت سے رہو۔ اللہ بہت اسباب پیدا کرے گا۔ بیٹے! تم نمازِ فجر اور عشاء کے بعد گھر میں باآوازِ بلند اذان دو اور پھر اولاد کے لیے دُعا کرو۔ بیوی سے کہو کہ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دودھ اور دو کھجور کھالیا کرے۔ یہ عمل نہایت پابندی کے ساتھ کرو' مدت ایک ماہ ہے۔

□ بانو' خیر پور۔

☆ بیٹی بانو! اللہ تمہاری والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ایک دن ہر شخص کو لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے لہٰذا ہمیں اپنے اعمال کی فکر کرنی چاہیے۔ تم نے ناسمجھی میں بہت بڑی غلطی کی کہ اپنا راز کسی کو دے دیا۔ بہرحال جو ہونا تھا' وہ ہوگیا۔ اب تم نماز کی پابندی کرو۔ کسی سے کچھ مت کہو۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح یَارافعُ کی پڑھو اور اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ نمازِ عشاء کے بعد 7 بار سورۃ الناس اور 11 بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرو پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 40 دن ہے۔

□ شمع شاہ' ملتان۔

☆ بیٹی شمع! نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ انعام پڑھو پھر حاجت بیان کرو۔ نمازِ فجر کے بعد 7 تسبیح یَاناصرُ یانصیرُ کی پڑھ کر تصور میں گھر والوں کو لاؤ اور اُن پر دَم کرو۔ یہ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو پھر وظیفہ مکمل ہونے کے بعد کچھ رقم ضرور خیرات کردینا۔ کرم ہوگا۔

□ عمران خان' میانوالی۔

☆ بیٹے عمران! تم لوگ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو۔ تم خود اپنا رویہ والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھا کرو۔ تمہاری دیکھا دیکھی تمام بہن

بھائی درست رویہ اپنالیں گے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ نجم پڑھو اور دُعا کرو۔ ہروقت باوضو رہنے کی کوشش کرو۔ بکثرت لاَحولَ وَلاقوۃ اِلا باللہ کا وِرد کیا کرو۔ مجھے 3 ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ عاصمہ بتول، گھوٹکی۔

☆ بیٹی عاصمہ! تم وٹامن سی کا استعمال شروع کرو، دن میں دوبار وٹامن سی کی گولی لو۔ پھل بھی وہ استعمال کرو جن میں یہ وٹامن بہت موجود ہو۔ تمہیں جس کمی کا احساس لوگوں نے دلایا ہے، اس کی وجہ سے تمہاری عادت پختہ ہوگئی ہے۔ بہرحال اس پر قابو تمہیں خود پانا ہوگا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ کچی سبزیاں، پھل اور دودھ بکثرت استعمال کرو۔ نمازِ فجر کے بعد سورۃ محمدؐ پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ وظیفہ کی مدت 2 ماہ دس دن ہے۔

□ رافعہ عزیز، کراچی۔

o جناب بابا جی! میں اپنے بیٹے کا مسئلہ لے کر آئی ہوں۔ اس کا پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگتا ہے۔ پہلے وہ رات کو بارہ بجے تک پڑھتا تھا اور تمام کام کرتا تھا، سب سے محبت اور سب کی عزت کرتا تھا۔ اب جب سے ساتویں کلاس میں آیا ہے، پڑھائی سے اس کا دل بالکل اچاٹ ہوگیا ہے، اسکول سے روز شکایتیں آتی ہیں، وہاں بھی کوئی کام نہیں کرتا اور گھر میں بھی زبردستی کتابیں دے کر بٹھاتی ہوں تو کتاب، کاپی سامنے رکھے بیٹھا رہتا ہے مگر نہ تو لکھنے کا کام کرتا ہے اور یاد تو اسے بالکل بھی نہیں ہوتا، دو دو لائنوں کے جواب یاد کرنے کے لیے گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے۔ میری شوہر سے علیحدگی ہوئے 12 سال ہوگئے ہیں، یہ بچہ علیحدگی کے چھ ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ اب یہ ہی میری امیدوں کا مرکز ہے۔ میں نے اس کی وجہ سے شادی بھی نہیں کی۔ گھر میں میری والدہ، بھائی، میں اور میرا بھانجا رہتے ہیں، سب اس سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس کا بہت خیال کرتے ہیں۔ میں خود بھی ٹیچر ہوں، اس کی تمام جائز ضرورتیں اور خواہشات پوری کی جاتی ہیں مگر اب یہ سب گھر والوں کے ساتھ بدتمیزی کرنے لگا ہے، باہر یہ سب سے ڈرتا ہے اور گھر میں سب سے لڑتا ہے۔ خدا کے لیے، کوئی ایسا وظیفہ بتایئے کہ اس کے اندر خوب پڑھنے اور علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور یہ نارمل لوگوں کی طرح زندگی گزارے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمرِ خضر عطا کرے۔

☆ بیٹی رافعہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو۔ ہر نماز کے بعد ایک تسبیح اللھم ھدیٰ پڑھ کر بیٹے کا نام لو۔ اول وآخر دُرود شریف 7-7 بار۔ جب جب یاد آئے، الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر بیٹے پر دَم کرو۔ رویہ نرم رکھو، صرف ضرورت کے تحت بات کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔

□ امینہ، آزاد کشمیر۔

☆ بیٹی! بارہا میں یہ بات بتا چکا ہوں کہ وظیفہ امتحان شروع ہونے سے پہلے کیا جائے تو نتیجہ حسبِ منشا آتا ہے۔ اب تو صرف دُعا ہی کرو کہ اللہ تمہیں اچھے نمبروں سے پاس کردے۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو مسلمان لڑکی ہونے کے ناتے مذہب اسلام نے تمہیں اختیار دیا ہے کہ اپنی پسند ناپسند سے والدین کو آگاہ کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ عشاء کے بعد 3 تسبیح یارحیمُ کی ضرور پڑھو اول وآخر پہلا کلمہ پھر دُعا کرو۔ انشاءاللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت 21 دن ہے۔

□ فرزانہ، لاہور۔

☆ بیٹی فرزانہ! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم پر اپنا کرم کیا۔ اس یقین اور اعتماد کے ساتھ مانگتی رہو۔ وہ سب کچھ عطا کرے گا۔ بیٹی! نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 40 دن ہے۔ خیال رہے، اگر ایک دن بھی ناغہ ہوگیا (سوائے معذوری کے دنوں کے) تو وظیفہ ازسرِنو کرنا ہوگا۔

□ نرگس، حیدرآباد۔

o پیارے بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میں بہت پریشان ہوں، اس سے پہلے بھی آپ کو خط لکھ کر بھیجا لیکن مجھے جواب نہیں مل سکا۔ اب پھر دوبارہ خط لکھ رہی ہوں۔ پچھلے 15 سال سے میں مالی طور پر بہت پریشان ہوں۔ آج تک میرا جتنا بھی مہینے کا خرچہ ہے، وہ میری آمدنی سے پورا نہیں ہوسکا۔ بہن بھائیوں کی مدد سے زندگی کی گاڑی چلتی رہی لیکن اب بچے بڑے ہورہے ہیں، ان کے خرچے بھی بڑھ رہے ہیں۔ میرے شوہر کو صرف چھ ہزار مہینہ تنخواہ ملتی ہے اور میں کرائے کے مکان میں رہتی ہوں۔ آپ خود سوچیں، تین بچوں کے ساتھ اس مہنگائی میں، میں کس طرح گزارہ کرتی ہوں، میرا دل جانتا ہے جس کی وجہ سے میں بہت شدید بیماری کا شکار ہوگئی تھی، اب بھی بلڈ پریشر کی دوا کھاتی ہوں۔ بہت کوشش کے بعد میرے شوہر نے اپنے کام کے لیے چند دن پہلے کرائے کی ایک دکان لی ہے۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ کاروبار اچھا چلے۔ اگر ہوسکے تو آپ مجھے برکت کے لیے تعویذ بھیج دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی احسان مند رہوں گی اور آپ میرے لیے دُعا کیجیے گا کہ میں اس بیماری سے چھٹکارہ پا لوں۔

☆ بیٹی نرگس! ہر نماز کے بعد ایک ہزار مرتبہ یَاوالیُ کی تسبیح پڑھو اور دُعا کرو۔

□ نیلم بشیر، کراچی۔

☆ بیٹی نیلم! وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ کرو۔ تمہیں بہت تفصیل سے جواب دیا جاچکا ہے۔ خاص طور سے کسی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں کہ کیا پڑھ رہی ہو اور کیوں پڑھ رہی ہو۔ ہاں! اگر والدہ پوچھیں تو انہیں ضرور بتادو۔

□ ایمن خان، برونائی۔

o محترم بزرگ! اللہ آپ کے علم میں بہت اضافہ کرے۔ میں اپنے نہایت ہی ذاتی مسئلے کے لیے آپ سے رجوع کررہی ہوں۔ میری دو بیٹیاں ہیں جن کی عمریں دس اور بارہ سال ہیں۔ دونوں بہت نافرمان ہیں۔ بظاہر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں مگر میں بہت پریشان ہوں۔ لڑکیاں ہیں، اگر یہی حال رہا تو لوگ والدین کو ہی برا بھلا کہیں گے۔

☆ بیٹی ایمن خان......! خوش اور آباد رہو۔ اتنی دور سے خط لکھ رہی ہو۔ اگر جوابی لفافہ ساتھ ارسال کردیتیں تو میں براہِ راست جواب دے دیتا۔ بہرحال نمازِ فجر اور عصر کے بعد 41-41 بار سورۃ کوثر پڑھ کر بچیوں پر دَم کرو۔ بچے وہی سیکھتے ہیں جو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ گھر کا ماحول درست کرو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔

□ رضیہ نواز، کوئٹہ۔

☆ بیٹی! جانے والوں کے لیے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن پڑھا کرو۔ جو سوچ رہی ہو، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ استخارہ مکمل طور پر نہیں کرپائی ہو۔ جو باتیں ذہن میں تھیں، وہی خواب میں نظر آیا ہے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو کہ اللہ تمہاری والدہ کے درجے بلند کرے۔

□ شہناز ستار، شمالی وزیرستان۔

☆ بیٹی شہناز! نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ والدہ سے کہو کہ ہر نماز کے بعد 11 بار آیت الکرسی پڑھ کر بیٹے پر دَم کریں۔

صرف ضرورت کے تحت بات چیت کرو۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو اس کے لیے نمازِ عشاء کے بعد 7 بار سورۃ مزمل پڑھو۔ مدت 14 دن ہے۔ نماز بالکل قضا نہ ہو۔ 14 دن بعد مجھے مطلع کرو۔

□ ریشم' پشاور۔

☆ بیٹی ریشم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ چننے والوں کو اللہ بہت پسند فرماتا ہے۔ بے شک راستہ سہل نہیں مگر اس پر چلنے والوں کے لیے بہت اَجر ہے۔ تم نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور حاجت بیان کرو۔ کوشش کرو کہ ترجمے کے ساتھ پڑھو۔ نمازِ عشاء کے بعد 7 تسبیح یَاصَمَدُ کی پڑھ کر اپنے اوپر دَم کر لیا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ مہرین فاطمہ' جھنگ۔

☆ بیٹی مہرین! تمہارا یہ پہلا خط ہے جو مجھے ملا لہٰذا جواب تحریر کر رہا ہوں۔ تم نماز کی پابندی کرو اور نمازِ عشاء کے بعد 3 تسبیح یَا حَیُّ یَا قیومُ کی پڑھو اول و آخر دُرود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ یہی عمل نمازِ فجر کے بعد بھی کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ دورانِ وظیفہ بدزبانی' غیبت' حسد اور دروغ گوئی سے مکمل پرہیز لازمی ہے۔

□ تبسم' سیالکوٹ۔

○ محترم بابا جی! میں نے اس سے پہلے بھی ایک خط لکھا تھا جو کہ آپ کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ یہ خط میں اس لیے لکھ رہی ہوں تاکہ آپ نزدیکی شمارے میں میرے مسائل کا حل بتا دیں۔ پہلے حالات کچھ اور تھے اور اب اور بھی زیادہ بگڑ گئے ہیں' میرے دو مسئلے ہیں۔ پہلا تو یہی کہ میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہوں' وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے اور شادی کرنا چاہتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایک تو وہ ہمارے خاندان کا نہیں ہے' دوسرے میرے والدین میری شادی میری پھپھو کے بیٹے سے کرنا چاہتے ہیں جبکہ وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ پہلے کسی کو بھی اس بارے میں علم نہیں تھا لیکن اب لڑکے کے گھر والوں کو علم ہو گیا ہے۔ لڑکے کی بہن نے فون کر کے میری والدہ کو بھی یہ معاملہ بتا دیا ہے۔ امی نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا تو میں نے اُن سے جھوٹ بول دیا کہ میری ایک لڑکی سے لڑائی ہو گئی تھی' اس نے بدلہ لینے کے لیے ایسا کہا ہے لیکن اب اس کی امی محلے میں کہتی پھرتی ہیں کہ میں نے اُن کے بیٹے کو پھنسا لیا ہے اور اسے تنگ کرتی ہوں حالانکہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ اَب اس سے رابطے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ہمارا شہر کوئی اتنا بڑا نہیں ہے کہ لوگوں کو دوسروں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ ہو بلکہ یہاں بات چند لمحوں میں ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ اگر یہ بات زیادہ پھیلی تو میرے گھر والوں کو پتا چل جائے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور اگر زندہ چھوڑ بھی دیا تو میری گھر میں کیا عزت رہ جائے گی؟ میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میری پھپھو اپنے بیٹے کی شادی کہیں اور کر دیں اور اس لڑکے کی امی کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے۔ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ پہلے تو میرے والدین بھی راضی تھے لیکن جب سے اُس لڑکے کی بہن نے فون کیا ہے' میرے والدین کچھ ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اب شاید وہ مجھے کالج میں داخلہ نہ لینے دیں جبکہ میں اپنی پڑھائی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے والدین مجھے میرے پسند کے کالج میں داخلہ لینے دیں کیونکہ میں پڑھنا چاہتی ہوں۔

☆ بیٹی تبسم! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنی توجہ اپنی تعلیم کی طرف دو۔ سب سے قیمتی شئے عزت ہے' اگر ایک بار کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو پھر انسان ساری زندگی صرف پچھتاتا رہتا ہے۔ نماز کی پابندی کرو کہ اس عمل سے شیطان دور رہتا ہے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ حج پڑھ کر پانی پر دَم کر لو اور یہ پانی پی لو۔ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ معذوری کے دن شمار کر کے بعد میں پورے کر لینا۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ روزینہ' دادو۔

☆ بیٹی روزینہ! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ سب سے ضروری تو یہ ہے کہ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک ہزار بار پڑھو اِذَا جَآءَ نَصرُ اللّٰه پھر اپنے اوپر دَم کر لو۔ یہ وظیفہ نہایت پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ اس دوران جمعرات کے روز کچھ رقم ضرور صدقہ کر دیا کرو۔ ہر وقت باوضو رہو۔ مجھے حالات سے مطلع ضرور کرنا۔

□ یاسمین' راولپنڈی۔

○ محترم بابا جی! سچی کہانیاں میں آپ کا سلسلہ 'مسئلہ یہ ہے' پڑھا اور پڑھ کر بے اختیار دل سے دُعا نکلی۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ جس طرح آپ خلقِ خدا کی خدمت کر رہے ہیں' اللہ آپ کو اس کا اَجر دے۔ (آمین!) بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ماشاء اللہ' پانچ بچے ہیں۔ میرے شوہر آرمی کمانڈوز میں تھے جو شہید ہو چکے ہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرا شوہر رُوحانی طور پر مجھ سے بات کرے یا میری رہنمائی کرے۔ میں ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی یاسمین! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور شوہر کو بخش دو۔ یہ عمل اپنی عادت میں شامل کر لو۔ اللہ تمہارا مددگار ہو۔

□ مسرت۔ جھنگ۔

☆ بیٹی مسرت! ایک بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے گھر یا گھر کے افراد پر کسی قسم کا کوئی جادو یا عمل نہیں ہے۔ والدہ سے کہو کہ گلٹی پر گرم گرم موم لگائیں' فائدہ ہوگا۔ یہ عمل دن میں 3 سے 4 بار کریں۔ موم بتی کو جلا کر متاثرہ جگہ کے قریب لے آئیں اور گلٹی پر موم گرائیں۔ تم بہنیں نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ احزاب پڑھو اور دُعا کرو۔ سہ پہر کے قریب اپنے ہاتھوں سے چڑیوں کو دانہ ڈالو اور پانی رکھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ شازمہ۔ مالاکنڈ۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! بہت امید لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے شوہر سوئی گیس کے محکمے میں کام کرتے ہیں۔ پہلے وہ حرام کمائی کرتے تھے لیکن دو سال پہلے حج کرنے کے بعد اللہ کے فضل سے انہوں نے حرام کی کمائی سے توبہ کر لی ہے۔ ہمارے اوپر کچھ قرض ہے' اس کی ادائیگی کے لیے میرے شوہر امریکا کا ویزہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ میرے شوہر کو ویزہ مل جائے۔

☆ بیٹی شازمہ......! بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ اب اس پر قائم رہنا بندے کے ہاتھ میں ہے۔ تم دونوں میاں بیوی ہر نماز کے بعد 3 تسبیح یَامجیبُ کی پڑھو اور دُعا کرو۔ کوشش کرو کہ کوئی ایسا عمل نہ ہو جس سے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچے۔ مدت 41 دن ہے۔ نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔

## مرا بچپن، مری یادیں

مری یادیں، مرا بچپن، مرا یہ حال اور سب کچھ
کسی مَسلے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے میں
کہیں لکھا ہوا محفوظ رکھا ہے
وہ کاغذ جس سے بچپن میں
مرے اندر کا ننھا سا
بہت پیارا سا اِک بچہ
کبھی تتلی، کبھی جگنو، کبھی کشتی بناتا تھا
کبھی کاپی کے کاغذ سے
جہازوں کو اُڑاتا تھا
کبھی رڈی کی صُورت میں
بنا کر ڈھیر گٹھری سا
اُسے پھر بیچ آتا تھا
اور اُن پیسوں سے کرکٹ کا
کبھی بَلا، کبھی اِک گیند لاتا تھا
یہی کاغذ مرے بستے کے اندر مسکراتا تھا
مجھے پڑھنا سکھاتا تھا
مجھے لکھنا سکھاتا تھا
اِسی نے زندگی کے راستے
سارے دکھائے تھے
اِسی نے رفتگاں کے
سارے قصے بھی سنائے تھے
یہی کاغذ مرے آگے رکھا ہے آج بھی دیکھو
اِسی کاغذ پہ مجھ کو پھر سے اِک تحریر لکھنی ہے
وہی تحریر......
جس سے میرے ہر جذبے کا
کچھ اظہار ہو جائے
مری یادیں، مرا بچپن، مرا یہ حال اور سب کچھ
اِسی تحریر میں معصوم سا بچہ
کھلونوں کی طرح چھم چھم سما جائے
بہت سوچا، بہت سمجھا
کوئی بھی لفظ
میری دسترس میں پھر نہیں آیا



کاشی چوہان





کتاب تبصرہ

پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

بازگشت

فکر اور جدت کے رنگ بکھیرنے والا قلم کار

# عامر شہزاد صدیقی

عکاشہ سحر

''حرفِ یکتا'' ملتان سے تعلق رکھنے والے کالم نگار عامر شہزاد صدیقی کی کالموں پر مبنی کتاب ہے۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' ملتان میں چھپنے والے کالموں کو عامر شہزاد صدیقی نے کتابی صورت میں اپنے قارئین تک پہنچایا ہے۔ سادگی' سچائی اور سنجیدگی کے ساتھ عامر شہزاد انسانیت کو درپیش مسائل پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ نسلی امتیازات و اختلافات کے سخت مخالف اور امنِ عالم کے حامی ہیں۔ وطن پرستی کے حوالے سے عامر شہزاد کے جذبات قابل قدر ہیں اور اس کے ساتھ وہ اپنے ملنے والے مختلف کرداروں کی اتنی خوبصورت لفظی تصویریں بناتے ہیں کہ جن کے سحر سے قاری کا باہر نکلنا خاصا دقت طلب ہو جاتا ہے۔

مستقل مزاج' حقیقت پسند' رموزِ فطرت کے مطابق قلم کشائی کرنے والے عامر شہزاد صدیقی کا ہر لفظ دِیے کی طرح روشن ہے۔ انہوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا' اُسے اپنے انجام تک پہنچایا جس کا ثبوت ''حرفِ یکتا'' کے ہر صفحے پر موجود ہے۔ سانحۂ سیالکوٹ ہو' جعلی ڈگریوں کا تذکرہ ہو' سیاسی جنکشن' پتنگ بازی ایک متنازعہ تہوار' بلوچستان میں نفرت کا سیلاب ہو یا جنوبی پنجاب میں پانی کا سیلاب' ڈاکٹر عافیہ کیس ہو یا پھر شائلہ کی قربانی' عامر شہزاد صدیقی کے قلم نے ہر جگہ بھرپور انصاف




کیا اور اپنے حصے کا چراغِ امن جلایا۔ دہشت گردی کی اٹھتی ہوئی لہر' سماج کی بے حسی اور چیرہ دستیوں کا ذکر بھی ''حرفِ یکتا'' میں زور و شور سے ملتا ہے۔ سیاسی آشوب' ناانصافی اور نوکر شاہی نظام کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ وقت' سماج اور نظامِ حکومت نے عام طبقہ پر جو پابندیاں عائد کی ہیں' عامر شہزاد نے اُن پر قلم اٹھایا ہے۔

عامر شہزاد نئے زمانے' نئے انداز اور نئے لب و لہجہ کے قلم کار ہیں جو لکھتے وقت اپنے عہد اور عہد کے معاشی و معاشرتی و سماجی رویوں کو بڑے بھرپور طریقے سے اپنے لفظوں میں ڈھال رہے ہیں۔ ان کا کالم ''سانحۂ سیالکوٹ'' کی چند لائنیں ملاحظہ فرمائیں۔

''معاشرہ اور سماج' یہ دو الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم انسانی وجود' انسانی رویوں پر مبنی ہوتا ہے۔ انسانوں کے ہجوم سے معاشرہ اور انسانی رویوں سے سماج کی تکمیل ہوتی ہے۔ انسانی اقدار' انسانی روایات' مناسب قابلِ برداشت رویئے ہی انسانی معاشرے کی تکمیل و فروغ کے اساس ہوتے ہیں۔ جنگل اور غاروں میں رہنے والا انسان ترویج و ترقی کی منازل طے کرتا ہوا آج چاند کو تسخیر کرنے کی بات کر رہا ہے' سمندروں کو خشک کر کے زمین آباد کر رہا ہے' فضاؤں کو تابع بنا رہا ہے' یہ سب اس لیے ممکن ہے کہ انسان معاشرتی و سماجی ضروریات سے آگاہ ہے۔''

قول و فعل کے تضادات اپنی انتہا پر پہنچ کر منافقت بن جاتے ہیں' جب ریاکاری کو مصلحت کا نام دیا جائے' جھوٹ کو میزانِ فراست میں تول کر طاقِ صداقت میں سجایا جائے' معاشرتی ترقی و خوشحالی کے تمام منصوبے دیوانے کا خواب بن کر رہ جائیں تو پھر لفظوں میں خوشی کہاں سے آئے؟ عامر شہزاد ایک حقیقت پسند قلم کار ہیں اور حقیقت بہرحال بہت تلخ ہوتی ہے۔ کالم ''خوف'' کی چند لائنیں۔

''پاکستان میں ہر شعبۂ زندگی کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے ہر طرف غیر یقینی کی فضا پروان چڑھ رہی ہے۔ غیر یقینی کی اس صورتِ حال نے عدم تحفظ کے احساس کو جنم دیا ہے جس نے معاشرے میں بسنے والے ہر طبقۂ فکر کو خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ملکِ عزیز کے ہر شعبۂ زندگی پر حکومت کی گرفت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔''

آج کے دور میں صرف سیاست کے میدان میں ہی نااہل لوگوں کی اجارہ داری قائم نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں بے ضمیر لوگوں کی حکمرانی نظر آتی ہے۔ بقول غالب۔

بے ہنر عیش میں ہیں
اہلِ ہنر دیکھتے ہیں

عامر شہزاد کے کالمز کے موضوعات بھی اسی معاشرے سے کشید کردہ ہیں' انہیں وہ لوگ سخت ناپسند ہیں جو ریاکاری کے مرتکب ہیں۔ ایک حقیقت پسند لکھاری کے طور پر انہوں نے زندگی اور معاشرے کے تمام پہلوؤں کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ جب سماجی رویوں کی منڈی میں محبت' ایثار اور وفاداری کی اجناس کا قحط پڑ جاتا ہے اور نفرت' بدگمانی' غداری' بے حسی ان کی جگہ لے لیتی ہے تو حساس لوگوں کی زندگی شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہے۔ عامر شہزاد بھی ایک حساس تخلیق کار ہیں۔ انہوں نے اپنی حساسیت کو اپنی تحریروں میں سمو دیا ہے۔

''حرفِ یکتا'' میں شامل کالم بعنوان ''ڈاکٹر عافیہ فیصلہ' سزا یا ضرورتِ سزا'' سے ایک اقتباس۔

''ڈاکٹر عافیہ صدیقی آج کی دنیا کا ایک ایسا مظلوم کردار ہے جو تہذیبوں کے تصادم کا شکار ہو کر اپنا گھربار' عزت وقار' یہاں تک کہ اپنی اولاد بھی گنوا بیٹھی ہیں۔ ترقی یافتہ معاشرے کی ایک اعلیٰ عدالت نے اپنی قوم کی اس ''مجرم'' کو جس قدر ممکن تھا' زیادہ سے زیادہ سزا سنا کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی ہے اور دنیائے عالم کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ امریکہ جیسی سپر طاقت کے مفادات کے خلاف کام کرنے والے ہر شخص کو اسی طرح کے عمل سے گزرنا ہوگا۔

عامر شہزاد کی تحریروں کے موضوعات کا تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ اُن کی زندگی ہمہ وقت تجربات سے گزر رہی ہے۔ مستحق کو حق نہ دینے اور غیر مستحق کو نوازشات کا مرکز بنانے کے رجحان کے نتیجے میں رشوت' ذخیرہ اندوزی' ناجائز اقرباپروری جیسی

برائیوں کے جراثیم ہمارے معاشرے کے جسم میں داخل ہو چکے ہیں۔ عامر شہزاد نے ان برائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اُن کی تحریر میں اُن کے اندر کا اجلا پن واضح نظر آتا ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ عامر شہزاد نے اپنے باطن کے حسن کو اور خوبصورتی کو اپنی تخلیقات میں سمو دیا ہے' گویا اُن کی تحریریں اُن کی ذات کے آئینے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے معاشرتی' تہذیبی' ثقافتی اور تمدنی زندگی کو اپنی تحریروں کی اساس بنایا ہے۔ عصرِ حاضر کی کروٹیں لیتی ہوئی زندگی کا عکس ان کی تحریر میں صاف نظر آتا ہے۔ عامر شہزاد کا تخلیقی حسن دھیرے دھیرے قاری پر اثر انداز ہوتا ہے۔

بطورِ کالم نگار' عامر شہزاد نے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ ''ملتان ما بہ جنت نظیر است۔'' عامر شہزاد کا ملتان کے متعلق ایک کالم ہے' اس کی چند لائنیں ملاحظہ فرمائیں۔

''ملتان کی سرزمین کو اولیاؤں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ اس سرزمین میں نجانے کتنے اور کون کون سے بزرگ' جیدین اور اولیاء اللہ آسودۂ خاک ہوئے۔ کچھ نام یقیناً وقت کے اتار چڑھاؤ میں اپنی شناخت گم کر چکے مگر ایسے نام جن کی بزرگی اور برگزیدگی کو اُن کے عقیدت مندوں نے زندہ رکھا' آج تک اُن کی کرامات اوراق کی زینت ہیں۔ ان بزرگوں کے آستانے آج بھی عقیدت مندوں سے بھرے نظر آتے ہیں۔ قائم رہ جانے والے یا مٹ جانے والے' ان برگزیدہ ہستیوں کی ریاضت کی بدولت یہ خطہ ''مدینۃ اولیاء'' کہلایا۔ ملتان کی شناخت کے کئی حوالے ملتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات پلٹیں تو کبھی یہ شہر اسلام کے متوالوں کا گہوارہ اور کبھی پر بلادی بھگتوں کا مسکن نظر آتا ہے۔''

کتاب کے آغاز میں صاحب کتاب کے لیے اسد جعفری' اعتبار ساجد' پروفیسر حفیظ الرحمان' غضنفر ہاشمی' راحت زاہد' سلیم ناز' مامون طاہر رانا' جواد امین قریشی' یاسمین خاکوانی کے مضامین ہیں۔ اعتبار ساجد صاحب کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''عامر شہزاد صدیقی اسکاٹ لینڈ میں ایشین جرنلسٹ یونین کے وائس پریذیڈنٹ بھی رہے۔ ''آواز اخبار'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے اور جنگ' لندن اور دوسرے اُردو اخبار و جرائد میں بھی لکھتے رہے۔ چونکہ وہ ایک سنجیدہ طبع آدمی ہیں اس لیے انہوں نے لندن کے پب اور بار رومز' لائیو شوز آن اسٹیج کا تذکرہ نہیں کیا۔ قلم کو عالمی تناظر میں حالاتِ حاضرہ تک محدود رکھا ہے۔ اُن کا کیا بگڑ جاتا اگر وہ ہمیں لندن کے کسی کلب یا کسی ساحلِ سمندر کا نقشہ دکھا دیتے؟ ہمارے سفرنامہ نگاروں نے تو کام ہی یہ کیا ہے لیکن آفرین ہے عامر شہزاد صدیقی کے اندر کے سنجیدہ مزاج ادیب اور صحافی کو کہ وہ فروعات میں نہیں پڑے۔''

یہ عامر شہزاد صدیقی کی جواں ہمتی ہے جو انہیں مایوس نہیں ہونے دیتی۔ اُن کی تحریروں میں جابجا جراتوں اور حوصلوں کو بڑھانے والے پیغامات قاری کو زندگی کی ناہموار پگڈنڈیوں پر ثابت قدم رہنے کا درس دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک پرندہ خواہ شکستہ پر ہی کیوں نہ ہو' اس کا شوقِ پرواز ختم نہیں ہونا چاہیے۔ امید کے چراغوں کو جلتے رہنا چاہیے اُس وقت تک جب تک شبِ غم ڈھل نہ جائے اور صبحِ مسرت کے اُجالے کائناتِ زندگی میں در نہ آئیں۔ صحت و سلامتی کی بہت سی روشن دُعائیں عامر شہزاد صدیقی کے روشن مستقبل کے لیے۔ (آمین!)

......☆☆......



# پسند اپنی اپنی

## قارئین کے پسند کردہ اشعار' ادبی ذوق کے آئینہ دار

کاشی چوہان...... عاقب عارف' کراچی

رات تم یاد بھی بہت آئے
اور پھر نیند بھی نہیں آئی

فرخ اظہار...... کرن اسحاق' لاہور

کیا بتاؤں کہ میرے تنہائی
کیسے اندر سے کھا رہی ہے مجھے
زندگی کا تو خیر' حق تھا مگر
موت کیوں آزما رہی ہے مجھے؟

اظہر حسیب...... حسان ندیم' کراچی

راستے اس زیست کے مانا بہت دشوار ہیں
پر ہزاروں لوگ مجھ سے بھی سوا بے زار ہیں

مظہر فرید...... رمشاء فیاض' جہلم

میں جس جگہ ہوں' کوئی وہاں دور دور تک نہیں
کچھ خواب جل چکے ہیں' دھواں دور دور تک نہیں
اک کاروبارِ عشق کیے جا رہا ہوں میں
اور دیکھتا ہوں سود و زیاں دور دور تک نہیں

شکیل سالک...... سعدیہ کلیم' لالہ موسیٰ

پائی پائی حسابِ غم ہوں میں
اس لیے غم کے بیچ ضم ہوں میں
رفتہ رفتہ اجڑتا رہتا ہوں
رفتہ رفتہ غریقِ غم ہوں میں

جون ایلیا...... بینش فاطمہ' سرگودھا

وقت پر رازداں نے زہر دیا
چارہ گر کام کر گئے ہوتے
نہ ملا ہم کو وقتِ شانہ کشی
کتنے گیسو سنور گئے ہوتے

رانا غلام محی الدین...... واحد حسن' کراچی

مسافتیں ہیں وہی درمیاں' اٹل ہے یہی
اک عمر ہم سفری کا بھی ماحاصل ہے یہی
سنبھل ذرا کہ دوراہے پر آ گئے ہیں ہم
یقیں سا ہے کہ وہ سفاک ہجر پل ہے یہی

لیاقت علی عاصم...... رفعت بشیر' چکوال

رنگ ٹپکاتا وہ خوشبو میں نہایا ہوا ہاتھ
ہاتھ میں جیسے نہ تھا ہاتھ میں آیا ہوا ہاتھ
ہائے' وہ عمر کہ رستے سے سمیٹے ہوئے پاؤں
ہائے' وہ وقت کہ ہاتھوں سے چرایا ہوا ہاتھ

علامہ اقبالؒ...... چاہت علی' بھکر

کہاں سے تُو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی؟
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

کاشی چوہان...... عبداللہ رحیم' سعودیہ

تمہیں جو لوگ تمہارے نظر نہیں آتے
خود ہم کو عیب ہمارے نظر نہیں آتے

شوکت عباس...... کنزیٰ شاہد' ملتان

اچھی لگتی ہے مجھ کو تنہائی
اور وہ تنہا نظر نہیں آتا

ڈاکٹر اشفاق ناصر...... نایاب رحیم' سعودیہ

یہ بھی کیا کم ہے' کناروں سے نمی جھانکتی ہے
چشمِ تر شہر ڈبونے سے نہیں ہے مشروط
دل میں ہر شخص کی اک اپنی جگہ ہوتی ہے
کوئی پانا' کسی کھونے سے نہیں ہے مشروط

افتخار احمد...... آصف شاہ' کراچی

احساس کے پھولوں سے مہکتے ہوئے منظر
ٹھہرے ہوئے لگتے ہیں گزرتے ہوئے منظر
وہ شام کا سورج ہو بھلے ڈوبتا دل کا
کیا آگ لگاتے ہیں یہ ڈھلتے ہوئے منظر

# آپ کی خبر

......انتقال پر ملال......

◆ حیدر آباد سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر خلش مظفر پچھلے دنوں داعئ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ ادارہ دکھ کی اس گھڑی میں اُن کے اہلِ خانہ کے ساتھ برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی خاص جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین!)

◆ ہمارے ساتھی، ایڈیٹر دوشیزہ کاشی چوہان کی پھوپی ممتاز رفیق گزشتہ ماہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ اپنے ساتھی کے غم میں برابر کا شریک ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دُعا کرتا ہے۔

◆ ہماری دوست، لکھاری پروفیسر صفیہ سلطانہ صاحبہ کی جوان سال پھوپی زاد بہن گزشتہ دنوں زمین کا رزق ہوئیں۔ ادارہ اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

◆ ہمارے ملک کے نامور شاعر سلیم کوثر کی بہن کا پچھلے ماہ انتقال ہوگیا۔ ادارہ اس دکھ کی گھڑی میں اُن کے ساتھ برابر کا شریک ہے اور قارئین سے مرحومہ کی مغفرت کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

◆ ہمارے دوست لکھاری عارف شاہین روہیلا کے والد پچھلے دنوں انتقال کر گئے۔ ادارہ اور تمام قارئین مرحوم کی مغفرت کے لیے دُعا گو ہیں۔

......بس دُعا چاہیے......

◁▷ ہمارے سینئر دوست، لکھاری سید محمد ابو آزاد اِن دنوں صاحبِ فراش ہیں۔ قارئین سے بھائی ابو آزاد کی صحت یابی کے لیے دعا کی اپیل ہے۔

☆......☆

◁▷ ہماری بہت پیاری لکھاری بینا تاج جو پچھلے ماہ گولی لگنے سے زخمی ہوگئی تھیں اب تیزی سے روبہ صحت ہیں۔ ہم ان کی مزید اور مکمل صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں۔

☆......مبارک باد......☆

☆ ہمارے قلم قبیلے میں نیا اضافہ تمثیلہ زاہد کے والدین گزشتہ دنوں حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹے ہیں۔ ادارہ آپ کو اس سعادت پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

☆ معروف صحافی اور سچی کہانیاں کے ناول نگار حنیف سحر پچھلے دنوں روزنامہ "جہانِ پاکستان" سے بطور شوبز مبصر منسلک ہوگئے۔ ادارہ اور قارئین انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

☆ ہمارے ادارے کے دیرینہ ساتھی ممتاز الدین نے روزنامہ "دنیا نیوز" کراچی جوائن کر لیا ہے۔ اس کامیابی پر ہم انہیں بہت بہت مبارک باد دیتے ہیں۔

......سالگرہ مبارک......

۞ ہمارے ادارے کے ساتھی اور ایڈیٹر دوشیزہ کاشی چوہان کے فرزند محمد دیان چوہان نے 04 دسمبر کو اپنی سالگرہ منائی۔ ادارہ دیان کی درازئ عمر اور صحت کے لیے دُعا گو ہے۔

۞ ہماری دوست لکھاری ثانیہ بھٹی کی سالگرہ ماہِ رواں کی 17 تاریخ کو ہے۔ ادارہ ثانیہ کی درازئ عمر کے لیے دُعا گو ہے۔

۞ ہمارے مستقل قاری ایم سعید انور سعید اور کوثر سعید کی دختر عافیہ سعید کی ماہِ رواں میں سالگرہ ہے جبکہ ماہِ دسمبر میں انور اور کوثر بھی اپنی شادی کی سالگرہ منائیں گے۔ ادارہ اُن کی خوشیوں کے لیے دُعا گو ہے۔

☆......شادی مبارک......☆

☆......ہمارے دیرینہ ساتھی اور ایڈیٹر دوشیزہ کاشی چوہان کے ماموں زاد بھائی بلاول خان ماہِ نومبر میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ادارہ



اس جوڑے کی خوشیوں کے لیے دُعا گو ہے۔

☆......ہماری مستقل قاری اور دوست لکھاری زرینہ جونیجو اور تحسین جونیجو کے بھائی کی شادی خانہ آبادی ماہِ نومبر میں انجام پائی۔ ادارہ ان کی خوشیوں کے لیے دُعا گو ہے۔

📖......کتاب خبر......📖

☆......پرل پبلی کیشنز کی روحِ رواں منزہ سہام مرزا کا افسانوی مجموعہ "کانچ کی عورت" جس کی تقریبِ رونمائی ماہِ ستمبر میں ہوئی تھی، اِن دنوں مقبولیت کی منازل طے کر رہا ہے اور اہلِ علم و دانش میں بھرپور پسندیدگی کی سند حاصل کر رہا ہے۔

☆......سچی کہانیاں کے ایڈیٹر ناصر رضا کا افسانوی مجموعہ بہ عنوان "کہانی سانس لیتی ہے" تکمیل کے مراحل میں ہے جو کہ بہت جلد اشاعت کی صورت سامنے آنے والا ہے۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کے قارئین شدت سے ان کے افسانوی مجموعے کے منتظر ہیں۔

☆......پاکستانی نژاد کینیڈین شاعرہ زہرہ کاظمی کا شعری مجموعہ "میں نے کہا" شائع ہوگیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ایک خاص طبقے یا معاشرے یا جینڈر کے لیے مخصوص ہے بلکہ ہر عمر، رشتے، جذبات اور موسموں کی عکاسی کرتی ہے۔

☆......ہماری دیرینہ ساتھی اور دوست لکھاری پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل کے خوبصورت افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل کتاب "مشتِ خاک کا سفر" ان دنوں زیرِ طبع ہے۔ ادارہ صفیہ سلطانہ صاحبہ کو پیشگی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

"آپ کی خبر" کا حصہ بننے کے لیے تمام رائٹرز اور قارئین بلا جھجک اپنی خبریں ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔

## ماں جو سلامت ہے

خیال کی چاندنی میں
روشن وہ عکس ہے
ماں کا حسین پیکر
زندگی کی نوید بن کر
روشن دیے سجا کر
مجھے ہر کامیابی پر
یاد دلاتا ہے کہ..."وہ"
پیاری ہستی لبوں پہ دعا سجا کر
میرے رب کو
میرے لیے منا کر
سر بسجود رہتی ہے
میری اس جہاں میں
جو تعظیم ہے
وہ ماں کی بدولت ہے
پہلو میں ماں کے رکھی
رب نے بڑی راحت ہے
پھر ماں جو سلامت ہے
تو ہر لمحہ ہی چاہت ہے

غزالہ شاہین عبدالقیوم



بازگشت

# قدرت کی فیاضی

قدرت نے جس فیاضی کے ساتھ ہماری ارضِ وطن کو مختلف نعمتوں سے مالا مال کیا ہے' اس کے لئے ہم جتنا بھی رب جلیل کا شکر ادا کریں' کم ہے۔ اس نے ہمیں زمین دی ہے تو زرخیز۔ پہاڑ دیئے ہیں تو معدنیات کے خزانوں سے معمور۔ صحرا عطا فرمائے ہیں تو قسم قسم کے ذخائر سے بھرپور اور دریا زمینوں کو سیراب کرنے والے۔ مختصر یہ کہ ارضِ وطن کی کوکھ سے سونا' تانبا' کوئلہ' تیل اور گیس بھی برآمد کی جارہی ہے اور زیرِ کاشت زمینوں سے ہر قسم کی اجناس بھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وطن عزیز میں ان محنت کش ہاتھوں کی بھی کمی نہیں جو زمین کا سینہ چیرنے' سمندری لہروں سے نبرد آزما ہونے اور دریاؤں کی روانی پر قابو پانے کے مشاق ہیں۔ یہی وجہ ہے اس خطہء زرخیز میں وعدوں کی کاشت بھی خوب زوروں پر ہے۔ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ حکمرانوں کو اپنے وعدوں پر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا ملک ہو جو وعدوں کی پیداوار میں خودکفیل ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا تاکہ میرے علم میں بھی اضافہ ہو۔

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ ماہنامہ دوشیزہ میں نومبر 1994ء میں لکھا؟ یہ اداریہ یہ سوچ موجودہ دور کا عکاس نہیں؟